اصلاحی مضامین

عصر حاضر کے تناظر میں

حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب

فرید بُک ڈپو (پرائیویٹ) لمیٹڈ
FARID BOOK DEPOT (Pvt.) Ltd.
NEW DELHI-110002

اصلاحی مضامین — عصر حاضر کے تناظر میں

از:

حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب

صفحات: ۳۹۲ سائز: 23x36/16 قیمت: -/۱۰۰

باهتمام: محمد ناصر خان

ناشر

فرید بک ڈپو (پرائیویٹ) لمیٹڈ

FARID BOOK DEPOT (Pvt.) Ltd.

Corp. Off.: 2158, M.P. Street, Pataudi House, Darya Ganj, New Delhi-2

Phones: 23247075, 23289786, 23289159 Fax: 23279998 Res.: 23262486

ISLAHI MAZAMEEN — Asr-e-Hazir Ke Tanazur Mein

By: **Maulana Mufti Muhammad Taqi Usmani**

Ist Edition: **June 2005**

Price: **Rs. 100/-**

Our Branches:

Delhi: 1. **Farid Book Depot (P) Ltd.**
422, Matia Mahal, Jama Masjid, Delhi-6
Ph.: 23265406, 23256590

2. **Farid Book Depot (P) Ltd.**
168/1, Jha House, Basti Hazrat Nizamuddin (W),
New Delhi-110013 Ph.: 24351944, 55358122

Mumbai: **Farid Book Depot (P) Ltd.**
208, Sardar Patel Road, Near Khoja Qabristan,
Dongri, Mumbai-400009 Ph.: 022-23731786, 23774786

اصلاحی مضامین

نمبر شمار	عنوانات	صفحہ نمبر
	مضمون:۱	
۱	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا انداز تعلیم و تربیت اور اس کے انقلابی اثرات	۱۳
۲	پہلی خصوصیت	۱۴
۳	دوسری خصوصیت	۱۷
۴	تیسری خصوصیت	۱۷
۵	چوتھی خصوصیت	۱۸
۶	پانچویں خصوصیت	۱۸
۷	چھٹی خصوصیت	۱۹
۸	ساتویں خصوصیت	۲۰
۹	آٹھویں خصوصیت	۲۰
۱۰	نویں خصوصیت	۲۰
۱۱	دسویں خصوصیت	۲۱
	مضمون:۲	
۱۲	جشن میلاد النبی صلی اللہ علیہ وسلم ...... ایک لمحہ فکریہ	۲۳
۱۳	ڈرائیوان سینما میں جلسہ سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم	۳۰
	مضمون:۳	
۱۴	سیرت کی محفلیں ...... ایک لمحہ فکریہ	۳۲
	مضمون:۴	
۱۵	فحاشی کا عذاب ''ایڈز''	۳۸

نمبر شمار	عنوانات	صفحہ نمبر
	مضمون: ۳۸	
۱۴۵	ہماری روزمرہ کی گفتگو میں انگریزی زبان کا استعمال	۳۱۲
	مضمون: ۳۹	
۱۴۶	بے پردگی کا سیلاب	۳۱۷
	مضمون: ۴۰	
۱۴۷	فحاشی کا سیلاب...... ایک لمحہ فکر!!	۳۲۴
	مضمون: ۴۱	
۱۴۸	مقدارِ مہر	۳۳۵
۱۴۹	الجواب و منه الصدق والصواب	۳۳۵
	مضمون: ۴۲	
۱۵۰	رفیقہ حیات کے ساتھ حسن سلوک	۳۴۱
۱۵۱	بیوی کا مارنا بداخلاقی ہے	۳۴۱
۱۵۲	بیوی کی اصلاح کے تین درجات	۳۴۱
۱۵۳	بیوی کو مارنے کی حد	۳۴۲
۱۵۴	اس کا بستر چھوڑ دو	۳۴۲
۱۵۵	ایسی علیحدگی جائز نہیں	۳۴۲
۱۵۶	چار ماہ سے زیادہ سفر میں بیوی کی اجازت	۳۴۳
۱۵۷	آج کے دور میں ''خوش اخلاقی''	۳۴۳
۱۵۸	''حسن اخلاق'' دل کی کیفیت کا نام ہے	۳۴۴
۱۵۹	اخلاق پیدا کرنے کا طریقہ	۳۴۵
۱۶۰	اللہ کی بندیوں کو نہ مارو	۳۴۵
۱۶۱	حدیث ظنی یا قطعی	۳۴۵
۱۶۲	صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین ہی اس لائق تھے	۳۴۶
۱۶۳	یہ عورتیں شیر ہو گئی ہیں	۳۴۶

مضمون:۱

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم
کا انداز تعلیم وتربیت اور اس کے انقلابی اثرات

محسن انسانیت، سرور دو عالم حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وسلم پوری انسانیت کے لیے ایک عظیم اور مثالی معلم بن کر تشریف لائے تھے۔ ایسے معلم جن کی تعلیم وتربیت نے صرف تئیس سال کی مختصر مدت میں نہ صرف پورے جزیرہ عرب کی کایا پلٹ کر رکھ دی، بلکہ پوری دنیا کے لیے رشد وہدایت کی وہ ابدی قندیلیں بھی روشن کر دیں جو رہتی دنیا تک انسانیت کو عدل وانصاف، امن وسکون اور عافیت واطمینان کی راہ دکھاتی رہیں گی۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تئیس سال کی مختصر سی مدت میں جو حیرت انگیز انقلاب برپا کیا اس کی برق رفتاری اور اس کے ہمہ گیر اثرات نے ان لوگوں کو بھی انگشت بدنداں کر دیا جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے مشن کے سخت مخالف رہے ہیں یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم وتربیت ہی کا حیرت انگیز کرشمہ تھا کہ تئیس سال کی مختصر مدت میں صحرائے عرب کے جو وحشی علم ومعرفت اور تہذیب وتمدن سے بالکل کورے تھے وہ پوری دنیا میں علم وحکمت اور تہذیب وشائستگی کے چراغ روشن کرتے ہیں، جو لوگ کل تک ایک دوسرے کے خون سے اپنی پیاس بجھا رہے تھے وہ آپس میں بھائی بھائی بن جاتے ہیں، جہاں ہر طرف قتل وغارت گری کی آگ بھڑک رہی تھی وہاں امن وآشتی کے گلاب کھل اٹھتے ہیں جہاں ظلم وبربریت کا دور دورہ تھا وہاں عدل وانصاف کی شمعیں روشن ہو جاتی ہیں، جہاں پتھر کے بتوں کو سجدے کیے جاتے تھے، وہاں توحید کا پرچم لہرانے لگتا ہے، اور بالآخر عرب کے ہی صحرانشین جو اپنی جہالت کی وجہ سے دنیا بھر میں ذلیل وخوار تھے ایران وروم کی عظیم سلطنتوں کے وارث بن جاتے ہیں اور ساری دنیا ان کے عدل وانصاف اور ان کی شرافت نفس کے گن گانے پر مجبور ہو جاتی ہے۔

اس طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم وتربیت کا جو سو فیصد نتیجہ دنیا نے دیکھا ہے، تاریخِ انسانیت کی اور معلم کے یہاں اس کی نظیر نہیں ملتی۔ آج کی اس مختصر سی نشست میں ہم اسی بات کا مطالعہ کرنا چاہتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم و تربیت کی وہ کیا بنیادی خصوصیات تھیں جنہوں نے دنیا بھر میں یہ حیرت انگیز انقلاب برپا کر دیا۔

موضوع تو بڑا طویل اور تفصیل کا محتاج ہے مختصر یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے انداز تعلیم و تربیت کی تمام خصوصیات کا احاطہ کسی بھی انسان کے لیے ممکن نہیں ہے، لیکن میں یہاں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے انداز تربیت کی صرف ان خصوصیات کا ذکر کرنا چاہتا ہوں جو اپنی محدود بصیرت اور مطالعے کی حد تک مجھے سب سے زیادہ بنیادی خصوصیات معلوم ہوتی ہیں۔

پہلی خصوصیت:

ان میں سے پہلی خصوصیت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی شفقت ورحمت، دلسوزی وخیر خواہی اور رحم دلی ونرمی ہے چنانچہ خود قرآن کریم نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس خصوصیت کا ذکر فرما کر اسے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی کامیابی کا بہت بڑا سبب قرار دیا ہے۔

ارشاد پاک ہے:

فبما رحمة من الله لنت لهم ولو كنت فظا غليظ القلب لا نفضوا من حولك

"پس یہ اللہ کی رحمت ہی تھی جس کی بنا پر آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) لوگوں کے لیے نرم خو ہو گئے اور اگر آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) درشت مزاج اور سخت دل ہوتے تو یہ لوگ آپ کے پاس سے منتشر ہو جاتے۔"

جس شخص نے بھی سیرت طیبہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کچھ مطالعہ کیا ہے وہ جانتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مخالفین نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے راستے میں کانٹے

بچھائے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو طرح طرح سے اذیت پہنچائی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر مصائب و آلام کے پہاڑ توڑنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی، لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری سیرت اس بات کی گواہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے دل میں کبھی ایک لمحے کے لیے انتقام کا جذبہ پیدا نہیں ہوا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان پر غضب ناک ہونے کے بجائے ان پر ترس کھاتے تھے کہ یہ لوگ کیسی سنگین گمراہی میں مبتلا ہیں، اور ہر وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فکر دامن گیر رہتی تھی کہ وہ کیا طریقہ اختیار کیا جائے جس سے حق بات ان کے دل میں اتر جائے، اور یہ ہدایت کے راستے پر آ جائیں۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس قسم کے معلم نہ تھے کہ محض کوئی کتاب پڑھا کر یا درس دے کر فارغ ہو بیٹھتے ہوں اور یہ سمجھتے ہوں کہ میں نے اپنا فریضہ ادا کر دیا اس کے بجائے آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے زیر تربیت افراد کی زندگی کے ایک ایک شعبے میں داخل تھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے ہر دکھ درد میں شریک اور ہر لمحے ان کی فلاح و بہبود کے لیے فکر مند رہتے تھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اسی وصف کو قرآن کریم نے ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے:

لقد جآء کم رسول من انفسکم عزیز علیه ما عنتم حریص علیکم بالمومنین رؤف رحیم

"بلاشبہ تمہارے پاس تمہی میں سے ایک ایسا رسول آیا ہے جس پر تمہاری مشقت گراں گذرتی ہے، اور جو تمہاری بھلائی کا بیحد حریص ہے اور مسلمانوں پر بیحد شفیق اور مہربان ہے۔"

علامہ نورالدین ہیثمی رحمۃ اللہ علیہ نے مجمع الزوائد میں مسند احمد رحمۃ اللہ علیہ اور معجم طبرانی کے حوالے سے نقل کیا ہے کہ ایک مرتبہ ایک نوجوان سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس نے آ کر عرض کیا کہ "یا رسول اللہ! مجھے زنا کی اجازت دے دیجیے۔" ذرا تصور تو کیجیے کہ کیا فرمائش کی جا رہی ہے ایک ایسے گھناؤنے گناہ کو حلال قرار دینے کی فرمائش جس کی قباحت و شناعت پر دنیا بھر کے مذاہب و ادیان متفق ہیں اور یہ فرمائش کس سے کی جا رہی ہے؟ اس برگزیدہ ہستی سے جس کی عصمت و عفت کے آگے فرشتوں کا بھی سر جھک جاتا ہے، کوئی اور ہوتا تو اس نوجوان کو مار پیٹ کر یا کم از

کم ڈانٹ ڈپٹ کر باہر نکلوادیتا، لیکن یہ رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم تھے جن کا کام برائی پر خفگی کا اظہار کر کے پورا نہیں ہو جاتا تھا، بلکہ جو اس برائی کے علاج کو بھی اپنا فریضہ سمجھتے تھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے دل میں اس نوجوان کے خلاف بغض وغضب کے بجائے ہمدردی اور رحم کے جذبات پیدا ہوئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر ناراض ہونے کے بجائے اسے پیار کے ساتھ اپنے پاس بلایا۔ اپنے قریب بٹھایا، اس کے کندھے پر مشفقانہ ہاتھ رکھا اور محبت بھرے لہجے میں فرمایا: ''اچھا یہ بتاؤ کہ جو عمل تم کسی اجنبی خاتون کے ساتھ کرنا چاہتے ہو، اگر کوئی دوسرا شخص تمہاری ماں کے ساتھ کرنا چاہے تو کیا تم اس کو گوارا کرو گے؟'' نوجوان کے ذہن وفکر کے بند دریچے ایک ایک کر کے کھلنے لگے، اس نے کہا ''نہیں یارسول اللہ!'' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا! ''تو پھر دوسرے لوگ بھی اپنی ماؤں کے لیے یہ بات پسند نہیں کرتے، اچھا یہ بتاؤ کہ اگر کوئی شخص تمہاری بہن کے ساتھ یہ معاملہ کرے تو کیا تم اس کو گوارا کرلو گے؟'' نوجوان نے عرض کیا: ''نہیں یارسول اللہ!'' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ''جو بات تمہیں اپنی بہن کے لیے گوارا نہیں، دوسرے لوگ بھی اپنی بہنوں کے ساتھ اسے پسند نہیں کرتے'' آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مسلسل اس نوجوان کو مثالیں دے دے کر سمجھاتے رہے اور آخر میں اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر یہ دعا بھی فرمائی کہ ''**اللھم اغفر ذنبه وطهر قلبه وحصن فرجه**'' یااللہ! اس کے گناہ کو معاف فرمادیجیے اور اس کے قلب کو پاک کردیجیے، اور اس کی شرم گاہ کو عفت عطا فرمائیے'' یہاں تک کہ جب وہ مجلس سے اٹھا تو اس گھناؤنے عمل سے ہمیشہ کے لیے تائب ہو چکا تھا۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس نوجوان پر غیظ وغضب کا اظہار کر کے اپنے مشتعل جذبات کی تسکین کر سکتے تھے اس صورت میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس نوجوان کی زندگی تباہ ہوتی نظر آ رہی تھی، یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نرم خوئی، حکمت اور تدبر وتحمل کا عمل تھا کہ وہ نوجوان ہلاکت کے گڑھے سے ہمیشہ کے لیے محفوظ ہو گیا، کاش کہ آج کے معلمین، اساتذہ، سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی اس سنت پر عمل پیرا ہو سکیں تو آج انہیں اپنے جوانوں کی بے راہ روی کی شکایت نہ رہے!

دوسری خصوصیت:

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے انداز تعلیم و تربیت کی دوسری اہم خصوصیت جسے میں اہمیت کے ساتھ اس وقت ذکر کرنا چاہتا ہوں اور جو احقر کی نظر میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے انداز تربیت کی سب سے زیادہ مؤثر مثال ہے، اور وہ یہ کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے پیروؤں کو جس جس بات کی تعلیم دی، اسکا بذات خود عملی نمونہ بن کر دکھایا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے وعظ و نصائح اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم و تربیت صرف دوسروں کے لیے نہ تھی، بلکہ سب سے پہلے اپنی ذات کے لیے تھی، اللہ تعالیٰ نے بہت سے معاملات میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو رخصت و سہولت عطا فرمائی، لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس رخصت و سہولت سے فائدہ اٹھانے کے بجائے اپنے آپ کو دوسرے تمام مسلمانوں کی طرح رہنے کو پسند فرمایا۔

تیسری خصوصیت:

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو نماز کی تلقین فرمائی۔ تو خود اپنا عالم یہ تھا کہ دوسرے اگر پانچ وقت نماز پڑھتے تھے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم اکثر وقت نماز ادا فرماتے تھے، جس میں چاشت، اشراق اور تہجد کی نمازیں شامل تھیں، تہجد کی نماز عام مسلمانوں کے لیے واجب نہ تھی، لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر واجب تھی اور تہجد بھی ایسی کہ کھڑے کھڑے پاؤں پر ورم آجاتا تھا، حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے ایک مرتبہ عرض کیا کہ "یارسول اللہ! کیا اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تمام اگلی پچھلی لغزشیں معاف نہیں فرمادیں، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اتنی مشقت اٹھانے کی کیا ضرورت ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "بے شک اللہ تعالیٰ نے مجھ پر یہ کرم فرمایا ہے، لیکن کیا میں اللہ کا شکر گزار بندہ نہ بنوں؟"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دوسروں کو نماز باجماعت کی تعلیم دی تو خود یہ عمل کر کے دکھایا کہ ساری زندگی نماز کی جو پابندی فرمائی وہ تو اپنی جگہ ہے، عین مرض وفات میں بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسجد کی جماعت کو نہیں چھوڑا، بلکہ دو صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین کے کندھے کا سہارا لے کر مسجد میں تشریف لائے، اور جماعت کے ساتھ نماز ادا کی۔

چوتھی خصوصیت:

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دوسروں کو روزہ رکھنے کا حکم دیا تو خود آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل یہ تھا کہ عام مسلمان اگر فرض روزے رکھتے تھے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی مہینہ روزوں سے خالی نہ تھا، عام مسلمانوں کو یہ حکم تھا کہ صبح کو روزہ رکھیں اور شام کو افطار کرلیا کریں، لیکن خود آپ صلی اللہ علیہ وسلم کئی کئی روز مسلسل اس طرح روزے رکھتے تھے کہ رات کے وقت میں بھی کوئی غذا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے منہ میں نہیں جاتی تھی۔

پانچویں خصوصیت:

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کو زکوۃ دینے اور اللہ کی راہ میں مال خرچ کرنے کی تاکید فرمائی، تو سب سے پہلے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی عملی زندگی میں اس کا بے مثال نمونہ پیش کیا۔ عام مسلمانوں کو اپنے مال کا چالیسواں حصہ فریضے کے طور پر دینے کا حکم تھا، اور اس سے زیادہ حسب توفیق خرچ کرنے کی تلقین کی جاتی تھی، لیکن خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل یہ تھا کہ اپنی فوری ضرورت کو نہایت سادہ طریقے سے پورا کرنے کے بعد اپنی ساری آمدنی ضرورت مند افراد میں تقسیم فرمادیتے تھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ تک گوارا نہ تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو وقتی ضرورت سے زائد ایک دینار بھی گھر میں باقی رہے۔

ایک مرتبہ عصر کی نماز کے بعد خلاف معمول فوراً گھر میں تشریف لے گئے، اور جلد ہی باہر واپس آئے، صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین نے وجہ پوچھی تو فرمایا: ”مجھے نماز میں یاد آیا کہ سونے کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا گھر میں پڑا رہ گیا ہے، مجھے خیال ہوا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ رات کو غریب سوتے اور وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر میں پڑا رہ جائے“

حضرت ام سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا بیان فرماتی ہیں کہ ایک دفعہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے گھر میں تشریف لائے، میں نے وجہ دیافت کی تو فرمایا: ”ام سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا! کل جو سات دینار آئے تھے، شام ہوگئی وہ بستر پر پڑے رہ گئے“ حدیہ ہے کہ مرض وفات کی حالت میں جب کہ بیماری کی تکلیف نے سخت بے چین کیا ہوا تھا جب یاد آتا ہے کہ کچھ اشرفیاں گھر میں پڑی ہیں، فوراً حکم دیتے ہیں کہ ”انہیں خیرات کردو، کیا محمد صلی

اللہ علیہ وسلم اپنے رب سے اس طرح ملاقات کریں کہ اس کے پیچھے اس کے گھر میں اشرفیاں پڑی ہوں۔"

عام مسلمانوں کے لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم یہ تھی کہ جوش میں آکر اپنی ساری پونجی خیرات کردینا مناسب نہیں بلکہ اپنی حیثیت کے مطابق مال اپنے پاس رکھ کر باقی کو اللہ کی راہ میں خرچ کرو، لیکن مسلمانوں کو اس تعلیم کا عادی بنانے کے لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے عمل کا یہ نمونہ پیش فرمایا کہ گھر میں کوئی نقدی باقی نہ چھوڑی، تاکہ لوگ اس مثالی طرز عمل کو دیکھ کر کم سے کم اس حد تک آسکیں جو اسلام کو عام مسلمانوں سے مطلوب ہے۔

چنانچہ انسانیت کے اس معلم اعظم صلی اللہ علیہ وسلم کی عملی تربیت کا نتیجہ تھا کہ جب قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد نازل ہوا کہ:

لن تنالوا البر حتی تنفقوا مما تحبون.

"تم نیکی کا مقام ہرگز اس وقت تک حاصل نہ کرسکو گے جب تک
اپنی پسندیدہ چیزوں میں سے اللہ کی راہ میں خرچ نہ کرو۔"

صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین نے اس آیت پر عمل کرنے کے لیے مسابقت کا جو غیر معمولی مظاہرہ فرمایا وہ تاریخ انسانیت میں اپنی مثال آپ ہے۔ اس آیت کے نازل ہونے پر تمام صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین نے اپنی پسندیدہ ترین اشیاء خیرات کردیں، اور اپنی محبوب چیزوں کو اللہ کی راہ میں خرچ کردیا جنہیں وہ سال ہا سال سے حرز جان بنائے ہوئے تھے۔

چھٹی خصوصیت:

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے پیروؤں کو زہد وقناعت کی تعلیم دی، تو خود اپنی زندگی میں اس کا عملی نمونہ کرکے دکھایا، غزوۂ احزاب کے موقع پر جب بعض صحابہ رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے بھوک کی شدت کی شکایت کی اور اپنا پیٹ کھول کر دکھایا کہا کہ اس پر پتھر بندھا ہوا ہے تو سرور دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب میں اپنا بطن مبارک کھول کر دکھایا جس پر دو پتھر بندھے ہوئے تھے۔

ساتویں خصوصیت:

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو مساوات اور بھائی چارے کی تعلیم دی تو سب سے پہلے خود اس پر عمل کر کے دکھایا کہ اگر دوسرے مسلمان عام سپاہی کی حیثیت میں مدینہ طیبہ کے دفاع میں خندق کھودنے کی مشقت برداشت کرے تو ان کا آقا اور امیر (صلی اللہ علیہ وسلم) صرف قیادت ونگرانی کا فریضہ انجام نہیں دے رہا تھا، بلکہ یہ بہ نفس نفیس ان کو لے کر خندق کھودنے میں شریک تھا اور زمین کا جتنا ٹکڑا ایک عام سپاہی کو کھودنے کے لیے دیا گیا ہے اس سے زیادہ ٹکڑا اس نے اپنے ذمے لیا تھا۔

آٹھویں خصوصیت:

ایثار کی تعلیم ہر معلم اخلاق نے دی ہے، لیکن عموماً یہ تعلیم معلم کے الفاظ اور فلسفے سے آگے نہیں اس کے برخلاف انسانیت کے اس معلم اعظم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زبان سے ایثار کے الفاظ کم استعمال کیے اور عمل سے اس کی تعلیم زیادہ دی۔ حضرت فاطمۃ الزہرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی چہیتی صاحب زادی ہیں اور مرتبے کے لحاظ سے صرف عرب کی نہیں بلکہ دونوں جہان کی قابل احترام شہزادی ہیں، لیکن چکی پیستے پیستے ان کی ہتھلیاں گل گئی ہیں، وہ آ کر درخواست کرتی ہیں کہ مجھے کوئی خادمہ دلوادی جائے، لیکن مشفق باپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے جواب یہ ملا کہ ”فاطمہ ابھی صفہ کے غریبوں کا انتظام نہیں ہوا، اس لیے تمہاری خواہش پر عمل ممکن نہیں۔“

نویں خصوصیت:

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو صبر وتحمل اور عفو ودرگزر کا درس دیا تو خود اس پر عمل پیرا ہو کر دکھلایا، ایک مرتبہ کسی شخص کا کچھ قرضہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر واجب تھا، اس شخص نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے قرض کا مطالبہ کیا، اور غصہ دلانے کے لیے کچھ گستاخانہ الفاظ استعمال کیے ساری دنیا جانتی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو حقوق العباد کی ادائیگی کا کس قدر اہتمام تھا، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس شخص کے مطالبے کے

بغیر ہی اس کا قرض ضرور چکاتے، اس لیے اس شخص کے پاس اس کا کوئی جواز نہ تھا، چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے جانثار صحابہ رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین نے اس شخص کا یہ گستاخانہ انداز دیکھا تو اسے اس گستاخی کا مزا چکھانا چاہا، لیکن رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم اس کے تمام تر اشتعال انگیز اور تکلیف دہ رویے کو دیکھنے کے باوجود صحابہ رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین سے فرماتے ہیں کہ:

دعوہ فان لصاحب الحق مقالاً.

''اسے رہنے دو، وہ صاحب حق ہے، اور صاحب حق کو بات کہنے کی گنجائش ہوتی ہے۔''

دسویں خصوصیت:

عفو و درگذر کا جو معاملہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح مکہ کے موقع پر فرمایا، وہ تو ساری دنیا کو معلوم ہے کہ جن لوگوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھیوں پر عرصہ حیات تنگ کرنے کے لیے ظلم وستم کا کوئی طریقہ نہیں چھوڑا تھا، انہی لوگوں پر فتح کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ اعلان عام فرمادیا کہ:

لا تثریب علیکم الیوم، اذھبوا فانتم الطلقاء.

''آج کے دن تم پر کچھ ملامت نہیں، جاؤ تم سب آزاد ہو۔''

خلاصہ یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ تعلیم وتربیت جس نے دشمنوں تک کے دل جیتے اور جس نے ایک وحشی قوم کو تہذیب کے بام عروج تک پہنچایا، اس کی سب سے بنیادی خصوصیت یہ تھی کہ وہ تعلیم محض ایک فکر اور فلسفہ نہیں تھی جسے الفاظ کا خول چڑھا کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے پیروؤں کے سامنے پیش کردیا، بلکہ وہ ایک متواتر اور پیہم عمل سے ثابت تھی، آپ کی مبارک زندگی کی ہر ہر ادا مجسم تعلیم تھی، چنانچہ اگر احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا استقراء کرکے دیکھا جائے تو اس میں قولی احادیث کی تعداد کم ہے اور عملی احادیث کی تعداد زیادہ ہے۔ علامہ علی متقوی رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب اب تک احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا سب سے جامع ذخیرہ سمجھی جاتی ہے، اس کتاب میں علامہ موصوف رحمۃ اللہ علیہ نے ہر باب کے تحت قولی احادیث اور فعلی

احادیث کو الگ الگ ذکر کیا ہے۔ اگر اس کتاب ہی کا جائزہ لے لیا جائے تو بیشتر عنوانات کے تحت قولی احادیث کا حصہ مختصر اور فعلی احادیث کا حصہ زیادہ طویل نظر آتا ہے جس سے یہ حقیقت ثابت ہو جاتی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات نے روئے زمین پر جو حسین و دلکش انقلاب برپا فرمایا، اس میں زبانی تعلیم کا حصہ کم عملی تعلیم کا حصہ زیادہ ہے۔

آج اگر ہم اساتذہ کی تعلیم، واعظوں کے وعظ اور خطیبوں کی تقریریں نتائج کے اعتبار سے بے جان اور معاشرہ کے عظیم کام کے لیے بے اثر نظر آتی ہیں تو اس کی بنیادی وجہ یہی ہے کہ آج ہمارے معلموں، واعظوں اور اسلافوں کے پاس صرف دلکش الفاظ اور خوشنما فلسفے تو ضرور ہیں لیکن ہماری عملی زندگی ان دلکش الفاظ اور خوشنما فلسفوں سے متضاد ہے اور ایسی تعلیم و تربیت نہ صرف یہ کہ کوئی مفید اثر نہیں چھوڑتی، بلکہ بسا اوقات اس کا الٹا اثر یہ ہوتا ہے کہ مخاطب شدید ذہنی کشمکش اور فکری انتشار کا شکار ہو کر رہ جاتا ہے، استاد کا بیان کیا ہوا زبانی فلسفہ اور مقرر کی شعلہ بیان تقریریں ایک محدود وقت کے لیے انسانوں کو اپنی طرف متوجہ ضرور کر لیتی ہیں، لیکن جب تک اس کے ساتھ عملی نمونہ نہ ہو تو ان تقریروں سے صرف کان متاثر ہوتے ہیں اور بہت زیادہ ہوا تو عقل ان کی صحت کو تسلیم کر لیتی ہے، لیکن دلوں کو متاثر کرنے اور زندگی کی کایا پلٹنے کا عظیم کام اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک معلم کی تعلیم اور واعظ کا وعظ خود اس کی اپنی زندگی میں مکمل طور پر رچا بسا ہوا نہ ہو۔

اللہ تعالیٰ ہمیں اور ہمارے معلموں اور واعظوں کو اس بات کی توفیق عطا فرمائے کہ وہ اس راز کو سمجھ کر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ کی صحیح معنی میں پیروی کر سکیں۔ آمین

واخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین۔

مضمون: ۲

جشن میلاد النبی صلی اللہ علیہ وسلم
ایک لمحہ فکریہ

۱۲ ربیع الاول کو عید میلاد النبی صلی اللہ علیہ وسلم منانے کا رواج کچھ عرصہ سے مسلسل چلا آرہا ہے چونکہ عہد صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین اور قرون اولیٰ میں اس ''عید'' کا کوئی پتہ نشان نہیں ملتا۔ اس لیے اکابر علماء حق ہمیشہ یہ کہتے آئے ہیں کہ یہ دن منانے کی رسم ہم میں عیسائیوں اور ہندوؤں سے آئی ہے، تاریخ اسلام کے ابتدائی دور میں اس کی کوئی بنیاد نہیں ملتی لہٰذا اس رسم کی حوصلہ افزائی کے بجائے حوصلہ شکنی کرنی چاہیے، مسلمانوں کا اصل کام یہ ہے کہ وہ ان رسمی مظاہروں کے بجائے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کی طرف متوجہ ہوں اور ایک دن میں عید میلاد منا کر فارغ ہوجانے کے بجائے اپنی پوری زندگی کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کے سانچے میں ڈھالنے کی فکر کریں۔

یہ علماء دیوبند اور علمائے اہل حدیث کا موقف تھا اور بریلوی مکتب فکر کے حضرات اس سے اختلاف کرتے تھے لیکن اب چند سالوں سے جو صورت حال سامنے آرہی ہے اس میں یہ مسئلہ صرف دیوبندی مکتب فکر کا نہیں رہا۔ بلکہ ہر اس مسلمان کا مسئلہ بن گیا ہے جو سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت ومحبت اور حرمت وتقدیس کا کوئی احساس اپنے دل میں رکھتا ہو اب صرف علمائے دیوبند اور علمائے اہل حدیث ہی کو نہیں بلکہ علمائے بریلی کو بھی اس پر پوری سنجیدگی کے ساتھ غور کرنا چاہیے کہ جشن عید میلاد النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے نام پر یہ قوم دینی تباہی کے کس گڑھے کی طرف جارہی ہے کیونکہ جن حضرات نے ابتداء میں محفل میلاد وغیرہ کو مستحسن قرار دیا تھا ان کے چشم تصور میں بھی غالباً وہ باتیں نہیں ہوں گی جو آج ''جشن میلاد النبی صلی اللہ علیہ وسلم'' کا جزو لازم بنتی جارہی ہیں۔

شروع میں محفل میلاد کا تصور ایک ایسی مجلس کی حد تک محدود تھا جس میں سرور

کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت باسعادت کا بیان کیا جاتا ہو۔ لیکن انسان کا نفس اس قدر شریر واقع ہوا ہے کہ جو کام وحی کی رہنمائی کے بغیر شروع کیا جاتا ہے وہ ابتداء میں خواہ کتنا مقدس نظر آتا ہو لیکن رفتہ رفتہ اس میں نفسانی لذت کے مواقع تلاش کر لیتا ہے اور اس کا حلیہ بگاڑ کر چھوڑتا ہے۔ چنانچہ اب اللہ کے محبوب ترین پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے مقدس نام پر جو کچھ ہونے لگا ہے اسے سن کر پیشانی عرق عرق ہو جاتی ہے۔

امسال ''عید میلاد النبی'' کے نام سے کراچی میں ظلم و جہالت کے ایسے ایسے شرمناک مظاہرے کیے گئے ہیں کہ ان کے انجام کے تصور سے روح کانپ اٹھتی ہے مختلف محلوں کو رنگین روشنیوں سے دلہن بنایا گیا اور وہاں کے تقریباً تمام ہوٹلوں میں عید میلاد اس طرح منائی گئی کہ لاؤڈ اسپیکر لگا کر بلند آواز سے شب و روز ریکارڈنگ کا طوفان برپا رہا۔ بہت سے سینماؤں نے ''عید میلاد کی خوشی میں'' سینکڑوں بلب لگا کر ان اخلاق سوز اور برہنہ تصویروں کو اور نمایاں کر دیا جو اپنی ہر ہر ادا سے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام کی نافرمانی کی برملا دعوت دیتی ہیں اور انہی مقامات پر انسانیت کی تصویروں کے سائے میں شاید تبرک کے خیال سے کانہ کعبہ اور روضہ اقدس کی تصویریں بھی چسپاں کر دی گئیں۔ ایک محلہ میں قدم قدم پر روضہ اطہر اور مسجد نبوی کی شبیہیں بنا کر کھڑی کی گئیں جنہیں کچھ بے فکرے نوجوان ایک تفریح گاہ کے طور پر استعمال کر رہے تھے اور کچھ بے پردہ عورتیں انہیں چھو چھو کر ''خیر و برکت'' حاصل کر رہی تھیں اور ظاہر ہے کہ جب پورے محلہ کو روشنیوں میں نہلا کر جگہ جگہ محرابیں کھڑی کر کے اور قدم قدم پر فلمی ریکارڈ بجا کر ایک میلے کا سماں پیدا کر دیا جائے تو پھر عورتیں اور بچے ایسے میلے کو دیکھنے کے لیے کیوں نہ پہنچیں جس میں میلے کا لطف بھی ہے اور (معاذ اللہ) تعظیم رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کا ثواب بھی چنانچہ راتوں کو دیر تک یہاں تفریح باز مردوں، عورتوں اور بچوں کا ایسا مخلوط اجتماع رہا جس میں بے پردگی، غنڈہ گردی اور بے حیائی کو کھلی چھوٹ ملی ہوئی تھی۔

راقم الحروف ایک روز اس محلے سے گزرتے ہوتے یہ دلدوز مناظر اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا اور اس آیت قرآنی کے تصور سے روح کانپ رہی تھی کہ۔

وذر الذین اتخذوا دینھم لعبا و لھوا وغرتھم

الحیوۃ الدینا وذکر بہ ان تبسل نفس بما کسبت لیس لھا من دون اللہ ولی ولا شفیع وان تعدل کل عدل لایؤخذ منھا اولئک الذین ابسلوا بما کسبوا لھم شراب من حمیم و عذاب الیم بما کانوا یکفرون O

''اور ایسے لوگوں سے بالکل کنارہ کشی اختیار کرلو جنہوں نے اپنے دین کو کھیل تماشہ بنا رکھا ہے اور دنیاوی زندگی نے ان کو دھوکہ میں ڈال دیا ہے اور اس قرآن کے ذریعہ ان کو نصیحت کرو تاکہ کوئی شخص اپنے کیے میں اس طرح گرفتار نہ ہوجائے کہ اللہ کے سوا اس کا کوئی حمایتی اور سفارش کرنے والا نہ ہو اور اگر وہ دنیا بھر کا معاوضہ دے ڈالے تب بھی نہ لیا جائے۔ یہ وہی لوگ ہیں جو اپنے کیے میں گرفتار ہوئے ان کے لیے کھولتا ہوا پانی پینے کے لیے ہوگا اور کفر کے سبب دردناک سزا ہوگی۔''

اللہ تعالیٰ ہر مسلمان کو اس آیت کا مصداق بننے سے محفوظ رکھے، لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس محلے سے گزرتے ہوئے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے خاتم النبین صلی اللہ علیہ وسلم کا لایا ہوا دین پکار پکار کر یہ فریاد کر رہا ہے کہ ''محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کے نام لیواؤں! تم گمراہی اور بے حسی کے کس اندھے غار میں جا گرے ہو؟ کیا سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے احسانات کا بدلہ یہی ہے کہ انہی صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت و عظمت کے نام پر ان کی ایک ایک تعلیم کو جھٹلاؤ؟ ان کے ایک ایک حکم کی نافرمانی کرو؟ اور ان صلی اللہ علیہ وسلم کی یاد منانے کے بہانے جاہلیت کی ان تمام رسموں کو زندہ کر کے چھوڑو جنہیں اپنے قدموں تلے روندنے کے لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے تھے؟ خدا کے لیے سوچو کہ جس ذات صلی اللہ علیہ وسلم کو ساز و رباب اور چنگ و بربط توڑنے کے لیے مبعوث کیا گیا تھا، اس صلی اللہ علیہ وسلم کے ''جشن ولادت'' میں ساز و رباب سے کھیل کر تم کس غضب الٰہی کو دعوت دے رہے ہو؟ جس ذات نے عورت کے سر پر عفت و عصمت کا تاج رکھا تھا اور جس نے اس کے گلے میں عزت و آبرو کے ہار ڈالے تھے

اس کی محبت وتقدیس کے نام پر تم عورت کو بے پردگی اور بے حیائی کے کس میلے میں کھینچ لائے ہو؟ جس ذات نے نام ونمود، ریاونمائش، اسراف وتبذیر کی یہ نمائشیں منعقد کر کے تم کس کی خوشنودی حاصل کرنا چاہتے ہو؟ اگر دین کی کوئی صحیح خدمت تم سے نہیں ہوسکتی اگر تم اپنی عام زندگی میں اللہ کی نافرمانیوں کو ترک نہیں کرسکتے اگر محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات تمہارے عیش پرست مزاج کو بار معلوم ہوتی ہیں تو تمہاری زندگی کے بہت سے شعبے اس عیش پرستی کے لیے کافی ہیں۔ خدا کے لیے اللہ کے محبوب ترین پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) کے نام پر ہواو ہوس کا یہ بازار لگا کر اس نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کا مذاق تو نہ اڑاؤ جس کی تقدس اور پاکیزگی کے آگے فرشتوں کی گردنیں بھی خم ہو جاتی ہیں؟ اپنے گریبانوں میں منہ ڈال کر دیکھو کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک ایک حکم کی نافرمانی کرنے کے بعد تم کس چیز کی خوشی میں اپنے درودیوار پر چراغاں کر رہے ہو؟ کیا تمہیں اس بات کی خوشی ہے کہ چودہ سو سال کی اس مدت میں تم نے اپنی عملی زندگی میں اس دین برحق کی کوئی قدر صحیح سالم نہیں دیکھی؟''

لیکن عیش ونشاط کی گونجتی ہوئی محفلوں میں کون تھا جو دین مظلوم کی اس فریاد کو سن سکتا؟

جن لوگوں کا مقصد ہی اس قسم کے ہنگاموں سے عیش ونشاط کا سامان پیدا کرنا ہے، ان کا تو کوئی ذکر ہی نہیں لیکن جو لوگ واقعتاً آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعظیم و محبت ہی کے خیال سے اس قسم کے جشن مناتے ہیں وہ بھی یہ بات فراموش کر رہے ہیں کہ اسلام اور اکابر اسلام کو دوسرے مذاہب اور ان کے پیشواؤں پر قیاس نہیں کیا جاسکتا۔ اسلام نے جہاں ہمیں ان کی تعظیم اور ان کے تذکرے کو برقرار رکھنے کا حکم دیا ہے وہاں ہمیں اس کا طریقہ بھی بتایا ہے یہ وہ دین حق ہے جو ہمیں دوسرے مذاہب کی طرح رسمی مظاہروں میں الجھانے کے بجائے زندگی کے اس اصلی مقصد کی طرف متوجہ ہونے کے لیے یہ اکابر اس دنیا میں تشریف لائے تھے۔ ورنہ اگر اسلام بھی دوسرے مذاہب کی طرح ان رسمی مظاہروں کی طرح جانا جاتا تو آج ہم اس بات پر فخر محسوس نہ کر سکتے کہ ہمارا دین بفضلہٖ تعالیٰ اسی شکل میں محفوظ ہے جس شکل میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اسے لے کر دنیا میں تشریف لائے تھے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ جب کسی مذہب کے پیروکار محض ظاہری رسموں اور نمائشوں میں الجھ جاتے ہیں تو رفتہ رفتہ اس مذہب کی اصل تعلیمات مٹتی چلی جاتی ہیں اور بالآخر بے جان رسوم کا ایک ایسا ملغوبہ باقی رہ جاتا ہے جس کا انسانی نفسانی خواہشات کی حکمرانی کے سوا کچھ نہیں ہوتا اور جو مادہ پرستی کی بدترین شکل ہے۔ ان تمام تقریبات کا اصل مقصد تو یہ ہونا چاہیے تھا کہ ان کے ذریعہ وہ خاص شخصیت یا وہ خاص واقعہ ذہن میں تازہ ہو جس کی یاد میں وہ تقریب منعقد کی جارہی ہے اور پھر اس سے اپنی زندگی میں سبق حاصل کیا جائے۔ لیکن انسان کا نفس بڑا شریر واقع ہوا اس نے ان تہواروں کی اصل روح کو تو بھلا کر نابود کر دیا اور صرف وہ چیزیں لے کر بیٹھ گیا جس سے لذت اندوزی اور عیش پرستی کی راہ کھلتی تھی۔ اس کی وضاحت ایک مثال سے ہو سکے گی۔

عیسائی قومیں ہر سال ۲۵ دسمبر کو کرسمس کا جشن مناتی ہیں۔ یہ جشن دراصل حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا جشن ہے اور اس کی ابتدا اسی مقدس انداز میں ہوئی تھی کہ اس دن حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور آپ کی تعلیمات کو لوگوں میں عام کیا جائے گا چنانچہ ابتداء میں اس کی تمام تقریبات کلیسا میں انجام پاتی تھیں اور ان میں کچھ مذہبی رسوم ادا کی جایا کرتی تھیں رفتہ رفتہ اس جشن کا سلسلہ کہاں سے کہاں تک پہنچ گیا؟ اس کی مختصر داستان جشن و تقریبات کی ایک ماہر مصنفہ ہیز لٹائن ہے اس سے سنئے وہ انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا کے مقالہ ''کرسمس'' میں لکھتی ہیں۔

> ''کئی صدیوں تک کرسمس خالصۃً ایک کلیسا کا تہوار تھا جسے کچھ مذہبی رسوم ادا کر کے منایا جاتا تھا لیکن جب عیسائی مذہب بت پرستوں کے ممالک میں پہنچا تو اس میں ''سرمائی نقطہ انقلاب'' کی بہت سی تقریبات شامل ہو گئیں اور اس کا سبب گریگوری اعظم (اول) کی آزاد خیالی اور اس کے ساتھ مبلغین عیسائیت کا تعاون تھا اس طرح کرسمس ایک ایسا تہوار بن گیا جو بیک وقت مذہبی بھی تھا اور لادینی بھی اس میں تقدس کا پہلو بھی تھا اور لطف اندوزی کا سامان بھی۔''

اب کرسمس کس طرح منایا جانے لگا؟ اس کو بیان کرتے ہوئے میری ہیز لٹائن

لکھتی ہیں:

''رومی لوگ اپنی عبادت گاہوں اور اپنے گھروں کو سبز جھاڑیوں اور پھولوں سے سجاتے تھے ڈرائڈس (پرانے زمانے کے پادری) بڑے تزک و احتشام سے امر بیلیں جمع کرتے اور اسے اپنے گھروں میں لٹکاتے، سیکسن قوم کے لوگ سدا بہار پودے استعمال کرتے۔''

انہوں نے آگے بتایا ہے کہ:

''کس طرح شجر کرسمس (Christmas tree) کا رواج چلا، چراغاں اور آتش بازی کے مشغلے اختیار کیے گئے، قربانی کی عبادت کی جگہ شاہ بلوط کے درخت نے لے لی، مذہبی نغموں کی جگہ عام خوشی کے نغمے گائے گئے اور:

''موسیقی کرسمس کا ایک عظیم جزو بن گئی''

مقالہ نگار آگے رقمطراز ہے:

''اگرچہ کرسمس میں زیادہ زور مذہبی پہلو پر دیا گیا تھا، لیکن عوامی جوش وخروش نے نشاط انگیزی کو اس کے ساتھ شامل کر کے چھوڑا۔''

اور پھر:

''گانا بجانا، کھیل کود، رقص، ناٹک بازی اور پریوں کے ڈرامے تقریبات کا حصہ ہو گئے۔'' (انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا ص ۶۴۲۔ اے ج ۵۔ مطبوعہ ۱۹۵۰ء مقالہ ''کرسمس'')

ایک طرف کرسمس کے ارتقاء کی یہ مختصر تاریخ ذہن میں رکھیے اور دوسری طرف اس طرز عمل پر غور کیجیے جو چند سالوں سے ہم نے جشن عید میلاد النبی صلی اللہ علیہ وسلم منانے کے لیے اختیار کیا ہوا ہے کیا اس سے یہ حقیقت بے نقاب نہیں ہوتی کہ

این رہ کہ تومی روی بہ ترکستان است

ہاں ترکستان کی جگہ انگلستان کہہ دیجیے تو یہ زبان زد مصرعہ ہمارے موجودہ حالات کی بالکل سچی تصویر بن جائے گا۔

اسلام اس عالم الغیب کا مقرر کیا ہوا دین ہے جو اس کائنات کے ذرہ ذرہ سے

باخبر ہے اور جس کے محیط کے آگے ماضی، حال اور مستقبل کی سرحدیں بے معنی ہیں وہ انسانی نفس کی ان پر فریب کاریوں سے پوری طرح واقف ہے جو تقدس کا لبادہ اوڑھ کر انسانیت کو گمراہ کرتی ہیں اس لیے اس نے خاص خاص واقعات کی یادگار قائم کرنے کے لیے ان تمام طریقوں سے پرہیز کا حکم دیا ہے جو ان کی اصل روح کو فنا کر کے انہیں عیش و عشرت کی چند ظاہری رسوم کا بہانہ بنا سکتے ہوں۔ چنانچہ صحابہ رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین اور تابعین کے دور میں ہمیں کہیں نظر نہیں آتا کہ انہوں نے سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت باسعادت جیسے عظیم الشان واقعہ کا کوئی دن منایا ہو۔ اس کے برخلاف ان کی تمام تر توجہات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کو اپنانے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیغام کو پھیلانے کی طرف مرکوز رہیں اور اسی کا نتیجہ ہے کہ چودہ سو سال گزرنے پر بھی ہم مسلمان بیٹھے ہیں اور اگر اسلام پر عمل کرنا چاہیں تو یہ دین ٹھیک اسی طرح محفوظ ہے جس طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین تک پہنچایا تھا۔

لہٰذا اگر ہم اپنے اسلام کے اس طرز عمل کو چھوڑ کر غیر مسلم اقوام کے دن منانے کے طریقے کو اپنائیں گے تو مطلب یہ ہوگا کہ ہم دین کے نام پر کھیل تماشوں کے اسی راستے پر جا رہے ہیں جس سے اسلام نے بڑی احتیاطی تدابیر کے ساتھ ہمیں بچایا تھا۔ آپ کو معلوم ہے کہ اسلام نے غیر مسلم اقوام کی مشابہت سے پرہیز کرنے کی جا بجا انتہائی تدبیر کے ساتھ تلقین فرمائی ہے۔ انتہا یہ ہے کہ عاشورہ محرم کا روزہ جو ہر اعتبار سے ایک نیکی ہی نیکی تھی اس میں یہودیوں کی مشابہت سے بچانے کے لیے یہ حکم دیا گیا کہ صرف دس تاریخ کا روزہ نہ رکھا جائے بلکہ اس کے ساتھ نو یا گیارہ تاریخ کا روزہ بھی رکھا جائے تاکہ مسلمانوں کا روزہ عاشورہ یہودیوں سے ممتاز ہو جائے۔

غور فرمائیے! کہ جس دین حنیف نے اس باریک بینی کے ساتھ غیر مسلم اقوام کی تقلید بلکہ مشابہت سے بچانے کی کوشش کی ہے اس کو یہ کیسے گوارا ہو سکتا ہے کہ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کا یوم پیدائش منانے کے لیے ان کی نقالی شروع کر دی جائے جنہوں نے اپنے دین کو بگاڑ بگاڑ کر کھیل تماشوں میں تبدیل کر دیا ہے؟

مذکورہ بالا حقائق کے پیش نظر ہم اپنے ملک کے تمام علماء دینی رہنماؤں، مذہبی

جماعتوں اور بااثر مسلمانوں سے اپیل کرتے ہیں کہ وہ اس مسئلے پر پوری سنجیدگی کے ساتھ غور فرمائیں ہماری یہ اپیل صرف اہل حدیث اور دیوبندی مکتب فکر کے حضرات کی حد تک محدود نہیں بلکہ ہم بریلوی مکتب فکر کے حضرات سے بھی یہی گذارش کرنا چاہتے ہیں ''عید میلاد النبیؐ'' کے نام پر جو المناک حرکتیں اب شروع ہوگئی ہیں وہ یقیناً ان کو بھی گوارا نہیں ہوں گی۔

ہماری یہ تحریر ابھی یہیں تک پہنچی تھی کہ آج کے اخبار میں یہ اشتہار نظر سے گزرا:

ڈرائیوان سینما میں جلسہ سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم:

بروز جمعرات ۱۸ اپریل ۱۹۷۴ء ۶ بجے شام سے ۱۲ بجے شب اس ماہ مبارک کی بابرکت شب جمعرات بتاریخ ۱۸ اپریل آپ جملہ حضرات اور خواتین سے درخواست کی جاتی ہے کہ اس جلسہ مبارک کی عظمت و برکات میں شرکت فرما کر داخل حسنات ہوں۔ حج اور زیارت مدینہ منورہ کی رنگین فلمیں پیش کی جائیں گی۔ داخلہ بالکل مفت ہے۔

(جنگ: مورخہ ۱۵ اپریل ص ۴)

ڈرائیوان سینما کے بارے میں سارا شہر اس بات سے واقف ہے کہ وہ فحاشی کے بڑے اڈوں میں سے ایک اڈہ ہے۔ اس کے بعد ہم اس اشتہار پر کسی تبصرے کی ضرورت نہیں سمجھتے۔

یہ مسئلہ بالکل علیحدہ ہے کہ ''محفل میلاد'' منعقد کرنے کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ اور ''عید میلاد النبی صلی اللہ علیہ وسلم'' کے نام سے کوئی دن منانا کس حد تک درست ہے؟ اس مسئلہ میں بریلوی مکتب فکر کے حضرات ہم سے اختلاف کرسکتے ہیں لیکن جس انداز سے یہ دن اب منایا جانے لگا ہے اور دین حنیف پر جو ظلم اس مقدس نام سے کیا جارہا ہے ہمیں یقین ہے کہ اس کی طرف باشعور بریلوی حضرات بھی غور فرمائیں گے تو ہماری یہ اپیل انہیں اپنے قلب وضمیر کی آواز محسوس ہوگی۔

لہٰذا ہم دیوبندی، بریلوی اور اہل حدیث تمام مکاتب فکر کے سربرآوردہ حضرات سے یہ درخواست کرتے ہیں کہ خدا کے لیے وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مقدس نام نامی کے ساتھ ناقابل برداشت گستاخیوں کا سدباب کرنے کی فکر کریں اور اپنی تقریر و

تحریر اور ذاتی کوششوں کے ذریعہ عوام کو سمجھائیں کہ سرکار دو عالم محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ کے ساتھ محبت وعظمت کا اصل تقاضا کیا ہے؟ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی یاد منانے کے لیے غیر مسلم قوموں کے طریقے اختیار کر کے ہم کس بدترین گمراہی کے مرتکب ہو رہے ہیں اور اپنی زندگیوں کو سراسر گناہوں میں غرق کرنے کے بعد اگر ہم بزعم خود حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کا حق ادا کرنے کے لیے اس قسم کے کھیل تماشے منعقد کرتے رہے تو اس کا انجام دنیا وآخرت کی تباہی کے سوا کچھ نہیں ہوگا۔

وما علینا الا البلاغ

مضمون: ۳

سیرت کی محفلیں
ایک لمحہ فکریہ

ربیع الاول کا مہینہ آ رہا ہے اور ہمارے ملک میں یہ مہینہ سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم کی محفلوں، جلسوں اور کانفرنسوں کی ایک بہار لے کر آتا ہے۔ ملک کی شاید ہی کوئی بستی اور شہروں کا شاید ہی کوئی محلہ ایسا ہو جہاں سیرت طیبہ کے مبارک تذکرے کے لیے کوئی نہ کوئی محفل منعقد نہ ہوتی ہو۔

حضور سرور دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ ایک ایسا سدا بہار موضوع ہے جو کبھی پرانا نہیں ہو سکتا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر جمیل دنیا و آخرت دونوں کی سعادت ہے اور چونکہ ہر دور میں امت مسلمہ کے لیے صلاح و فلاح کا اگر کوئی راستہ ہو سکتا ہے تو وہ اسی سیرت طیبہ کی اتباع میں مضمر ہے، اس لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کو ہر مسلمان کا وظیفہ حیات بننا چاہیے اور صرف کسی ایک مہینے میں نہیں، بلکہ سال کے بارہ مہینے گھر گھر اس کا چرچا اور اس کی نشر و اشاعت ہونی چاہیے۔

لیکن یہاں ایک اہم سوال ہمارے لیے غور اور توجہ کا طالب ہے اور وہ یہ کہ جب ہم صحابہ رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین و تابعین کے زمانے اور قرون اولیٰ کے مسلمانوں کے حالات کا مطالعہ کرتے ہیں تو وہاں "عید میلاد النبی صلی اللہ علیہ وسلم"، "محفل میلاد"، "جلسہ سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم" یا "سیرت کانفرنس" اس قسم کی کسی محفل کا کوئی ذکر نہیں ملتا، وہاں حالت یہ نظر آتی ہے کہ ہر سال ربیع الاول کا مہینہ بھی آتا ہے، ربیع الاول کی بارھویں تاریخ بھی گذرتی ہے، لیکن نہ کوئی جلسہ ہے نہ جلوس، نہ کوئی تقریب، نہ چراغاں، نہ زیب و زینت نہ سجاوٹ، دوسرے مہینوں کی طرح ربیع اول کا مہینہ بھی سادگی سے آیا اور سادگی ہی سے رخصت ہو گیا۔

لیکن جلسوں جلوسوں اور تقریبات اور کانفرنسوں کے بغیر بھی جب ہم اس دور کے

مسلمانوں کے حالات کا جائزہ لیتے ہیں تو ان کی زندگیاں سیرت طیبہ کے سانچے میں ڈھلی ہوئی نظر آتی ہیں، ان کی ادا ادا سے سیرت وسنت کی خوشبو پھوٹتی ہے اور ان کے سراپا میں سیرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حسن و جمال جھلکتا نظر آتا ہے اور اسی حسن و جمال کے سہارے ان کا وجود بذات خود اسلام کی ایک مجسم دعوت محسوس ہوتا ہے جسے دیکھ دیکھ کر لوگ اسلام کی طرف کھینچتے ہیں، مسلمانوں کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہوتا جاتا ہے اور دیکھتے ہی دیکھتے اسلام کے عروج واقبال کا پرچم مشرق مغرب پر لہرانے لگتا ہے۔

دوسری طرف ہم اپنے حالات کا جائزہ لیں تو نظر آتا ہے کہ ہمارے ملک میں محلے محلے سیرت کی محفلیں منعقد ہو رہی ہیں، ربیع الاوّل کا مہینہ آتا ہے تو شہر شہر جلسے جلوسوں کی گہما گہمی شروع ہو جاتی ہے، ۱۲ ربیع الاوّل کو عمارتوں پر چراغاں بھی ہوتا ہے، جگہ جگہ تقریبات اور کانفرنسیں بھی منعقد ہوتی ہیں، اخبارات اور رسائل کے مخصوص ایڈیشنوں میں سیرت پر خوبصورت مضامین بھی شائع ہوتے ہیں، لیکن ہر سال جب ''عید میلاد النبی صلی اللہ علیہ وسلم'' کی یہ تقریبات اختتام کو پہنچتی ہیں تو ہمارا دامن عمل سیرت طیبہ کی خوبو سے شاید اس سے زیادہ خالی ہوتا ہے جتنا ان تقریبات کے آغاز پر خالی تھا۔ سیرت طیبہ پر اتنی تقاریر سن کر اور اتنے مقالے پڑھ کر بھی ہمارے دل کی دنیا نہیں بدلتی، ہمارے دلوں میں کوئی سوز وگداز پیدا نہیں ہوتا، ہماری زندگی کے طرز و انداز میں کوئی تبدیلی نہیں آتی اور ہمارے شب و روز جن بدعنوانیوں اور جن گناہوں میں بسر ہو رہے تھے، ان میں کوئی کمی واقع نہیں ہوتی اور نتیجہ یہ ہے کہ ہمیں دیکھ دیکھ کر لوگ اسلام کے قریب آنے کے بجائے اسلام سے بھاگتے ہیں اور اس طرح ہمارا وجود اللہ معاف فرمائے۔ اسلام کی دعوت بننے کے بجائے اسلام کے راستے میں ایک رکاوٹ بن کر رہ گیا ہے۔

سوال یہ ہے کہ آخر ایسا کیوں ہے؟ جس رشک ملائک سیرت طیبہ کی ایک ایک ادا نے دلوں کی کایا پلٹ ڈالی، جس نے ۲۳ سال کے مختصر وقت میں جزیرۂ عرب کو نہ صرف بت پرستی بلکہ جاہلیت کی تمام رسوم سے پاک کر دیا، جس نے ظلم و جہالت کے چھائے ہوئے اندھیرے میں ہدایت کی وہ مشعلیں روشن کر دیں جو قیامت تک انسانیت کی

رہنمائی کریں گی، آج اس سیرت طیبہ کو پڑھ کر اور سن کر ہمارے اندر کوئی تبدیلی کیوں نہیں آتی؟

اگر آپ حقیقت پسندی کے ساتھ اس سوال کے جواب پر غور کرتے ہوئے قرون اولیٰ سے اپنے حالات کا موازنہ کریں گے تو اس نتیجے تک پہنچنے میں دیر نہیں لگے گی کہ ہمارے اور ان کے درمیان وہی فرق ہے جو کسی شئے کی ظاہری نمائش اور اس کی حقیقت اور روح میں ہوتا ہے۔ ہماری ساری کاوشیں اور تمام تر توانائیاں چند ایسے رسمی مظاہروں کی ادائیگی تک محدود ہیں جو اندر سے کھوکھلے، بے جان اور روح سے خالی ہیں۔ ان مظاہروں کی ادائیگی کے ذریعے ہم اپنے آپ کو مسلسل یہ دھوکہ دے رہے ہیں کہ ہم نے سیرت طیبہ کا حق ادا کردیا، ورنہ سیرت طیبہ کی روح اور اس کی حقیقت سے ہمارا فاصلہ روز بروز بڑھتا جارہا ہے۔

قرون اولیٰ کے مسلمان ان ظاہری رسموں اور رسمی مظاہروں سے کوسوں دور تھے، لیکن سیرت طیبہ ان کی رگ رگ میں سرایت کیے ہوئے تھی، انہیں سیرت طیبہ کے ذکر کے لیے کوئی محفل منعقد کرنے یا عشق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اظہار کے لیے جلوس اور چراغاں کی ضرورت نہ تھی، کیونکہ ان کی پوری زندگی سیرت طیبہ اور عشق رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) میں ڈوبی ہوئی تھی، وہ جہاں بیٹھ گئے، وہیں سیرت کی محفل سج گئی، ان کے دلوں میں عشق ومحبت کے جو چراغ روشن تھے، ان کے آگے عمارتوں پر جھلملاتے ہوئے چراغوں کی کوئی حیثیت نہ تھی، ان کی اداؤں سے سیرت وسنت کا جو مظاہرہ ہوتا تھا، وہ جلوسوں اور کانفرنسوں سے بے نیاز تھا، سیرت طیبہ ان کے لیے معاذ اللہ۔ کوئی قصہ پارینہ نہیں تھا جس کی یاد منا منا کر اسے زندہ رکھنے کی ضرورت ہو، بلکہ وہ ایک جیتی جاگتی حقیقت تھے، ایک زندگی سے بھرپور پیغام تھا، ایک جاندار دعوت تھی جس کے نور سے انہوں نے اپنی سیاست ومعیشت سے لے کر محراب ومنبر تک زندگی کے ہر شعبہ کو منور کر رکھا تھا۔

لیکن یہ نفس انسانی کی خاصیت ہے کہ جب کسی شے کی حقیقت کو تھامے رکھنا اس کے آرام طلب مزاج پر بار ہوتا ہے تو وہ چند رسمی مظاہروں میں پناہ لے کر ضمیر کو تھپکیاں دینے کی کوشش کیا کرتا ہے، چنانچہ ہمارے ساتھ بھی یہی ہورہا ہے، سیرت وسنت کی

حقیقت کو اپنانا ہمارے عیش پرست (اور ذہنی طور پر غلام) مزاج کو شاق گذرتا ہے، تو اس نے چند ظاہری رسموں کو آسان سمجھ کر اختیار کیا ہوا ہے، تاکہ ضمیر کو یہ تسلی دی جاسکے کہ سیرت وسنت کا حق ادا ہو رہا ہے، دعوت دین کا حقیقی راستہ ہمیں کٹھن معلوم ہوتا ہے، لہٰذا ہمارے نفس نے ہمیں کھوکھلی تقریروں اور بے روح مقالات کے خول میں بند کر رکھا ہے، دعوت کے خارزاروں میں چلنے کے بجائے داد و توصیف کے نعروں میں تقریر کر لینا زیادہ آسان ہے، لہٰذا ہم یہ تقریریں کر کے مطمئن ہیں کہ دعوت دین کا حق ادا ہو رہا ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ میدان جہاد میں نعرۂ تکبیر بلند کرنے کے بجائے پھولوں کی سیج پر منعقد ہونے والے جلسوں میں نعرے لگانا زیادہ آسان ہے، لہٰذا ہم نے انہی نعروں پر اکتفا کر رکھا ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ اپنی زندگی کے طرز و انداز کو بدل کر اسے سیرت وسنت کے سانچے میں ڈھالنے کے بجائے کسی جلسے میں بیٹھ کر سیرت کے واقعات پر ''سبحان اللہ'' کہہ دینا، یا سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان اقدس میں کوئی نعت پڑھ لینا کہیں زیادہ آسان ہے، لہٰذا ہمارے نفس نے بس اسی کو ذریعہ نجات قرار دے رکھا ہے۔ ہماری حکومت کو احساس ہے کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کو سرکاری سطح پر عملاً نافذ کرنے کے بجائے سال کے کسی ایک دن کسی ہوٹل میں ''سیرت کانفرنس'' کا اہتمام یا ذرائع ابلاغ پر تقریروں اور مذاکروں اور عمارتوں پر چراغاں کا انتظام زیادہ آسان ہے، لہٰذا اس نے اسی عمل کو اپنے ''نفاذ اسلام'' کی علامت کے طور پر اختیار کر رکھا ہے۔

غرض جدھر دیکھیے، ہم رسوم وظواہر کے پردے میں اپنے آپ کو دھوکہ دے رہے ہیں کہ ہم نے سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم کا حق ادا کر دیا۔ ورنہ جہاں تک سیرت طیبہ کی حقیقی روح کا تعلق ہے، اس سے نہ صرف یہ کہ ہم نے دور کا بھی واسطہ نہیں رکھا، بلکہ مسلسل اس سے روگردانی پر تلے ہوئے ہیں۔ بلکہ حد تو یہ ہے کہ ٹھیک ان جلسوں اور محفلوں میں جو ہم سیرت کے نام پر منعقد کرتے ہیں، ہماری طرف سے بسا اوقات کھلم کھلا سیرت وسنت کی مخالفت، بلکہ اس سے غلطیاں سرزد ہوتی ہیں، سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے واضح احکام کی اعلانیہ خلاف ورزیاں کی جاتی ہیں، مرد و زن کا بے محابا اختلاط ہوتا ہے، نعتیں پڑھنے کے لیے ساز و سرور کا سہارا لیا جاتا ہے، تصویر سازی کی جاتی ہے، تقریروں میں غیبت اور بہتان کا بازار گرم ہوتا ہے، جلسے جلوسوں کے انتظام

میں نمازیں قضا ہوتی ہیں اور اس کے باوجود ہم یہ سمجھتے ہیں کہ ان رسمی مظاہروں سے سیرت وسنت زندہ ہو رہی ہے۔ اناللہ وانا الیہ راجعون!!

قرآن کریم کا ارشاد ہے:

لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ لمن کان یرجوا اللہ والیوم الاخرو ذکر اللہ کثیراً

''بلاشبہ تمہارے لیے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت) میں بہترین نمونہ ہے ان لوگوں کے لیے جو اللہ کا اور یوم آخرت کا یقین رکھتے ہیں اور اللہ کو کثرت سے یاد کرتے ہیں۔''

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے بتا دیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ سے حقیقی ہدایت ان لوگوں کو نصیب ہوتی ہے جو اللہ تعالیٰ اور یوم آخرت پر نہ صرف یقین رکھتے ہوں، بلکہ اللہ تعالیٰ کو کثرت سے یاد کرتے ہوں، جو سیرت طیبہ کا مذاکرہ صرف نمود و نمائش یا رسم پری کرنے کے لیے نہیں، بلکہ ہدایت کی سچی طلب کریں، جن کے دلوں میں حق کی تشنگی ہو اور وہ واقعتاً اللہ تعالیٰ کو راضی کرنا چاہتے ہوں۔ اس معیار پر ہم میں سے ہر شخص اپنا جائزہ لے کر دیکھ سکتا ہے کہ وہ کسی نیت اور کس مقصد سے یہ محفل منعقد کر رہا ہے؟ اور اس میں قرآن کریم کی بیان فرمائی ہوئی یہ شرائط پائی جاتی ہیں یا نہیں؟

اگر واقعتاً ہدایت کی سچی تڑپ اور اصلاح حال کا حقیقی جذبہ لے کر ہم سیرت طیبہ کا مذاکرہ کریں تو ممکن نہیں ہے کہ ہماری عملی زندگی میں کوئی تبدیلی نہ آئے۔ اگر ہم اتنا ہی تہیہ کرلیں کہ سیرت طیبہ کے ذکر مبارک کے بعد ہم میں سے ہر شخص کم از کم دس ایسی سنتوں پر عمل پیرا ہوگا جن پر وہ پہلے کاربند نہیں تھا، تو تھوڑے ہی عرصے کے اندر ہمارے معاشرے میں انقلاب آسکتا ہے۔ معاشرے کی وہ برائیاں جو ہمیں گھن کی طرح چاٹ رہی ہیں، ان کے لیے سیرت طیبہ سے ہدایت طلبی ہی مؤثر علاج بن سکتی ہے۔ اگر سیرت طیبہ کی ان محفلوں میں سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے انداز زندگی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کے حوالے سے ان معاشرتی برائیوں کو موضوع بنایا جائے، کہنے والے کے دل میں دعوت و اصلاح کا سوز ہو اور سننے والے اصلاح حال کی تشنگی لے کر

جائیں، تو ایک ایک کر کے ساری معاشرتی برائیوں کا سد باب ہو سکتا ہے۔

یہ ایک لمحہ فکر یہ ہے جس پر ہم سب کو دردمندی کے ساتھ غور کرنا چاہیے، اللہ تعالیٰ ہمیں سیرت طیبہ کو ٹھیک ٹھیک سمجھنے اور اس کے حقیقی تقاضوں پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

وآخر دعونا ان الحمد للہ رب العالمین

مضمون:۴

فحاشی کا عذاب

''ایڈز''

ایک حدیث میں نبی کریم سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:۔

لم تظهر الفاحشة فی قوم قط، حتی یعلنوا بها، إلا نشا فیهم الطاعون، والا وجاع التی لم تکن مضت فی أسلافهم الذین مضوا

''جب کبھی کسی قوم میں فحاشی کا رواج بڑھتا ہے، یہاں تک کہ وہ کھلم کھلا بے حیائی کرنے لگتے ہیں تو ایسے لوگوں کے درمیان طاعون اور ایسی بیماریاں پھیل جاتی ہیں جو ان کے گذرے ہوئے اسلاف کے زمانے میں موجود نہیں تھیں۔''

(سنن ابن ماجہ، کتاب الفتن، حدیث نمبر ۴۰۱۹، باب العقوبات)

آج دنیا میں نئی سے نئی بیماریاں سامنے آرہی ہیں، بہت سی بیماریاں تو ایسی ہیں، جن کا پہلے نہ کوئی تصور تھا، نہ ان کا نام کہیں سنا گیا تھا اور بہت سی ایسی ہیں کہ پہلے کہیں اکا دکا کسی کو ہو جاتیں تو ایک انہونے عجوبے کی طرح اُس کا شور مچ جاتا تھا لیکن آج بیماریاں بستی بستی پھیل گئی ہیں اور ان میں مبتلا ہونے والوں کی تعداد روز افزوں ہے۔ ان تمام ہی بیماریوں کو مذکورہ بالا حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا مصداق قرار دیا جا سکتا ہے، کیونکہ دنیا میں جس رفتار سے فحاشی بڑھ رہی ہے، اسی رفتار سے ان بیماریوں میں اضافہ ہو رہا ہے۔

لیکن حال ہی میں ۱۹۸۱ء کے بعد سے ایک خوفناک بیماری امریکہ وغیرہ میں ایسی پیدا ہوئی ہے جسے سوائے فحاشی کے عذاب سماوی کے کسی اور عنوان سے تعبیر نہیں کیا

جاسکتا۔ یہ ''ایڈز'' کی وہ مہلک بیماری ہے جس کا چرچا آج کل اخبارات ورسائل میں بکثرت ہوتا رہتا ہے۔ یوں تو اس بیماری میں یکا یک وزن گھٹتے جانا، بخار، دست وغیرہ کی علامات نمایاں ہوتی رہتی ہیں، دماغ بھی اس سے متاثر ہوتا ہے لیکن اس بیماری کی خوفناک ترین خصوصیت یہ ہے کہ اس میں مریض کے جسم سے ہر قسم کی قوت مدافعت ختم ہوجاتی ہے۔ چنانچہ اس کے بعد خفیف سے خفیف بیماری کا بھی اس میں تحمل نہیں ہوتا۔ یہاں تک کہ ایک معمولی سا عارضہ بھی جان لیوا ثابت ہوتا ہے، چنانچہ اس بیماری میں مبتلا ہونے کو موت کا یقینی ہونا سمجھا جاتا ہے۔ اس بیماری کا کوئی علاج ابھی تک دریافت نہیں ہوا اور اطباء اب تک کی تحقیق وجستجو سے جس نتیجے پر پہنچے ہیں، وہ یہ ہے کہ اس بیماری کا سب سے بڑا سبب رگ کے انجکشن کے ذریعے منشیات کا استعمال اور جنسی اختلاط کی کثرت ہے اور یہ یا تو ہم جنسی (غیر فطری عمل) سے پیدا ہوتی ہے، یا ایسے مردوں کو لگتی ہے جو کسی امتیاز کے بغیر زیادہ عورتوں سے جنسی تعلق قائم رکھتے ہوں نیز ایسی عورتوں کو جو زیادہ مردوں سے جنسی تعلق استوار کرتی ہوں۔

جب سے امریکہ میں یہ بیماری پیدا ہوئی ہے، وہاں کے اخبارات ورسائل میں اس موضوع پر ایک کہرام مچا ہوا ہے، ان کے تقریباً ہر دوسرے تیسرے شمارے میں ایڈز کی خبریں، اس پر تبصرے اور اس سلسلے میں لوگوں کے تاثرات شائع ہوتے رہتے ہیں لیکن اس مرتبہ امریکہ کے ایک رسالے ''ٹائم'' نے اپنی ۱۶ر فروری کی اشاعت میں اس موضوع پر تین بہت مفصل مقالے شائع کیے ہیں اور ان کی اہمیت کے پیش نظر انہی میں سے ایک مقالے کے عنوان کو اپنے ٹائٹل پر جلی الفاظ میں چھاپا ہے۔ عنوان یہ ہے:

''لرزہ خیز خطرہ''

''زیادہ مخلوط جنسی تعلقات رکھنے والے کس طرح ایڈز کے منہ میں جارہے ہیں؟''

ایک مضمون ''ٹائم'' کی ایک خاتون ایسوسی ایٹ ایڈیٹر مارتھا سملجس نے لکھا ہے اور دوسرا ایک اور ایسوسی ایٹ ایڈیٹر کلاڈیا والس کا لکھا ہوا ہے، ان دونوں نے یہ مضامین ''ایڈز'' اور اس کے اثرات کے ایک صحافیانہ سروے کے بعد لکھے ہیں تیسرا مضمون مکائیل ایس سیرل کا ہے جس نے افریقہ میں اس بیماری کی تباہ کاریوں کا جائزہ لیا ہے۔

ان مضامین میں دیئے ہوئے اعداد و شمار کے مطابق اس وقت امریکہ میں تیس ہزار سے زائد افراد ایڈز کے مرض میں مبتلا ہیں۔ اٹلانٹا کے طبی مرکز کے مطابق جو لوگ بلا امتیاز مختلف افراد سے جنسی تعلق قائم رکھتے ہیں، ان میں اس بیماری کی بنا پر اموات کی شرح ۱۹۸۶ء کی مقابلے میں دگنی ہوگئی ہے۔ لیکن اس بیماری کا تشویش ناک پہلو یہ ہے کہ اس کا جرثومہ جسم میں داخل ہونے کے بعد ظاہری مرض کی شکل اختیار کرتے کرتے مختلف افراد میں مختلف موتیں لے لیتا ہے۔

بعض ماہرین کے خیال کے مطابق یہ موت دس سال تک وسیع ہوسکتی ہے۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ جس جنسی عمل کے ذریعے بیماری کا جرثومہ جسم میں داخل ہوا، ضروری نہیں کہ اس کے بعد جلدی ہی اس کے اثرات بیماری کی شکل میں ظاہر ہو جائیں۔ بلکہ بعض اوقات یہ اثرات دس سال بعد بھی ظاہر ہوسکتے ہیں۔ اس حقیقت کو مدنظر رکھتے ہوئے محکمہ صحت کا اندازہ یہ ہے کہ اس وقت امریکہ میں دس لاکھ سے زیادہ افراد ایڈز کے جراثیم کا نشانہ بنے ہوئے ہیں جن میں سے نوے فی صد افراد کو اپنے بارے میں اس ہولناک حقیقت کا علم بھی نہیں ہے۔

امریکہ کے علاوہ براعظم افریقہ میں بھی یہ بیماری تیزی سے پھیل رہی ہے اور افریقہ میں بیس لاکھ سے پچاس لاکھ تک کی تعداد ایڈز میں مبتلا ہو چکی ہے، امریکہ کے محکمہ ''صحت وانسانی خدمات'' کے سیکریٹری اوٹس بادن کا کہنا ہے کہ:

''اگر ہم بیماری کی روک تھام میں کوئی مؤثر پیش رفت نہ کرسکے تو آئندہ دس سال کے اندر دنیا کے کروڑوں افراد کے لیے ایک عالمگیر پیغام موت کا خوفناک اندیشہ پیدا ہو جائے گا۔''

اور جان پاپ کنس یونیورسٹی کے ماہر وبائی امراض بی فرینک پاک نے کہا ہے کہ:

''بعض ملک اپنی آبادی کا ۲۵ فیصد حصہ اس وبائی مرض میں گنوا بیٹھیں گے۔''

ابھی تک اس بیماری کا کوئی علاج دریافت نہیں ہوا، بڑی کد و کاوش کے بعد جو چند دوائیں ایجاد ہوئی ہیں وہ صرف عارضی تدابیر کی حیثیت رکھتی ہیں۔ جن سے عوارض کی شدت میں وقتی افاقہ ہو جاتا ہے، لیکن مرض ختم نہیں ہوتا۔ بلکہ ان میں سے بعض دوائیں

کچھ اور پیچیدگیاں پیدا کر دیتی ہیں جن میں خون کی بیحد کمی اور غشی وغیرہ داخل ہیں۔ بعض دواؤں کے استعمال کے دوران ہر ہفتے مریض کے جسم کا سارا خون تبدیل کرنا لازمی ہو جاتا ہے۔

دوسری طرف یہ عارضی اور وقتی علاج بھی اس قدر مہنگا ہے کہ امریکہ میں ایڈز کے مریضوں کی دیکھ بھال پر آنے والے اخراجات کا تخمینہ دس کروڑ ڈالر سے زیادہ ہے اور اندازہ یہ ہے کہ یہ اخراجات ۱۹۹۱ء تک ایک ارب چار کروڑ ڈالر سالانہ تک پہنچ جائیں گے۔ (ٹائم کا مذکورہ شمارہ صفحہ ۲۸، کالم ۳)

ایک اور تحقیق کے مطابق امریکہ میں ایڈز کے دس مریضوں کے علاج پر چار لاکھ پچاس ہزار ڈالر کا خرچ آیا۔ یہ رقم افریقی ملک زائر کے سب سے بڑے ہسپتال کے پورے سال کے بجٹ سے بھی زائد ہے (ص ۳۳ کالم ۲) اس طرح ایڈز کی بیماری میں مبتلا ملکوں کے لیے ایک معاشی چیلنج بھی بنتی جاری ہے۔

اس بیماری سے حفظ ماتقدم کا بھی کوئی یقینی طریقہ دریافت نہیں ہو، امریکی محکمہ صحت کے مطابق:

> ”ہر وہ شخص جو کسی نئی ساتھی کے ساتھ جنسی عمل میں مشغول ہو، یا کسی ایسے پرانے ساتھی کے ساتھ جس کا ماضی نامعلوم ہے، ایڈز کے خطرے کا شکار ہے۔“ (ص ۲۵ کالم ۲)

امریکی معاشرے میں بلا امتیاز جنسی تعلقات کا جو گھناؤنا سیلاب امڈ آیا ہے، اس کی بناء پر بسا اوقات شوہر اور بیوی کو بھی ایک دوسرے کا ”جنسی ماضی“ معلوم نہیں ہوتا، اس لیے یہ خطرہ گھر گھر پھیل رہا ہے اور جب تک دونوں رفیق زندگی مکمل طور پر اپنا ٹیسٹ نہ کرائیں، اس وقت تک ایک شادی شدہ جوڑا بھی۔ جو آئندہ بدکاری سے تائب ہو چکا ہو۔ اس خطرے سے مستثنیٰ نہیں ہے۔ اٹلانٹا کا طبی مرکز اس وقت ایڈز کے سدباب کے سلسلے میں سب سے زیادہ سرگرم ہے اور مارتھا سملجس نے اپنے مضمون میں اس کے ایک ذمہ دار افسر کا یہ جملہ نقل کیا ہے کہ:

> ”ہم اپنے ۱۹۶۰ء کی عشرے میں کیے ہوئے گناہوں کی قیمت ادا کر رہے ہیں، جب حالت یہ تھی کہ ایک رات آتی تو کوئی ذمہ

داری قبول کیے بغیر جنسی عمل کا ارتکاب ایک دلکش فیشن سمجھا جاتا۔"

(ص ۲۵ کالم ۴)

بعض لوگ اب اس نہج پر سوچنے لگے ہیں اور اس صورت حال کا دیرپا علاج اسی میں سمجھتے ہیں کہ بلا امتیاز جنسی تعلقات قائم کر کے فطرت کے ساتھ اس بغاوت کا سلسلہ اب ختم ہونا چاہیے۔ مارتھا سملجس لکھتی ہے:

"تاہم ہر سطح پر محکمہ صحت کے افسران اس بات کی وکالت کر رہے ہیں جو قریب قریب ایک سماجی انقلاب کی حیثیت رکھتی ہے، امریکی محکمہ "صحت و انسانی خدمات" کے سیکریٹری اوٹس۔ آر بادن کہتے ہیں کہ۔ طریق زندگی میں تبدیلی لانے کی ناگزیر ضرورت پر جتنا بھی زور دیا جائے کم ہے" ۱۹۸۰ء کے بعد کے امریکہ کے لیے اس کا مطلب یہ ہے کہ گذشتہ ربع صدی میں جو جنسی انقلاب آیا تھا، اسے منسوخ کر دیا جائے۔" (ص ۲۵ کالم ۱)

"جن لوگوں کے بے امتیاز جنسی اختلاط کے نتیجے میں اپنے اندر اس بیماری کا شبہ پیدا ہو گیا ہے، اب وہ ہر جنسی عمل سے انتہائی خوفزدہ ہیں۔ بعض افراد نے اپنے اندر ایڈز کی بیماری موجود ہونے کی خبر سنتے ہی اس کی اذیتوں کے خوف سے خودکشی کر لی ہے۔ اٹلانٹا کا طبی مرکز جو ایسے لوگوں کی پناہ گاہ بنا ہوا ہے، اس میں صبح و شام ایسے لوگوں کے فون آتے رہتے ہیں۔ مرکز کی ڈائریکٹر میری بلیمنگ کہتی ہیں کہ "میں جنسی اختلاط رکھنے والی عورتوں میں شدید خوف کے اثرات دیکھتی ہوں۔ جو اب باقی ماندہ زندگی میں تجرد اختیار کرنے کا فیصلہ کر رہی ہیں۔" (ص ۲۵ کالم ۳)

"لیکن امریکی معاشرے میں جنسی بے راہ روی جس بری طرح رچ بس گئی ہے اور وہ اس سلسلے میں جس مقام پر پہنچ چکا ہے، اس کو مدنظر رکھتے ہوئے اصلاح حال کی کوشش کرنے والے اس بات سے تقریباً مایوسی کا اظہار کر رہے ہیں کہ معاشرے کے جنسی طرز

عمل میں کوئی نمایاں تبدیلی آسکے گی، کیونکہ جن لوگوں کو ابھی اس وباء سے براہ راست واسطہ نہیں پڑا، وہ اپنے جنسی طرز عمل میں ادنیٰ تبدیلی لانے کے لیے ہرگز تیار نہیں ہیں، بلکہ اس تصور کا بھی مذاق اڑاتے ہیں، جس کی کئی مثالیں ''ٹائم'' کے زیر نظر مضامین میں دی گئی ہیں۔ لہٰذا محکمہ صحت کی دوسری کوشش یہ ہے کہ کم از کم لوگ جنسی عمل کے دوران ایسی احتیاطی تدابیر اختیار کریں جو ایڈز کی روک تھام کرسکیں۔ ان احتیاطی تدابیر میں کنڈوم (مانع حمل غلاف) کا استعمال بھی شامل ہے چنانچہ ''محفوظ جنسی عمل'' (SAFE SEX) کے عنوان سے ان تدابیر کی تعلیم و تبلیغ ہر جگہ جاری ہے۔''

''لیکن ان تدابیر کی تعلیم و تبلیغ سے فحاشی میں کوئی کمی آنے کے بجائے اس میں اضافہ ہوگیا ہے، کیونکہ مارتھا سمتھ کے الفاظ میں اس طرح پریس میں اور ٹیلی ویژن پر انسان کی جسمانی حرکات اور کنڈوم جیسے جنسی تحفظات کے استعمال پر مفصل مذاکرے ہونے لگے ہیں اور ان کے نتیجے میں جنسی عمل کے طریقے عوام میں اتنے الم نشرح ہو کر پھیل گئے ہیں کہ ایک سال پہلے ان کے اس طرح گھر گھر پھیلنے کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا تھا۔'' (ص ۲۵ کالم)

''اس کے باوجود جن لوگوں کو اس بیماری سے کوئی قریبی واسطہ نہیں پڑا، وہ ان احتیاطی تدابیر کو اختیار کرنے پر بھی آمادہ نہیں ہیں۔ جب انہیں ایڈز کے خطرات کی طرف متوجہ کیا جاتا ہے تو وہ یہ کہہ کر ٹال دیتے ہیں کہ ''ہم تو ایسا کرتے ہیں ہمیں کچھ نہیں ہوگا'' حد یہ ہے کہ نیویارک کی کولمبیا یونیورسٹی میں ''خدمات صحت'' کے ڈائریکٹر نے طلبہ اور طالبات کی سہولت کی خاطر ''خدمات صحت'' کی عمارت کے بیت الخلاؤں میں ''کنڈوم'' کی فراہمی کا انتظام کردیا۔ نیز ۳۱ صفحات پر مشتمل ایک کتابچہ تقسیم کرایا جس میں

"محفوظ جنسی عمل" کے بارے میں معلومات اتنی وضاحت کے ساتھ درج تھیں کہ اس کے جو فقرے "ٹائم کے مضمون میں نقل کیے گئے ہیں۔ انہیں نقل کرنے کی راقم الحروف کے قلم میں سکت نہیں ہے۔ کیلیفورنیا کی مشہور یونیورسٹی میں دو ہفتے قبل "ایڈز اور کالج کا احاطہ" کے موضوع پر ایک سمپوزیم کا اہتمام کیا گیا ہے۔ جس میں نوے کالجوں کے ۴۳۵ نمائندوں نے شرکت کی۔ اس سمپوزیم کے دوران ایک فلم دکھائی گئی جس میں "محفوظ جنسی عمل" کا عملی مظاہرہ پیش کیا گیا تھا۔"

"لیکن طلباء ان خدمات سے فائدہ اٹھانے کے لیے تیار نہیں وہ مذکورہ کتابچے ردی کے ٹوکروں میں پھینک جاتے ہیں اور کنڈوم "کو" بے آرامی کا ذریعہ (INCDNUENIENCE) قرار دیتے ہیں۔ ایک اکیس سالہ طالب علم سے جب اس طرز عمل کے بارے میں سوال کیا گیا تو اس نے جواب دیا کہ "جذبات کے برانگیختہ ہونے کے بعد انسان ایسے مرحلے پر پہنچ جاتا ہے جہاں رکنا ممکن نہیں ہوتا۔ اس وقت پانچ سال بعد کی بات نہیں سوچی جاسکتی۔ اس وقت تو صرف اسی وقت کے بارے میں سوچا جاسکتا ہے۔" (ص ۲۶ کالم ۲،۳)

ایک ناول نگار خاتون اریکا جونگ جو جنسی آزادی کی سرگرم پرچارک رہی ہے، واشنگٹن پوسٹ کے ایک کالم میں ان احتیاطی تدابیر پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتی ہے:

"اب یہ کام بہت مشکل ہے کہ کوئی دلکش تنہا مرد اس سے یہ تحقیق کیے بغیر حاصل کیا جاسکے کہ اس کے جنسی تعلقات اور منشیات کے استعمال کی تاریخ کیا رہی ہے؟ نیز اس کے خون کے معائنے کے نتائج بھی معلوم کرنے ہوں گے پھر اس کے ہاتھ میں کنڈوم بھی تھمانا ہوگا۔ کیا اس سارے جھنجھٹ کے مقابلے میں جنسی عمل سے بالکلیہ دستبردار ہو کر کسی مذہبی تنظیم میں شامل ہو جانا زیادہ آسان

نہیں؟'' (ص ۲۵ کالم)

یہ ہیں وہ حالات جن میں صحت کی ایک معلمہ میری شرمن کا کہنا ہے کہ ''ہمارے اور کنڈوم کو قبول کرنے کے درمیان پوری ایک نسل کا فاصلہ ہے۔

چنانچہ ساری کوششوں کے باوجود لاس اینجلز کے ''ایڈز پروجیکٹ کے ڈائریکٹر ڈاکٹر جرمن میسونٹ کا تخمینہ یہ ہے کہ اوسطاً ہر پانچ سیکنڈ بعد ایک امریکی انتہائی خطرناک جنسی عمل میں مصروف ہوتا ہے۔''

امریکن کالج ہیلتھ ایوسی ایشن نے ایک ٹاسک فورس ایڈز کے مقابلے کے لیے بنائی ہے اس کے چیئرمین ڈاکٹر رچرڈ کیلنگ نے تعلیمی جدوجہد کے نتائج سے مایوسی کا اظہار کرتے ہوئے کہا ہے کہ:

> ''تعلیم صحت کے بارے میں ایک یاس انگیز نظریہ یہ ہے کہ جب تک مرنے والوں کی تعداد ہولناک حد تک نہ بڑھ جائے، ایڈز کا مرض اس کے باقی ماندہ افراد کے لیے ذاتی مسئلہ نہیں بنے گا اور وہ سنجیدگی کے ساتھ اپنے طرز عمل میں کوئی بنیادی تبدیلی نہیں لائیں گے۔'' (ص ۷۲ کالم ۱)

یہ تھا ''ٹائم'' کے مذکورہ تین مضامین کے اہم حصوں کا نہایت مختصر خلاصہ۔ اس خلاصے کے بعض حصوں کو نقل کرتے وقت بھی آخر تک قلم جھجکتا ہی رہا اور انہیں اپنے قلم سے لکھنا کافی صبر آزما معلوم ہوا، لیکن اس خیال سے انہیں لکھ دیا کہ امریکی تہذیب کے یہ حقائق، ہماری قوم کے ان لوگوں کے سامنے ضرور آنے چاہئیں جو زندگی کے ہر شعبے میں مغرب کے پیچھے پیچھے چلنے کو اپنے لیے راہ نجات تصور کرتے ہیں۔

مضمون: ۵

نکاح اور برادری

حمد وستائش اس ذات کے لیے جس نے اس کارخانہ عالم کو وجود بخشا اور درود وسلام اس کے آخری پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم پر جنہوں نے دنیا میں حق کا بول بالا کیا۔

شادی بیاہ کے معاملے میں لوگ ابھی تک اپنے خودساختہ خیالات کے بندھن میں کس بری طرح جکڑے ہوئے ہیں اور اس معاملے میں اسلامی تعلیمات سے غفلت اور ناواقفیت کتنی عام ہو چکی ہے؟ اس کا اندازہ مختلف رقعوں سے ہوتا رہتا ہے جو لوگ شرعی حل معلوم کرنے کے لیے بکثرت میرے سامنے لاتے رہتے ہیں۔ ابھی ایک خاتون نے امریکہ سے مجھے ایک طویل خط میں اپنی دردبھری داستان لکھی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ان کے والد ایک کروڑ پتی آدمی ہیں، پڑھے لکھے ہیں، لیکن ان کو یہ اصرار تھا کہ وہ اپنی کسی بیٹی کی شادی اپنی برادری سے باہر نہیں کریں گے۔ خاتون نے لکھا ہے کہ میں ان کی بڑی بیٹی ہوں اور شروع میں مجھ سے شادی کرنے کے لیے کچھ اچھے لوگوں کے رشتے آئے، لیکن میرے والد نے ہر رشتہ کو یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ یہ برادری سے باہر کا رشتہ ہے، اس لیے ان کے لیے قابل قبول نہیں۔ یہاں تک کہ میری عمر زیادہ ہوتی چلی گئی اور بالآخر رشتے آنے بند ہو گئے۔ یہاں تک کہ ایک روز میرے والد نے مجھ سے یہ کہا کہ اب میرے لیے تمہارا کوئی رشتہ اپنی برادری سے حاصل کرنا ممکن نہیں رہا، لہٰذا اب تم میرے سامنے یہ حلف اٹھاؤ کہ عمر بھر شادی نہیں کرو گی۔ میں چونکہ مالدار آدمی ہوں، لہٰذا جیتے جی تمہاری کفالت کروں گا، لیکن مجھے یہ کسی قیمت پر گوارا نہیں ہے کہ تمہاری شادی برادری سے باہر ہو۔ خاتون کہتی ہیں کہ والد صاحب نے مجھے یہ اقرار کرنے پر اتنا مجبور کیا کہ بالآخر میں نے یہ وعدہ کر لیا کہ تمام عمر شادی نہیں کروں گی اور اس کے بعد واقعتاً میں نے یہ تہیہ بھی کر لیا کہ اپنے والد کی خواہش کے احترام میں زندگی اسی طرح گذار دوں گی۔ لیکن میری چھوٹی بہن، ایک بھائی اور والدہ اس فیصلے پر راضی نہیں ہوئے۔

ایک صاحب جنہوں نے عرصۂ دراز پہلے میرے لیے رشتہ مانگا تھا اور والد صاحب نے انہیں سختی سے انکار کر دیا تھا، ابھی تک مجھ سے شادی کرنے پر آمادہ تھے، میرے بھائی بہن نے ان سے بات کی اور والد صاحب کو بھی آمادہ کرنے کی کوشش کی۔ آخر کار والد صاحب نے اتنا تو کہہ دیا کہ اگر تم لوگ یہ نکاح کرنا ہی چاہتے ہو تو میں نکاح کرا دوں گا۔ لیکن ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ اس کے بعد لڑکی کا مجھ سے کوئی تعلق نہیں ہوگا۔ بہن نے مجھ سے والد صاحب کی یہ بات چھپائی، اور صرف اتنا کہا کہ وہ ناراض تو ہیں، مگر نکاح پر آمادہ ہو گئے ہیں۔ چنانچہ یہ نکاح ہو گیا اور میں اپنے شوہر کے ساتھ امریکہ چلی آئی، لیکن اب مجھے پتہ چلا ہے کہ والد صاحب نے عمر بھر کے لیے مجھ سے قطع تعلق کر لیا ہے، نہ وہ مجھ سے فون پر بات کرنے کے لیے تیار ہیں، نہ مجھے اپنی بیٹی تسلیم کرنے پر آمادہ ہیں۔

یہ واقعہ تو انتہائی سنگین نوعیت کا ہے، لیکن یہ بات اکثر دیکھنے سننے میں آتی رہتی ہے کہ لوگ برادری میں نکاح کرنے کے بارے میں طرح طرح کی غلط فہمیوں کا شکار ہیں۔ یہ درست ہے کہ شریعت نے نکاح کے معاملے میں ایک حد تک کفو کی رعایت رکھی ہے، لیکن اس کا مقصد یہ ہے کہ نکاح چونکہ زندگی بھر کا ساتھ ہوتا ہے، اس لیے میاں بیوی اور دونوں خاندانوں کے درمیان طبعی ہم آہنگی ہو، ان کے رہن سہن، ان کے طرز فکر اور ان کے مزاج میں اتنی دوری نہ ہو کہ ایک دوسرے کے ساتھ نباہ کرنے میں مشکل پیش آئے، لیکن اول تو کفو کی اس رعایت کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ اگر کفو میں کوئی رشتہ نہ ملے تو یہ قسم کھالی جائے کہ اب زندگی بھر شادی ہی نہیں ہو سکے گی۔ دوسرے کفو کا مطلب یہ نہیں ہے کہ خاص اپنی برادری ہی میں رشتہ کیا جائے اور برادری کے باہر سے جو بھی رشتے آئیں، انہیں غیر کفو قرار دے دیا جائے۔ اس سلسلہ میں مندرجہ ذیل باتیں اچھی طرح سمجھ لینی چاہئیں جنہیں نظر انداز کرنے سے ہمارے معاشرے میں بڑی غلط فہمیاں پھیلی ہوئی ہیں۔

۱۔ ہر وہ شخص کسی لڑکی کا کفو ہے، جو اپنے خاندانی حسب نسب دینداری اور پیشے کے لحاظ سے لڑکی اور اس کے خاندان کا ہم پلہ ہو۔ یعنی کفو میں ہونے کے لیے اپنی برادری کے ہم پلہ سمجھا جاتا ہو تو وہ بھی لڑکی کا کفو ہے، کفو سے باہر نہیں ہے۔ مثلاً

سید، صدیقی، فاروقی، عثمانی، علوی بلکہ تمام قریشی برادریاں آپس میں ایک دوسرے کے لیے کفو ہیں۔ اسی طرح جو مختلف عجمی برادریاں ہمارے ملک میں پائی جاتی ہیں مثلاً راجپوت، کان وغیرہ وہ بھی اکثر ایک دوسرے کے ہم پلہ سمجھی جاتی ہیں اور ایک دوسرے کے لیے کفو ہیں۔

۱۔ بعض احادیث و روایات میں یہ ترغیب ضرور دی گئی ہے کہ نکاح کفو میں کرنے کی کوشش کی جائے، تاکہ دونوں خاندانوں کے مزاج آپس میں میل کھا سکیں، لیکن یہ سمجھنا غلط ہے کہ کفو سے باہر نکاح کرنا شرعاً بالکل ناجائز ہے، یا یہ کہ کفو سے باہر نکاح شرعاً درست نہیں ہوتا۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر لڑکی اور اس کے اولیاء کفو سے باہر نکاح کرنے پر راضی ہوں تو کفو سے باہر کیا ہوا نکاح بھی شرعاً منعقد ہو جاتا ہے، اور اس میں نہ کوئی گناہ ہے۔ نہ کوئی ناجائز بات۔ لہٰذا اگر کسی لڑکی کا رشتہ کفو میں میسر نہ آ رہا ہو اور کفو سے باہر کوئی مناسب رشتہ مل جائے تو وہاں شادی کر دینے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ کفو میں رشتہ نہ ملنے کی وجہ سے لڑکی کو عمر بھر بغیر شادی کے بٹھائے رکھنا کسی طرح جائز نہیں۔

۲۔ شریعت نے یہ ہدایت ضرور کی ہے کہ لڑکی کا نکاح بغیر ولی کے نہیں کرنا چاہیے۔ (خاص طور سے اگر کفو سے باہر نکاح کرنا ہو تو ایسا نکاح اکثر فقہاء کے نزدیک بغیر ولی کے درست نہیں ہوتا) لیکن ولی کو بھی یہ چاہیے کہ وہ کفو کی شرط پر اتنا زور نہ دے جس کے نتیجے میں لڑکی کی عمر بھی شادی سے محروم ہو جائے اور برادری کی شرط پر اتنا زور دینا تو اور بھی زیادہ بے بنیاد اور لغو حرکت ہے جس کا کوئی جواز نہیں ہے۔

ایک حدیث میں حضور سرور کونین صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

اذا جاء کم من ترون دینہ و خلقہ فزوجوہ الا تفعلوہ تکن فتنۃ فی الارض وفساد کبیر

"جو تمہارے پاس کوئی ایسا شخص رشتہ لے کر آئے جس کی دینداری اور اخلاق تمہیں پسند ہوں تو اس سے (اپنی لڑکی کا) نکاح کر دو۔ اگر تم ایسا نہیں کرو گے تو زمین میں بڑا فتنہ و فساد برپا

ہو گا۔"

۴۔ اسی ضمن میں یہ غلط فہمی بھی بہت سے لوگوں میں عام ہے کہ سید لڑکی کا نکاح غیر سید گھرانے میں نہیں ہو سکتا۔ یہ بات بھی شرعی اعتبار سے درست نہیں ہے۔ ہمارے عرف میں "سید" ان حضرات کو کہتے ہیں جن کا نسب بنی ہاشم سے جا ملتا ہو، چونکہ حضور سرورِ کونین صلی اللہ علیہ وسلم بنی ہاشم سے تعلق رکھتے تھے، اس لیے بلاشبہ اس خاندان سے نسبی وابستگی ایک بہت بڑا اعزاز ہے۔ لیکن شریعت نے ایسی کوئی پابندی نہیں لگائی کہ اس خاندان کی کسی لڑکی کا نکاح باہر نہیں ہو سکتا، بلکہ جیسا میں نے اوپر عرض کیا، نہ صرف شیوخ، بلکہ تمام قریشی نسب کے لوگ بھی شرعی اعتبار سے سادات کے کفو ہیں اور ان کے درمیان نکاح کا رشتہ قائم کرنے میں کوئی شرعی رکاوٹ نہیں ہے، بلکہ قریش سے باہر کے خاندانوں میں بھی باہمی رضامندی کے ساتھ نکاح ہو سکتا ہے۔

مضمون: ٦

گناہ سے نفرت کرو...... گنہگار سے نہیں

الحمدلله نحمده ونستعينه ونستغفره ونومن به ونتوكل عليه، نعوذ بالله من شرور انفسنا ومن سيئات اعمالنا، من يهده الله فلا مضل له ومن يضلله فلاهادى له، واشهد ان لا اله الا الله وحده لا شريك له، واشهد ان سيدنا ونبينا ومولانا محمدا عبده ورسوله صلى الله عليه وسلم وعلى آله واصحابه وبارك وسلم تسليما كثيرا كثيرا، امابعد:

قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: من عير اخاه بذنب قدتاب منه، لم يمت حتى يعمله.

(ترمذی، کتاب صفۃ القیامۃ، باب نمبر ۵۴)

کسی کو گناہ پر عار دلانے کا وبال:

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص اپنے مسلمان بھائی کو ایسے گناہ پر عار دلائے اور اس گناہ کا طعنہ دے جس گناہ سے وہ توبہ کر چکا ہے۔ تو یہ طعنہ دینے والا شخص اس وقت تک نہیں مرے گا۔ جب تک وہ خود اس گناہ کے اندر مبتلا نہیں ہو جائے گا۔ مثلاً ایک شخص کے بارے میں آپ کو پتہ چل گیا کہ یہ فلاں گناہ کے اندر مبتلا تھا یا مبتلا ہوا ہے اور آپ کو یہ بھی پتہ ہے اس نے توبہ بھی کر لی ہے، تو جس گناہ سے وہ توبہ کر چکا ہے، اس گناہ کی وجہ سے اس کو حقیر سمجھنا، یا اسکو عار دلانا، یا اس کو طعنہ دینا کہ تم تو فلاں شخص ہو اور فلاں حرکت کیا کرتے تھے۔ ایسا طعنہ دینا خود گناہ کی بات ہے۔ اس

لیے کہ جب اس شخص نے توبہ کے ذریعہ اللہ تعالیٰ سے اپنا معاملہ صاف کرلیا اور توبہ کرنے سے گناہ صرف معاف ہی نہیں ہوتا بلکہ نامۂ اعمال سے وہ عمل ہی مٹادیا جاتا ہے تو اب اللہ تعالیٰ نے تو اس کا گناہ نامہ اعمال سے مٹادیا۔ لیکن تم اس کو اس گناہ کی وجہ سے حقیر اور ذلیل سمجھ رہے ہو یا اس کو طعنہ دے رہے ہو اور اس کو برا بھلا کہہ رہے ہو۔ یہ عمل اللہ تعالیٰ کو بہت سخت ناگوار ہے۔

گنہگار ایک بیماری کی طرح ہے:

یہ تو اس شخص کے بارے میں جس کے بارے میں آپ کو معلوم ہے کہ اس نے گناہ سے توبہ کرلی ہے۔ لیکن اگر پتہ نہیں ہے کہ اس نے توبہ کی ہے یا نہیں، لیکن ایک مومن کے بارے میں یہ احتمال تو ہے کہ اس نے توبہ کرلی ہوگی، یا آئندہ کرلے گا، اس لیے اگر کسی نے گناہ کرلیا اور آپ کو توبہ کرنے کا بھی علم نہیں ہے، تب بھی اس کو حقیر سمجھنے کا کوئی حق نہیں ہے، کیا پتہ کہ اس نے توبہ کرلی ہو۔ یاد رکھیے، نفرت گناہ سے ہونی چاہیے، گنہگار سے نہیں، نفرت معصیت اور نافرمانی سے ہونی چاہیے، لیکن جس شخص نے معصیت اور نافرمانی کی ہے، اس سے نفرت کرنا حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں سکھایا، بلکہ وہ گنہگار ترس کھانے اور رحم کے قابل ہے کہ وہ بیچارہ ایک بیماری کے اندر مبتلا ہے، جیسے کوئی شخص کسی جسمانی بیماری کے اندر مبتلا ہے، تو اب اس شخص کی بیماری سے تو نفرت ہوگی، لیکن کیا اس بیمار سے نفرت کروگے کہ چونکہ یہ شخص بیمار ہے، اس لیے نفرت کے قابل ہے؟ ظاہر ہے کہ بیمار کی ذات قابل نفرت نہیں ہے، بلکہ اس بیماری سے نفرت کرو، اس کو دور کرنے کی فکر کرو، اس کے لیے دعا کرو، لیکن بیمار نفرت کے لائق نہیں وہ تو ترس کھانے کے لائق ہے کہ یہ بیچارہ اللہ کا بندہ کس مصیبت کے اندر مبتلا ہوگیا۔

کفر قابل نفرت ہے نہ کہ کافر:

حتیٰ کہ اگر کوئی شخص کافر ہے تو اس کے کفر سے نفرت کرو، اس کی ذات سے نفرت مت کرو، بلکہ اس کے حق میں دعا کرو کہ اللہ تعالیٰ اس کو ہدایت عطا فرمائے۔ آمین۔

دیکھیے، حضور اقدس نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو کفار کتنی تکالیف پہنچایا کرتے تھے،

آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر تیر اندازی ہو رہی ہے، پتھر برسائے جا رہے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے جسم کے کئی حصے خون سے لہولہان ہو رہے ہیں۔ اس کے باوجود اس وقت زبان پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم جو کلمات آئے وہ یہ تھے کہ:

اللهم اهد قومي فانهم لا يعلمون.

"اے اللہ، میری قوم کو ہدایت عطا فرما کہ ان کو حقیقت کا پتہ ہی نہیں ہے۔"

یہ دیکھئے کہ ان کی معصیت، کفر، شرک، ظلم اور زیادتی کے باوجود ان سے نفرت کا اظہار نہیں فرمایا بلکہ شفقت کا اظہار فرماتے ہوئے یہ فرمایا کہ یا اللہ یہ ناواقف لوگ ہیں۔ ان کو حقیقت حال کا پتہ نہیں ہے۔

اس لیے میرے ساتھ یہ لوگ ایسا برتاؤ کر رہے ہیں۔ اے اللہ ان کو ہدایت عطا فرما۔

اس لیے جب کسی کو گناہ میں مبتلا دیکھو تو اس پر ترس کھاؤ اور اس کے لیے دعا کرو اور کوشش کرو کہ وہ اس گناہ سے بچ جائے، اس کو تبلیغ و دعوت کرو، لیکن اس کو حقیر نہ جانو، کیا پتہ کہ اللہ تعالیٰ اس کو توبہ کی توفیق دے دیں اور پھر وہ تم سے بھی آگے نکل جائے۔

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا دوسروں کو افضل سمجھنا:

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا یہ ارشاد میں نے اپنے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے بھی سنا اور حضرت ڈاکٹر عبدالحئی صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے بھی سنا ہے،

وہ یہ کہ:

"میں ہر مسلمان کو اپنے آپ سے بالا اور ہر کافر کو اپنے آپ سے احتمالاً افضل سمجھتا ہوں۔" "احتمالاً" کا مطلب یہ ہے کہ اگر چہ وہ اس وقت کفر کے اندر مبتلا ہے، لیکن کیا پتہ کہ اللہ تعالیٰ اس کو توبہ کی توفیق عطا فرما دے اور وہ کفر کی مصیبت سے نکل جائے اور پھر اللہ تعالیٰ اس کے درجات اتنے بلند کرے کہ وہ مجھ سے بھی آگے بڑھ

جائے اور جو شخص مسلمان ہے صاحب ایمان ہے اللہ تعالیٰ نے اس کو ایمان کی دولت عطا فرمائی ہے، کیا پتہ کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ اس کے کیا معاملات ہیں، کیونکہ ہر انسان کے اللہ تعالیٰ کے ساتھ مختلف معاملات ہوتے ہیں۔ کسی کے بارے میں ہم کیا رائے ظاہر کریں کہ وہ ایسا ہے۔ اس لیے میں ہر مسلمان کو اپنے سے افضل سمجھتا ہوں۔''

ظاہر ہے کہ اس میں جھوٹ اور غلط بیانی کا احتمال تو نہیں ہے کہ ویسے ہی مروتاً یہ کہہ دیا کہ ''میں ہر مسلمان کو اپنے سے افضل سمجھتا ہوں۔'' یقیناً ایسا سمجھتے ہوں گے۔ تبھی تو فرمایا۔ بہر حال کسی کو بھی حقیر سمجھنا، چاہے وہ گناہ اور معصیت کی وجہ سے ہو، جائز نہیں۔

یہ مرض کن لوگوں میں پایا جاتا ہے:

یہ حقیر سمجھنے کی بات ان لوگوں میں خاص طور پر پیدا ہو جاتی ہے جو لوگ دین کی طرف پلٹتے ہیں۔ مثلاً شروع میں ان کے حالات دینی اعتبار سے ٹھیک نہیں تھے، بعد میں دین کی طرف آئے اور نماز روزے کے پابند ہو گئے اور وضع قطع اور لباس پوشاک شریعت کے مطابق بنالیا، مسجد میں آنے لگے، نماز باجماعت کے پابند ہو گئے۔ ایسے لوگوں کے دلوں میں شیطان یہ بات ڈالتا ہے کہ تم تو اب سیدھے راستے پر آگئے اور یہ سب مخلوق جو گناہوں میں منہمک ہیں، یہ سب تباہ حال ہیں اور پھر اس کے نتیجے میں یہ لوگ ان کو حقیر اور کم تر سمجھنے لگتے ہیں اور حقارت سے ان کو دیکھتے ہیں اور ان پر دلخراش انداز میں اعتراض کرنے لگتے ہیں۔ پھر اس کے نتیجے میں شیطان ان کو عجب میں، بڑائی میں، تکبر میں اور خود پسندی میں مبتلا کر دیتا ہے اور جب انسان کے اندر اپنی بڑائی اور خود پسندی آجائے تو یہ چیز انسان کے سارے اعمال کو ضائع کرنے والی ہے۔ اس لیے کہ جب انسان کی نظر اس طرف جانے لگے کہ ''میں بڑا نیک ہوں اور دوسرے برے ہیں'' تو بس انسان عجب میں مبتلا ہو گیا۔ عجب کے نتیجے میں اس کے سارے اعمال اکارت ہو گئے۔ اس لیے وہ عمل مقبول ہے جو اخلاص کے ساتھ اللہ کے لیے کیا جائے اور جس

عمل کے بعد انسان اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرے کہ اس نے مجھے اس کی توفیق عطا فرمائی۔ اس لیے کسی کے ساتھ حقارت کا معاملہ نہیں کرنا چاہیے کسی کافر اور فاسق و فاجر کو بھی حقیر نہیں سمجھنا چاہیے۔

کسی کو بیمار دیکھے تو یہ دعا پڑھے:

حدیث شریف میں آتا ہے کہ جب انسان دوسرے کو کسی بیماری کے اندر مبتلا دیکھے تو یہ دعا کرے:

الحمدلله الذی عافانی مما ابتلاک به، وفضلنی علی کثیر ممن خلق تفضیلا.

''اے اللہ آپ کا شکر ہے کہ آپ نے مجھے اس بیماری سے عافیت عطا فرمائی جس بیماری میں یہ مبتلا ہے اور بہت سے لوگوں پر آپ نے مجھے فضیلت عطاء فرمائی۔''

(ترمذی، کتاب الدعوات، باب مایقول اذاری مبتلی)

یعنی بہت سے لوگ بیماریوں میں مبتلا ہیں۔ لیکن آپ نے مجھے صحت عطا فرمائی ہے۔ کسی بیماری کو دیکھ کر یہ دعا پڑھنا سنت ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی تلقین فرمائی۔ ہمارے حضرت ڈاکٹر عبدالحی صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ میں جب بھی کسی ہسپتال کے پاس سے گزرتا ہوں تو الحمد للہ یہ دعا پڑھ لیتا ہوں اور ساتھ میں یہ دعا بھی کرتا ہوں کہ یا اللہ ان بیماروں کو صحت عطا فرما دیجیے۔

کسی کو گناہ میں مبتلا دیکھے تو یہ پڑھے:

ہمارے ایک استاد فرمایا کرتے تھے کہ یہ دعا جو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے بیمار کو دیکھ کر پڑھنے کی تلقین فرمائی ہے میں جب کسی شخص کو کسی گناہ یا معصیت میں مبتلا دیکھتا ہوں تو اس وقت بھی یہی دعا پڑھ لیتا ہوں۔ مثلاً راستے میں گزرتے ہوئے بعض اوقات دیکھتا ہوں کہ لوگ سینما دیکھنے کے لیے یا اس کا ٹکٹ خریدنے کے لیے لائن میں کھڑے ہیں، ان کو دیکھ کر میں یہی دعا پڑھ لیتا ہوں اور اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ

اس نے مجھے اس گناہ سے محفوظ رکھا۔ اس دعا کے پڑھنے کی وجہ یہ ہے کہ جس طرح بیمار ترس کھانے کے قابل ہے، اسی طرح جو شخص گناہ میں مبتلا ہے وہ بھی ترس کھانے کے قابل ہے کہ وہ اس مصیبت میں مبتلا ہے اور اس کے لیے بھی دعا کرنی چاہیے کہ یا اللہ اس کو اس مصیبت سے نکال دیں۔ کیا معلوم کہ آج جو لوگ گناہ کی لائن میں لگے ہوئے ہیں اور آپ ان کو حقیر اور ذلیل سمجھ رہے ہیں، کیا معلوم کہ اللہ تعالیٰ ان کو توبہ کی توفیق دے دیں اور پھر وہ تم سے آگے نکل جائیں۔ اس لیے کس بات پر تم اتراتے ہو؟ لہٰذا جب اللہ تعالیٰ نے تم کو گناہوں سے بچنے کی توفیق دے دی ہے۔ تو اس پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرو، اگر ان کو گناہوں سے بچنے کی توفیق نہیں ہوئی تو تم ان کے حق میں دعا کرو، کہ یا اللہ ان کو ہدایت عطا فرمادے اور ان کو اس بیماری سے نجات عطا فرمادے آمین۔

بہر حال گناہ سے، معصیت اور نافرمانی سے نفرت ہو، لیکن آدمی سے نفرت مت کرو، بلکہ اس کے ساتھ محبت اور شفقت کا معاملہ کرو اور جب اس سے کوئی بات کہنی ہو تو نرمی اور شفقت سے کہو، ہمدردی اور محبت سے کہو، تا کہ اس پر اثر انداز بھی ہو۔ ہمارے سارے بزرگوں کا یہی معمول رہا ہے۔

حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ کا چور کے پاؤں کو چومنا:

میں نے اپنے والد ماجد حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ کا یہ واقعہ سنا کہ حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ کہیں سے گزر رہے تھے، ایک جگہ پر دیکھا کہ ایک آدمی کو سولی پر لٹکایا ہوا ہے اور اس کا ایک ہاتھ کٹا ہوا ہے اور ایک پاؤں کٹا ہوا ہے۔ آپ نے لوگوں سے پوچھا کہ کیا قصہ ہے؟ لوگوں نے یہ بتایا کہ یہ شخص عادی قسم کا چور ہے، جب پہلی مرتبہ پکڑا گیا تو اس کا ہاتھ کاٹ دیا گیا اور جب دوسری مرتبہ پکڑا گیا تو پاؤں کاٹ دیا گیا اور جب تیسری مرتبہ پکڑا گیا تو اب اس کو سولی پر لٹکایا جا رہا ہے۔ حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ آگے بڑھے اور اس کے پاؤں چوم لیے۔ لوگوں نے کہا کہ حضرت یہ اتنا بڑا عادی چور ہے، آپ اس کا پاؤں چوم رہے ہیں۔ آپ نے جواب میں فرمایا کہ اگرچہ اس نے بہت بڑا جرم اور گناہ کا کام کیا، جس کی وجہ سے اس کو سزا دی گئی۔ لیکن اس شخص کے اندر ایک بہترین وصف ہے، وہ ہے

''استقامت'' اگر چہ اس وصف کو اس نے غلط جگہ پر استعمال کیا، اس لیے جس کام کو اس نے اپنا مشغلہ بنایا، اس پر ڈٹا رہا۔ اس کا ہاتھ کاٹ دیا گیا، پھر بھی اس کام کو نہیں چھوڑا، حتیٰ کہ موت کی سزا ہو گئی، لیکن اپنے کام پر لگا رہا، اس سے پتہ چلا کہ اس کے اندر استقامت کا وصف ہے اور اسی وصف کی وجہ سے میں نے اس کے پاؤں چوم لیے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اپنی عبادت اور اطاعت کے اندر یہ وصف عطا فرمادے۔ آمین۔

بہر حال جو اللہ کے نیک بندے ہوتے ہیں، وہ آدمی سے نفرت نہیں کرتے، اس کی برائیوں سے نفرت کرتے ہیں اور وہ فرماتے ہیں کہ اگر کسی برے آدمی کے اندر جو برائیاں ہیں، اس کو دور کرنے کی فکر کرو اور اس کو محبت پیار سے سمجھاؤ اور اسی کو جا کر بتاؤ۔ دوسروں سے اس کی برائیاں بیان کرتے مت پھرو۔

''مومن مومن کے لیے آئینہ ہے'' کا مطلب:

حدیث شریف میں آتا ہے کہ:

المومن مراۃ المومن

''ایک مومن دوسرے مومن کا آئینہ ہے۔''

(ابوداؤد، کتاب الادب، باب فی النصیحۃ)

اگر آدمی کے چہرے پر کوئی داغ دھبہ لگ جائے اور وہ آدمی جا کر آئینہ کے سامنے کھڑا ہو جائے تو وہ آئینہ بتا دیتا ہے کہ تمہارے چہرے پر یہ داغ لگا ہوا ہے، گویا کہ آئینہ انسان کے عیب بیان کر دیتا ہے۔ اسی طرح ایک مومن بھی دوسرے مومن کا آئینہ ہے، یعنی جب ایک مومن دوسرے مومن کے اندر کوئی عیب دیکھے تو اس کو پیار سے محبت سے اس کو بتا دے کہ یہ عیب تمہارے اندر موجود ہے، اس کو دور کر لو۔ جیسے اگر کسی انسان کے جسم پر کوئی کیڑا یا چیونٹا چل رہا ہو، آپ اس کیڑے کو اس کے جسم پر یا کپڑوں پر چلتا ہوا دیکھ رہے ہیں تو محبت کا تقاضہ یہ ہے کہ تم اس کو بتا دو کہ دیکھو بھائی تمہارے جسم پر یہ کیڑا چل رہا ہے، اس کو دور کر لو۔ اسی طرح اگر کسی مسلمان بھائی کے اندر کوئی دینی خرابی ہے تو پیار و محبت سے اس کو بتا دینا چاہیے کہ تمہارے اندر یہ خرابی ہے۔ اس لیے کہ ایک مومن دوسرے مومن کا آئینہ ہے۔

ایک کے عیب دوسروں کو مت بتاؤ:

حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس حدیث سے یہ بات معلوم ہوئی کہ جب تم کسی دوسرے کے اندر کوئی عیب دیکھو، تو صرف اسی کو بتاؤ کہ تمہارے اندر یہ عیب ہے۔ دوسروں سے کہتے مت پھرو کہ فلاں کے اندر یہ عیب ہے۔ اس لیے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے مومن کو آئینہ سے تشبیہ دی ہے اور آئینہ صرف اس شخص کو چہرے کے داغ دھبے بتاتا ہے جو شخص اس کے سامنے کھڑا ہوتا ہے، وہ آئینہ دوسروں کو نہیں بتاتا کہ فلاں شخص کے چہرے پر داغ دھبے لگے ہوئے ہیں۔ لہٰذا ایک مومن کا کام یہ ہے کہ جس کے اندر کوئی برائی یا عیب دیکھے تو صرف اسی سے کہے، دوسروں سے اس کا تذکرہ نہ کرے کہ فلاں کے اندر یہ عیب اور یہ برائی ہے، کیونکہ اگر دوسروں کو اس کے عیوب کے بارے میں بتاؤ گے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کام میں تمہاری نفسانیت شامل ہے۔ پھر وہ دین کا کام نہیں ہوگا اور اگر صرف اسی سے تنہائی میں محبت اور شفقت سے اس کو اس کے عیب پر تنبیہ کر دو گے تو یہ اخوت اور ایمان کا تقاضہ ہے۔ لیکن اس کو حقیر اور ذلیل سمجھنا کسی حال میں بھی جائز نہیں۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو سمجھنے اور اس پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

و آخر دعوانا ان الحمد لله رب العالمین.

مضمون: ۷

امتِ مسلمہ کی معیشت

اور اسلامی خطوط پر اس کا اتحاد

محترم چیئرمین اور معزز مہمانان گرامی:

یہ میرے لیے ایک بڑا اعزاز ہے کہ مجھے ایسی بین الاقوامی کانفرنس میں شرکت کا موقع مل رہا ہے جو موتمر العالم الاسلامی مسلمانوں کی تاریخ کے ایک انتہائی نازک وقت میں منعقد کررہی ہے، نئی صدی کا ظہور پورے عالم میں فکر وعمل کے نئے افق کھول رہا ہے، ہمارے لیے مسلم امہ ہونے کی حیثیت سے اپنے اہم مسائل اور مشکلات پر غور کرنا، ان کے رخ متعین کرنا اور آنے والے وقتوں کے بین الاقوامی مسائل حل کرنے کے لیے اپنی حکمت عملی وضع کرنا ایک لائق تحسین عمل ہے، میں موتمر العالم الاسلامی کا شکر گذار ہوں کہ مجھے ایسا پروقار فورم (Forum) مہیا کیا کہ جس میں ان مسائل پر گفتگو کرسکتا ہوں۔

انیسویں صدی سیاسی استبداد کی صدی تھی، جس میں یورپی طاقتور اقوام نے ایشیائی اور افریقی ممالک بشمول اسلامی ممالک پر اپنا تسلط جمایا ہوا تھا، موجودہ صدی نے جواب اپنے آخری سانس لے رہی ہے مغربی استعمار کی طرف سے آزادی کے تدریجی عمل کا مشاہدہ کیا ہے، اللہ تعالیٰ کے فضل سے یہی وہ صدی تھی، جس میں بہت سے اسلامی ممالک نے یا تو طاقت کے بل بوتے پر یا پرامن طریقوں سے آزادی حاصل کی، تاہم اپنی سیاسی آزادی کے حصول میں واضح کامیابی کے باوجود ہم اب تک علمی، معاشی اور منصوبہ سازی کے میدانوں میں خاطر خواہ کامیابی حاصل نہ کرسکے، یہی وجہ ہے کہ اب تک مسلم امہ سیاسی آزادی کے صحیح ثمرات سے لطف اندوز نہیں ہوسکی ہے۔

اب مسلم دنیا نئی صدی کو اس امید کے ساتھ دیکھ رہی ہے کہ انشاء اللہ یہ ان کے لیے مکمل اور حقیقی آزادی لے کر آئے گی، جس میں مسلمان دنیا کی مختلف اقوام کے

درمیان اپنا کھویا ہوا مقام دوبارہ حاصل کریں اور قرآن کریم اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کی روشنی میں وضع کردہ اصولوں کے مطابق اپنی زندگی گذارنے میں آزاد ہوں۔

تاہم یہ بات بھی واضح ہے کہ یہ امید صرف خوابوں اور خواہشات سے پوری نہیں ہوسکتی، اپنے اس محبوب مقصد کے حصول کے لیے ہمیں اجتماعی زندگی کے تمام میدانوں میں اپنے رویہ کو بدلنا ہوگا اور جس قدر ہم نے سیاسی آزادی کے حصول کے لیے کوششیں کیں اس سے زیادہ ہمیں اپنی مکمل آزادی کے حصول کی کوششیں کرنی ہوں گی، ہمیں اپنے لائحہ عمل اور منصوبوں پر از سر نو غور کرنا ہوگا، ہمیں خوب غور و فکر کے ساتھ مرتب کردہ پلاننگ اور منصوبہ سازی کی ضرورت ہوگی، ہمیں اپنے متعین اور واضح مقاصد کے لئے اجتماعی قوت ارادی انقلابی اقدامات اور ایک پر جوش پروگرام کی ضرورت ہوگی اور اس طرح کے بین الاقوامی سیمناروں سے اگر بھرپور فائدہ اٹھایا جائے تو اس مقصد کی طرف سنجیدہ فکر کو آگے بڑھانے میں مدد مل سکتی ہے۔

جس موضوع کے بارے میں مجھ سے اس عظیم فورم میں چند الفاظ پیش کرنے کے لیے کہا گیا ہے وہ موضوع امت مسلمہ کی معیشت کا اسلامی خطوط پر اتحاد ہے، اس مختصر مضمون میں جو ایک مختصر نوٹس پر تیار کیا گیا ہے اس میں احقر اپنے آپ کو ایسے دو نکات تک محدود رکھے گا جو ہمارے لیے امت مسلمہ ہونے کی حیثیت سے بہت زیادہ اہم ہیں۔

ا۔ خودساختہ انحصار:

یہ بات ہر کس و ناکس جانتا ہے کہ تقریباً تمام مسلم ممالک کا سماجی اور معاشی میدانوں میں دوسروں پر انحصار اس امت کا ایسا معاشی مسئلہ بن چکا ہے کہ جس سے آج تمام مسلم امت دوچار ہے اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ اکثر مسلمان ممالک، مغربی ممالک یا بین الاقوامی (بلکہ حقیقت پسندی سے جائزہ لیا جائے تو مغربی) مالیاتی یا تمویلی اداروں سے بڑی بڑی رقمیں قرض لے رہے ہیں اور بعض ممالک یہ بھاری مقدار میں سودی قرضے کسی ترقیاتی منصوبوں کے بجائے اپنے روزمرہ کے اخراجات کے لیے لے

رہے ہیں بلکہ اس سے بھی زیادہ تشویشناک امر یہ ہے کہ اپنے سابقہ سود کی ادائیگی کے لیے حاصل کر رہے ہیں، جس سے ان کے حاصل کردہ قرضوں کا سائز خطرناک حد تک بڑھ چکا ہے۔

بیرونی قرضوں پر انحصار ہماری ایک ایسی بنیادی بیماری ہے جس کی وجہ سے ہماری اقتصادی زندگی اس درجہ متاثر ہو چکی ہے کہ قومی خود اعتمادی تقریباً مفقود ہوتی جا رہی ہے اور اس نے ہمیں اس بات پر مجبور کر رکھا ہے کہ ہم اپنے قرض دہندوں کے مطالبات کے آگے بلکہ بعض اوقات ایسے مطالبات کے آگے سر تسلیم خم کر دیں جو ہمارے اجتماعی مفادات کے خلاف ہیں، یہ بات بھی کوئی ڈھکی چھپی نہیں کہ قرض دہندہ قرضے دینے سے قبل مقروض پر اپنی شرائط عائد کر دیتے ہیں، یہ شرائط ہمیں مستقل غیر ملکی دباؤ میں رکھتی ہیں، اور اکثر ہمیں اپنے حقیقی مقاصد کے حصول سے روکتی ہیں اور اس بات پر مجبور کرتی ہیں کہ ہم اغیار کے بتائے ہوئے راستوں پر چلیں، خلاصہ یہ کہ غیر ملکی قرضوں کے برے نتائج اتنے واضح ہیں کہ محتاج بیان نہیں ہیں۔

قرضہ لینا اسلامی تعلیمات کی رو سے اس قدر ناپسندیدہ فعل ہے کہ اس میں شدید مجبوری اور سخت ضرورت کے بغیر مبتلا نہیں ہونا چاہیے، جیسا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس عمل سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے شخص کی نماز جنازہ ادا کرنے سے انکار فرما دیا جو اپنا قرض ادا کیے بغیر وفات پا گیا تھا۔

مزید براں مسلمان فقہاء کرام رحمہم اللہ نے یہ سوال اٹھایا ہے کہ آیا کہ مسلمان ملک کے حکمران کے لیے جائز ہے کہ وہ غیر مسلموں کی طرف سے پیش کردہ تحفے قبول کرے؟ اس سوال کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ یہ صرف اس صورت میں جائز ہے جب ان تحفوں کی وجہ سے امت مسلمہ کے مفاد کے خلاف کسی قسم کا دباؤ نہ ہو، یہ جواب تحفے قبول کرنے کے بارے میں دیا گیا ہے، اب آپ اس سے خود ہی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ قرضے لینے کا جواب کیا ہوگا؟

اسلامی اصولوں کے مطابق بیان کردہ یہ ہدایات اس بات کا مطالبہ کر رہی ہیں کہ مسلمانوں کو اپنے سختی اور تنگی کے زمانہ میں بھی غیر ملکی قرضے لینے سے انکار کرنا چاہیے، لیکن ہمارا یہ حال ہے کہ موجودہ قرضے ہمارے وسائل (Resources) کی قلت

کے باعث پیدا نہیں ہوئے ، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ مسلمان بحیثیت مجموعی جتنے آج مالدار ہیں اس سے قبل مسلمانوں کی پوری تاریخ میں اتنے مالدار کبھی نہیں رہے، آج ان کے پاس قدرتی وسائل کے عظیم خزانے موجود ہیں، دنیا کے اہم دفاعی واقتصادی اہمیت کے حامل مقامات ان کے قبضے میں ہیں، وہ دنیا کے بیچوں بیچ واقع ہیں، وہ مراکش سے انڈونیشیا تک ایسی جغرافیائی زنجیر میں جڑے ہوئے ہیں کہ ان کے درمیان سوائے اسرائیل اور ہندوستان کے کوئی ملک حائل نہیں ہے، وہ دنیا کا تقریباً پچاس فیصد تیل پیدا کرتے ہیں، دنیا کی خام مال کی برآمدات میں تقریباً چالیس فیصد حصہ ان کا (مسلمانوں کا) شمار کیا جاتا ہے۔ ان تمام حقائق کے علاوہ مسلمانوں کی وہ تمام نقد رقوم جو مغربی ممالک میں امانت یا سرمایہ کاری کی غرض سے رکھی گئی ہیں اتنی زیادہ ہیں کہ وہ خود اپنے اوپر عائد تمام دیون (Loans) اور واجبات (Payables and dues) کی ادائیگی کے لیے مکمل کافی ہیں۔

اسلامی ترقیاتی بنک کی حالیہ رپورٹ کے مطابق اسلامی ترقیاتی بنک (IDB) کے رکن ممالک کے بیرونی قرضہ جات کا مجموعہ 618.8 بلین ڈالر ہے، جب کہ دوسری طرف مسلمانوں کے مغربی ممالک میں رکھے ہوئے اثاثے اور امانتیں (Deposits) اس سے کہیں زیادہ ہیں۔ یہ بات ظاہر ہے کہ ان اثاثوں اور امانتوں کا کوئی ٹھوس ریکارڈ نہیں ہے، کیونکہ ان کے مالکان متعدد وجوہات کی بناء پر انہیں ظاہر نہیں کرتے ہیں، البتہ معاشی ماہرین کا خیال ہے کہ خلیج کی جنگ (Gulf War) کے بعد عرب مسلمانوں نے اپنے 250 بلین ڈالر نکال کر اپنے ممالک میں جمع کرائے تھے، ان کے علاوہ مسلمانوں کے مغربی ممالک میں جمع شدہ اثاثوں اور امانتوں کا تخمینہ تقریباً 800 سے لے کر 1000 بلین ڈالرز کے درمیان ہے۔ اس بات کا عملاً مطلب یہ ہے کہ ہم اپنی ہی جمع کردہ رقم کا ایک حصہ خود ہی زیادہ سودی قیمت پر قرض لے رہے ہیں۔

اور اگر بالفرض ان تخمینی اعداد وشمار کو مبالغہ آمیز سمجھا جائے تب بھی اس حقیقت سے شاید ہی کوئی منکر ہو سکتا ہے کہ اتنی بڑی رقموں کو اگر اپنے پاس ہی رکھ کر صحیح طریقے سے مسلمان دنیا پر استعمال کیا جاتا تو امت مسلمہ کبھی چھ سو بلین یا اس سے زائد قرضے لینے پر مجبور نہ ہوتی۔

اس زاویہ سے اگر جائزہ لیا جائے تو یہ واضح ہوتا ہے کہ غیر ملکی قرضوں پر انحصار درحقیقت ہمارا خود ساختہ ہی ہے، جس کے بارے میں ہم کسی دوسرے پر الزام نہیں لگا سکتے، ہم نے کبھی بھی ان عوامل کو دور نہیں کیا جو ہمارے سرمائے کی باہر منتقلی کے ذمہ دار ہیں۔ ہم نے اپنے لوگوں میں اعتماد پیدا کرنے کی کوشش نہیں کی، ہم نے اپنے آپ کو موجودہ ظالمانہ اور بدعنوان (Corrupt) نظام محصولات سے چھٹکارا نہیں دیا، ہم کبھی سرمایہ کاری کے لیے ایک پرامن فضاء قائم کرنے کے قابل نہیں ہوئے، ہم نے کبھی اپنے ممالک کو ایک مضبوط سیاسی نظام عطا نہ کیا، ہم نے کبھی بھی اپنے مجموعی سرمایہ سے بہترین طریقوں سے استفادہ کرنے کے مواقع پر غور کرنے کی ضرورت نہ سمجھی، مزید براں مجموعی طور پر ہم اسلامی اتحاد کے جذبات کو سرگرم اور امت مسلمہ کی طاقت کو متحرک کرنے میں ناکام رہے۔

یہ افسوسناک صورت حال نئی صدی کی خوشی میں مہنگی تقاریب منعقد کر لینے سے ٹھیک نہیں ہو سکتی، ہمیں سنجیدگی کے ساتھ وقت کے چیلنج کو قبول کرنا ہوگا، جیسا کہ پہلے بھی ذکر کیا گیا ہے ہمارے معاشی اور سیاسی قائدین کو غیر ملکی انحصار سے نجات دلانے کے لیے ایسے ذرائع اور طریقے تلاش کرنے ہوں گے جو ہمارے پاس پہلے ہی سے دستیاب ہیں، جس چیز کی ہمیں سب سے زیادہ ضرورت ہے وہ یہ ہے کہ ہم مسلم امہ کے باہمی تعاون کو فروغ دینے کے لیے نئی پالیسیاں وضع کریں، قرآن کریم ارشاد فرماتا ہے:

”انما المومنون اخوۃ فاصلحوا بین اخویکم واتقوا اللہ لعلکم ترحمون“

”تمام مسلمان بھائی بھائی ہیں، تم اپنے دو بھائیوں کے درمیاں صلح کرواؤ اور اللہ تعالیٰ سے ڈرو، تاکہ تم پر رحم کیا جائے۔“

قرآن وسنت کی تعلیمات اور احکام اس اصول کی تاکید کرتے ہیں کہ تمام مسلم امہ کو یک جان ہو کر کام کرنا چاہیے، جغرافیائی حدود صرف کسی ملک کے انتظامی و داخلی امور نمٹانے کے لیے برداشت کی جا سکتی ہیں، لیکن تمام مسلم ممالک کو خصوصاً ان کے اپنے مشترک مقاصد کے لیے بقیہ دنیا کے مقابلے میں یک جان اور یک رخ ہو کر رہنا چاہیے۔

اب وہ دن چلے گئے جب تکنیکی مہارت پر صرف چند مغربی ممالک کی اجارہ داری تھی، اب مسلمانوں کی مہارت و قابلیت (Talent) کم از کم مسلمانوں کی فوری ضروریات کو حل کرنے کی صلاحیت رکھتی ہیں، اب ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم اس امت کی خدمت کے لیے مذہبی جذبہ کے اس قابلیت کو تلاش کریں، لیکن یہ مقصد ہمارے ممالک کے قائدین اور زعماء کی متحدہ کوششوں کا طلب گار ہے۔ یہی ان کا سب سے بڑا چیلنج ہے، جس کا مقابلہ ان کے لیے نہ صرف امت کی بھلائی کی خاطر بلکہ خود اپنی بقاء اور حیات کے لیے ضروری ہے، اس بارے میں ایک عظیم ذمہ داری آرگنائزیشن آف اسلام کانفرنس (OIC) کے کاندھوں پر ہے، کہ اسے خود آگے بڑھ کر مسلمان قابلیت کا ایک متحدہ تالاب (Pool) بنانا چاہیے۔

۲۔ اپنے معاشی نظام کی تعمیر نو:

دوسرا اہم نکتہ جس کی طرف احقر حاضرین مجلس کی توجہ مبذول کرانا چاہتا ہے، وہ ہمارے نظام کو اسلامی خطوط پر استوار کرنا ہے۔

بیسویں صدی سوشلزم کا ظہور، سرمایہ دار اور سوشلسٹ ممالک کے درمیان محاذ آرائی اور آخر میں سوشلزم کے سقوط کا مظاہرہ دیکھ چکی ہے، مغربی سرمایہ دار ممالک سوشلزم کے سقوط کی اس طرح خوشیاں منا رہے ہیں گویا یہ ان کی صرف سیاسی بلکہ ان کے فکر و نظر کی فتح کا حقیقی ثبوت ہے، اسی طرح وہ کمیونسٹ تصورات کے سقوط کی بھی سرمایہ داری نظریہ کی حقانیت کا بین ثبوت قرار دے رہے ہیں اور یہ دعویٰ کیا جا رہا ہے کہ سرمایہ دارانہ نظام ہی اب انسانیت کے لیے ایسا واحد نظام ہے جسے اپنائے بغیر کوئی چارہ نہیں۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ سوشلزم یا کمیونزم سرمایہ دارانہ نظام معیشت کے ظالمانہ اصولوں اور خصوصاً دولت کی غیر مساوی تقسیم کے ردعمل کے طور پر ابھرا تھا جو گذشتہ کئی صدیوں سے سرمایہ دار ممالک میں نظر آ رہی تھی۔ سوشلزم ان برائیوں کی نشاندھی کرنے اور معاشرے پر ان کے برے اثرات کی تنقید کرنے میں حق بجانب تھا۔ سوشلزم کی ناکامی کی وجہ سرمایہ دارانہ نظام پر صحیح تنقید نہ تھی، ہرگز یہ مطلب نہیں ہے کہ سرمایہ دارانہ

نظام اپنے اندر کوئی خرابی نہیں رکھتا تھا، بلکہ وہ خرابیاں ابھی تک موجود ہیں اور ان کی اصلاح بھی نہیں کی گئی ہے، جو ممالک سرمایہ دارانہ نظام کی اتباع کر رہے ہیں وہ ابھی تک دولت کی غیر مساوی تقسیم میں مبتلا ہیں، مالداروں اور غیر مالداروں کے درمیان عظیم فرق اور دولت کے عین درمیان غربت (Poverty in the midst plenty) ان کے نظام معیشت میں ایک بہت بڑا مسئلہ ہے، یہی سرمایہ دارانہ نظام کے حقیقی مسائل ہیں، جنہیں اگر صحیح طرح حل نہیں کیا گیا تو یہ ایک اور ردعمل کو جنم لے سکتے ہیں، جو سوشلزم سے کہیں زیادہ سخت اور ظالم ہوگا، سوویت یونین کے سقوط اور ٹکڑے ٹکڑے ہونے کو ابھی زیادہ عرصہ نہیں گذرا تھا کہ بعض وسط ایشیائی ریاستیں دوبارہ کمیونزم کی طرف رخ کر رہی ہیں، یہ حقیقت اس پارلیمانی انتخابات کے نتائج سے اچھی طرح محسوس کی جاسکتی ہے، جس میں کمیونسٹ پارٹیوں نے اپنی اپنی پارلیمنٹ میں بھاری اکثریت سے سیٹیں حاصل کی ہیں، یہ اس وجہ سے نہیں ہے کہ کمیونزم یا سوشلزم کے پاس واقعتاً کوئی فضیلت یا اچھائی موجود ہے بلکہ یہ سرمایہ دارانہ نظام کے تسلط کے برے نتائج اور غیر مساویانہ تقسیم دولت کا دوبارہ ردعمل ہے۔

اسی لیے اب دنیا ایک ایسے تیسرے نظام کی شدید محتاج ہے، جو اسے ان دونوں نظامہائے معیشت کی ان خرابیوں سے نجات دلائے، جن سے انسانیت گذشتہ چند صدیوں سے دوچار رہی ہے، اس تیسرے نظام کے لیے مسلم امہ کی طرف سے اسلامی خطوط پر کام کیا جاسکتا ہے، وہ معاشی اصول جو قرآن پاک اور احادیث نبویہ علیہا الصلوٰۃ والسلام سے ماخوذ ہیں، آج کی دنیا کے تمام معاشی مسائل کو حل کرنے میں مکمل کافی و شافی ہیں، کیونکہ اسلام جہاں ذاتی ملکیت اور بازاری معیشت کی اجازت دیتا ہے، وہاں وہ ایک منصفانہ تقسیم دولت کا ایک سوچا سمجھا نظریہ بھی پیش کرتا ہے، جو معاشی زندگی کی ناہمواریوں سے نجات بھی دلاتا ہے اور ایک ایسا نظام پیدا کرتا ہے جس میں ذاتی منافع کا محرک (Motive of personal profit) معاشرے کے مجموعی مفاد کے ساتھ شیر و شکر ہو کر چلتا ہے، سوشلزم کی ایک بنیادی خرابی یہ تھی کہ سرمایہ دارانہ نظام کی ناہمواریوں اور غیر مساویانہ تقسیم سے مایوس لوگوں نے ذاتی ملکیت کے حقیقی تصور اور بازاری قوتوں پر حملہ کر کے ایک ایسے معاشی نظام کا مفروضہ پیش کیا جو بالکل غیر حقیقی،

مصنوعی اور جابرانہ تھا، ذاتی ملکیت کی آزادی کے انکار نے پیداواری جذبہ کو نہ صرف ختم کر دیا بلکہ وسیع ریاستی طاقت نے عوام کی قسمت حکمران طبقہ کے ہاتھوں میں دے دی۔

تجربات سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ نہ ذاتی ملکیت سرمایہ دارانہ نظام کی بے اعتدالیوں اور ناہمواریوں کی بنیادی وجہ تھی نہ بازار کی قوتیں بلکہ سرمایہ دار ممالک میں معاشی ناہمواریوں اور بے اعتدالیوں کی بنیادی وجہ ذاتی منافع کا بے لگام استعمال اور جائز اور ناجائز کمائی کے درمیان امتیاز کرنے والے معیار کا فقدان تھا، جس نے تمام دولت کو چند مالدار لوگوں تک محدود کر دیا، سود قمار جوئے اور غیر اخلاقی خواہشات کی تکمیل جیسے طریقوں کے ذریعہ زیادہ سے زیادہ نفع کمانے کی سرمایہ دارانہ نظام میں اجازت دی گئی، جس نے مارکیٹ میں اجارہ داری (Monopoly) کا رجحان پیدا کر دیا، جس کے نتیجہ میں طلب اور رسد کی طاقتیں یا تو بالکل مفلوج ہو کر رہ گئیں یا ان کے عمل کو اپنے بھر پور اثر سے روک دیا۔ ستم ظریفی یہ ہے کہ سرمایہ داری نظریہ ایک طرف تو طلب اور رسد کو سرگرم رکھنے کے لیے اصول عدم مداخلت (Laisez fair) کا اعلان کرتا ہے تو دوسری طرف مندرجہ بالا غلط ذرائع کاروبار کی اجازت دے کر ان کے قدرتی عمل میں مداخلت کرتا ہے، سرمایہ دار ایسی اجارہ داریاں (Monopolies) پیدا کر کے اپنے جابرانہ فیصلے عوام الناس کی کثرت پر مسلط کر دیتے ہیں، جس کی وجہ سے بازاری طاقتوں کو ان کا حقیقی کردار ادا کرنے سے روک دیا جاتا ہے۔ سود کا مستقل رجحان یہ ہے کہ وہ مالدار صنعت کاروں کے مفاد کے لیے کام کرے کیونکہ یہ صنعت کار ہی اس دولت سے فائدہ اٹھاتے ہیں جو غریب عوام بنکوں میں اپنی بچتوں کی صورت میں جمع کراتے ہیں اور جب انہیں عظیم فائدہ ہوتا ہے تو وہ عوام الناس کو اس میں شریک کرنے کے بجائے ایک متعین شرح سے سود دیتے ہیں اور پھر اس سود کو بھی وہ دوبارہ اپنی پیداوار کے اخراجات کی مد میں قیمتوں میں اضافہ کر کے واپس وصول کر لیتے ہیں، مجموعی سطح پر اس کا مطلب یہ ہوا کہ یہ مالدار لوگ کھاتہ داروں (Depositors) کو کچھ ادا نہیں کرتے، کیونکہ وہ سود جو وہ مالیاتی اداروں کو ادا کرتے ہیں، وہ صارفین جیسے عوام الناس سے ان کی پیداواری قیمت میں اضافہ کر کے واپس لے لیتے ہیں، اسی طرح جوا ہزاروں لوگوں کی دولت، چند ہاتھوں میں مرتکز کرنے کا ایک بہت بڑا ذریعہ اور کمائے

بغیر دولت کے حصول کی لالچ اور طمع کو بڑھانے کا ایک تباہ کن محرک ہے، سٹہ کے معاملات بھی فطری بازاری عمل کو ڈسٹرب کرنے اور دولت کی غیر مساویانہ تقسیم میں اہم کردار ادا کرتے ہیں، خلاصہ یہ کہ حلال اور اور حرام کا امتیاز نہ رکھنے والا نظام معاشرے پر پڑنے والے برے اثرات سے لاپرواہ ہو کر ہر قسم کی تجارتی سرگرمیوں کے لیے کھلا ہوا ہے۔

اسلام نہ صرف بازاری طاقتوں کو قبول کرتا ہے، بلکہ ان کو ایک ایسی میکانیت (Mechamism) مہیا کرتا ہے، جس کی وجہ سے وہ اجارہ داریوں کی رکاوٹوں کے بغیر اپنی قدرتی طاقت کے ساتھ عمل جاری رکھتے ہیں، صحت مند پیداوار اور مساویانہ تقسیم کی فضا برقرار رکھنے کے لیے اسلام معاشی سرگرمیوں پر دو قسم کے کنٹرول عائد کرتا ہے۔

پہلی قسم کے کنٹرول سے اسلام نے تجارت اور کمائی کے عمل کو کچھ ایسے مخصوص اور پر وقار طریقۂ کار کے ساتھ متعین کر دیا ہے جو بالکل وضاحت کے ساتھ حلال اور حرام کے درمیان امتیاز کرتے ہیں، یہ طریقے اجارہ داریوں کو روکنے اور غلط اور غیر اخلاقی کمائی اور معاشرے کے اجتماعی مفادات کے خلاف تجارتی سرگرمیوں کو ختم کرنے کا سبب بنتے ہیں، جدید اقتصادی ضروریات کے سیاق میں جہاں عام لوگوں کی بچتیں ترقی کو بڑھانے میں اہم کردار ادا کرتی ہیں، اسلامی طریقہائے تمویل مثلاً سود کے بجائے مشارکہ اور مضاربہ کا استعمال عوام کو ترقی کے پھل میں بلا واسطہ شریک اور حصہ دار بناتے ہیں، جس کی وجہ سے معاشرے میں ایک متوازن طریقے سے خوشحالی آتی ہے اور امیر و غریب کے درمیان فرق کم سے کم ہو جاتا ہے۔

دوسرے قسم کا کنٹرول زکوٰۃ صدقات اور کچھ دوسرے مالیاتی ذمہ داریاں عائد کرنے کے ذریعہ عمل میں لایا گیا اور اس کا مطلب یہ ہے کہ حلال آمدنی بھی دوبارہ ایسے لوگوں کو تقسیم کی جائے جو تجارت کے بھرپور مواقع میسر نہ آنے کی وجہ سے اپنی ضروریات کے لیے نہیں کما سکے، خلاصہ یہ کہ دولت کو مستقل گردش اور پھیلاؤ میں رکھنے کے لیے اور دولت کو محدود و مرکوز کرنے کے مواقع ختم کرنے کے لیے غلط اور ناجائز آمدنی کے راستے مسدود کر دیئے گئے اور زکوٰۃ، صدقات اور وراثت کے ضابطے وضع کیے گئے۔

چونکہ موجودہ صدی میں دنیا سوشلزم کا زوال اور سقوط بھی دیکھ چکی ہے اور سرمایہ دارانہ نظام کی ناہمواریوں اور بے اعتدالیوں کے زخم بھی ابھی تک مندمل نہیں کر پائی ہے۔ لہٰذا اب مسلمانوں کے لیے یہ بہترین موقع ہے کہ دنیا کو قرآن وسنت سے مستنبط اصول واحکام کی طرف دعوت دے، جو دو انتہاؤں کے درمیان ایک پر امن اعتدال فراہم کرتے ہیں، لیکن ہمارے لیے ایک پریشان کن مسئلہ یہ بھی ہے کہ اسلامی نظام کے اصول ابھی تک صرف نظریاتی ہیں، جو ابھی تک عملی شکل میں ہمارے سامنے نافذ نہیں، یہاں تک کہ مسلمان ممالک نے بھی ابھی تک اپنی معیشت کو اسلامی خطوط پر ڈھالنے کی سعی نہیں کی ہے، ان میں سے اکثر اب تک سرمایہ دارانہ نظام کی اتباع کر رہے ہیں اور وہ بھی ایسے ناپختہ اور ادھورے طریقوں پر جن کی وجہ سے ان کی اقتصادی حالت ترقی یافتہ ممالک کے مقابلے میں خراب تر ہوتی جارہی ہے اور بدقسمتی سے واضح اسلامی اصولوں کی موجودگی کے باوجود مسلمان ممالک میں معاشی ناہمواری اور عدم مساوات مغربی ممالک کی بہ نسبت بہت زیادہ ہے۔

یہ افسوسناک صورت حال ہمیشہ جاری نہیں رہ سکتی، اگر ہم اپنے راستوں اور طریقہ کار کی اصلاح کی طرف توجہ نہیں دیں گے تو انقلاب اور رد عمل کی جانب فطری عمل اپنے راستے ڈھونڈنے پر مجبور ہو جائے گا، اگر ہم ایسے انقلاب کے تباہ کن اثرات سے بچنا چاہتے ہیں تو ہمیں اپنے معاشی نظام کو قرآن وسنت سے مستنبط اور ماخوذ واضح معاشی نظام پر از سر نو استوار کرنا پڑے گا، اگر ہم اسلامی اصولوں کے مطابق کوئی نظام نافذ کرنے کے قابل ہو گئے تو نئی صدی کی آمد کے موقع پر یہ ہماری طرف سے انسانی برادری کے لیے ایک بہترین اور عظیم تحفہ ہوگا، مجھے امید ہے کہ اگر ہم اسلامی معیشت کے اصولوں کو اخلاص کے ساتھ ٹھیک نافذ کر دیں تو آج ہم بقیہ دنیا کو بھی پہلے کی بہ نسبت اسے قبول کرنے پر زیادہ آمادہ پائیں گے۔

جسٹس محمد تقی عثمانی

۲۳ ستمبر ۱۹۹۷ء۔

مضمون: ۸

دینی مدارس کی قدر ومنزلت

الحمدلله نحمده ونستعينه ونستغفره ونؤمن به ونتوكل عليه ونعوذ بالله من شرور انفسنا ومن سيئات اعمالنا من يهده الله فلامضل له ومن يضلله فلا هادی له واشهد ان لا اله الا الله وحده لاشریک له واشهد ان محمدا عبده و رسوله صلى الله عليه وسلم فاعوذ بالله من الشيطن الرجيم. بسم الله الرحمن الرحيم
فلولا نفر من كل فرقة منهم طائفة ليتفقهوافی الدين ولينذروا قومهم اذا رجعوا اليهم لعلهم يحذرون.

بزرگان محترم اور برادران عزیز! الحمدللہ آج اس نوزائیدہ مدرسہ میں حاضر ہوکر دل میں مسرت کا احساس ہو رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے دین کی نشرواشاعت کا ایک اور ذریعہ پیدا فرما دیا یہ مدارس جن سے اللہ تعالیٰ نے ہمیں درساً یا تدریساً وابستہ فرمایا ہوا ہے ایسی نعمت ہیں کہ اس پر جتنا بھی شکرادا کیا جائے حق شکر ادا نہ ہوگا یہ مدارس بظاہر اپنی شکل وصورت کے اعتبار سے بے رونق بے آب ورنگ اور افلاس زدہ نظر آتے ہیں۔ لیکن ان کے قیام سے جو مقصد ہے وہ زیبائش اور ظاہری ٹیپ ٹاپ سے بے نیاز ہے اور بہت عالی ہے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن وحدیث کی تعلیم کا آغاز ایک ایسے چبوترے سے کیا تھا جس کے اوپر چھت بھی نہیں تھی مطبخ تو بڑی بات ہے لوگ کھجور کے توشے ایک جگہ آویزا کردیا کرتے تھے صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین حسب ضرورت چند کھجوریں کھا کر باقی دوسروں کے لیے چھوڑ دیا کرتے تھے۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ بعض اوقات شدت بھوک کی وجہ سے بے ہوش ہوکر گر جایا کرتے تھے

وہ فرماتے ہیں کہ لوگ سمجھا کرتے تھے کہ مرگی کا دورہ پڑ گیا جس کی وجہ سے لوگ میری گردن پر پاؤں رکھ کر گزرا کرتے تھے (بطور علاج) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ خود ارشاد فرماتے ہیں کہ خدا کی قسم یہ مرگی نہیں بلکہ سخت بھوک کی وجہ سے بے ہوشی طاری ہوا کرتی تھی۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے یہ عظیم قربانیاں دے کر دین ہم تک پہنچایا۔ یہی حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہ انہیں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طویل صحبت میسر نہیں آئی ۷ھ میں غزوہ خیبر کے موقع پر مشرف با اسلام ہوئے اور ۱۱ھ میں آفتاب نبوت غروب ہو گیا حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس مختصر ترین مدت میں بہت زیادہ کسب فیض کیا بلکہ کثرت روایات کے اعتبار سے تمام صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین سے نمایاں نظر آتے ہیں۔ رویات ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی تعداد ۵۳۶۴ ہے جو سب سے زیادہ ہے۔ آج یہ سادہ سے مدارس جو نظر آ رہے ہیں اگرچہ بے رنگ ہوں بیٹھنے کے لیے بورے بھی میسر نہ ہوں۔ لیکن ان میں بیٹھ کر علوم قرآن و حدیث حاصل کرنے سے حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کی ساتھ جو ایک نسبت قائم ہو جاتی ہے یہ اتنی بڑی نعمت اور انعام خداوندی ہے کہ جس کا حق شکر ادا نہیں ہو سکتا۔

دین ہم تک کیسے پہنچا؟:

دین ہم تک اس طرح پہنچا ہے کہ ہر کسی نے باادب ہو کر زانوئے تلمذ طے کر کے ان اساتذہ سے سیکھا جن کی سند رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تک متصل ہے ایک کتاب کا آپ خود مطالعہ کر لیجیے ایک کتاب کسی کامل استاد سے پڑھ لیجیے جس کا سلسلہ سند حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ملتا ہو دونوں میں زمین و آسمان کا فرق ہوگا۔ آج کل اسٹڈی (مطالعہ) کرنے کا رواج اور وبا پھیلی ہوئی ہے مطالعہ کرنے کا بڑا شوق ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ اجتہادات کا ایک بازار گرم ہے تو یاد رکھئے اگر علم کا حاصل ہونا ضروری مطالعہ کے ذریعہ بغیر کسی استاد کے ممکن ہوتا تو آسمانی کتابوں کے ساتھ کسی رسول کو بھیجنے کی حاجت نہ تھی اللہ تعالیٰ کے لیے کوئی مشکل نہ تھا کہ کسی رات ہر مسلمان کے سرہانے قرآن پاک کا ایک ایک نسخہ عمدہ اور خوبصورت جلد میں مجلد رکھ دیا جاتا اور غیب سے یہ آواز لگا دی

جاتی کہ اسے پڑھو اور اس پر عمل کرو۔ لیکن ایسا نہیں ہوا بلکہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کے ساتھ شارح قرآن حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو بھیجا اور فرمایا **"یعلمهم الکتاب"** تا کہ وہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کتاب کی ان کو تعلیم دیں ایسے ہی ہر کتاب کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے ایک ایک پیغمبر بھیجے ہیں۔ ایسا تو ہوا ہے کہ انبیاء علیہم السلام تشریف لائے مگر کتاب نہیں تھی لیکن ایسا کبھی نہیں ہوا کہ کتاب بغیر صاحب کے نازل ہوئی ہو۔ وجہ یہ ہے کہ کتاب بغیر معلم و مربی تو گمراہ ہو جاتا۔ اس کی مثال تو ایسے ہے کہ ایک آدمی علم طب پر لکھی ہوئی کتب کا خود مطالعہ کر کے مطلب کھول کر بیٹھ جائے تو سوائے اس کے کہ وہ قبرستان آباد کر لے۔ انسانیت کی کوئی خدمت انجام نہیں دے سکتا۔ کسی ڈاکٹر سے یہ علم حاصل کرنا پڑے گا اس کے سامنے زانوئے تلمذ طے کرنے پڑیں گے وگرنہ حکومت بھی اس کی اجازت نہیں دے گی کوئی شخص خود مطالعہ کر کے انجینئر بن بیٹھے حتیٰ کہ کھانا پکانے کا طریقہ کسی کتاب میں پڑھ کر کھانا نہیں پکایا جا سکتا اگر کوئی شخص صرف مطالعہ کر کے کھانا پکانا شروع کر دے تو نا معلوم کیا ملغوبہ تیار کر لے گا۔ ڈاکٹر بننے کے لیے کسی ڈاکٹر کے پاس رہ کر علاج سیکھنے کی ضرورت ہے۔ انجینئر بننے کے لیے کسی انجینئر کے پاس رہ کر یہ علم سیکھا جائے گا کھانا پکانے میں مہارت حاصل کرنے کے لیے کسی باورچی سے اس کا طریقہ سیکھا جائے گا۔

یہی معاملہ دین کا بھی ہے کہ اسے سیکھنے کے لیے کسی کامل مربی و معلم کے پاس رہنا ہوگا وگرنہ گمراہی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوگا ان مدارس کی قدر پہچانیئے! ان کی بدولت اللہ تعالیٰ کا کلمہ بلند ہے اور دین اپنی اصلی شکل میں محفوظ ہے۔ ان ممالک میں جا کر دیکھئے جہاں یہ مدارس ختم کر دیئے گئے یا ان کا بیج مار دیا گیا۔ وہاں بے دینی کا سیلاب اُمڈ رہا ہے اور کوئی بند باندھنے والا نہیں۔ بقول ہمارے حضرت علی میاں مدظلہ العالی کے **ردة ولا ابابکر لها** کہ ارتداد کا بازار گرم ہے لیکن کوئی ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نہیں۔

اللہ تعالیٰ نے مجھے دنیا کے بیشتر اسلامی ممالک میں جانے اور وہاں کے اہل علم اور دینی حلقوں سے ملاقات کا موقع عطا فرمایا پہلے تو تقلیداً یہ بات سمجھتا تھا کہ یہ دینی مدارس جن کا تعلق حضرات علماء دیوبند سے ہے ہمارے لیے بہت بڑی نعمت ہیں لیکن ان ممالک میں حالات دیکھنے کے بعد تحقیقاً یہ سمجھتا ہوں کہ دین کی حفاظت و تحفظ کا ذریعہ

اللہ تعالیٰ نے ان دینی مدارس کو بنایا ہوا ہے۔ خواہ بظاہر یہ کتنے ہی سادہ کیوں نہ ہوں معاشرے پر ان کی برکات واثرات الحمدللہ آج بھی نمایاں ہیں۔ جہاں یہ مدارس نہیں ہیں وہاں بے عملی و بے راہ روی کی عجیب وغریب شکلیں اور مناظر دیکھنے میں آئے یہ مناظر بھی دیکھئے گئے کہ منہ میں سگریٹ گلے میں ٹائی کلین شیو اور انگریزی لباس زیب تن کیے ہوئے ایک آدمی بخاری شریف پڑھا رہا ہے یہ مناظر بھی دیکھئے گئے کہ درس بخاری کا ہو رہا ہے لیکن نماز پڑھنے کا سوال ہی نہیں۔ یہ منظر بھی دیکھا گیا کہ مرد وزن باہم مخلوط بیٹھے ہیں اور اسلامی تعلیمات کا درس ہو رہا ہے۔ کیا کیا بتاؤں یہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ آپ نے سنا ہوگا مصر میں ایک بہت بڑی یونیورسٹی جامعۃ الازہر کے نام سے معروف ہے واقعتاً اس میں بڑے بڑے اساطین علماء پیدا ہوئے ایک زمانہ تھا کہ وہاں بڑے بڑے فضلاء تھے لیکن آج کل اس کا حال یہ ہے کہ مجھ جیسا آدمی وہاں جا کر دیکھے تو رونا آجاتا ہے وہاں اتباع سنت کا تصور تک نہیں ہے بلکہ ستم بالائے ستم یہ کہ یہ پہچاننا مشکل ہو جاتا ہے کہ یہ آدمی مسلمان بھی ہے یا نہیں حالانکہ وہ عالم ہے حالانکہ ان کی تنقیص مقصود نہیں ہے بلکہ حقیقت حال عرض کر رہا ہوں تاکہ ان مدارس کی قدر و قیمت معلوم ہو، آج سے چند سال قبل مجھے عراق جانا ہوا آج تو وہاں ایک طوفان برپا ہے وہاں میں نے بعض دوستوں سے کہا کہ اگر کوئی پرانی طرز کا عالم ہو تو اس کی زیارت کو جی چاہتا ہے یہ تقاضا اس لیے پیدا ہوا کہ وہاں ایسے علماء وصلحاء کا بیج مار دیا گیا ہے تو کسی نے بتایا کہ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کے مزار کے قریب ایک مدرسہ میں پرانی طرز کے بزرگ ہیں آپ ان سے ملاقات کیجیے وہاں پہنچا، جا کر دیکھا تو واقعی ایک بزرگ جن کی چال ڈھال میں انداز گفتگو میں نشست و برخاست میں اسلاف کی جھلک نظر آئی انہوں نے مجھ سے پوچھا آپ پاکستان میں کیا کرتے ہیں؟ میں نے کہا کراچی میں ہمارا ایک دارالعلوم ہے اس میں پڑھنے پڑھانے کا کچھ سلسلہ ہے انہوں نے پوچھا وہ کون سی یونیورسٹی سے متعلق ہے میں نے کہا ہمارے ہاں یہ سلسلہ نہیں ہے بلکہ عوامی قسم کے مدارس ہیں انہوں نے حیران ہو کر پوچھا کیا تمہارے ہاں عوامی قسم کے مدارس ہیں؟ پھر خود ہی فرمایا ہم تو اس قسم کے تصور کو بھی بھول گئے آپ پر تو اللہ تعالیٰ کی یہ بہت بڑی نعمت ہے پھر پوچھا وہاں کیا پڑھاتے ہو؟ میں نے مدارس میں

پڑھائی جانے والی چند کتب کا نام لیا مثلاً شرح جامی اور سلم وغیرہ جب شیخ نے ان کتب کا نام سنا تو ان کی چیخ نکل گئی پھر فرمایا میں تمہیں نصیحت کرتا ہوں کہ جب تک تمہارے دم میں دم ہے اس طریق کار اور نصاب تعلیم کو نہ چھوڑنا کیونکہ ہمارے ہاں عراق میں جب اس نصاب کی کتب زیر تعلیم تھیں تو فضا کچھ اور تھی اور جب سے یونیورسٹیوں کا نظام رائج ہوگیا اور دینی کتب چھوڑ دی گئیں اس وقت سے فضا بالکل تبدیل ہوگئی پھر فرمایا کسی زمانہ میں ہم بھی یہ کتابیں پڑھاتے تھے اس وقت علماء متبع سنت اور دینی جذبہ رکھنے والے پیدا ہوتے تھے بعد میں تمام مدراس سرکاری تحویل میں لے لیے گئے جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اس وقت سے سرکاری مولوی پیدا ہونے لگے ان ممالک میں گھومنے پھرنے کے بعد یہ احساس مزید پختہ اور قوی ہوگیا کہ یہ مدارس جن کا سلسلہ ماضی قریب میں حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ، حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ سے جڑا ہوا ہے اور پھر بالآخر سند متصل کے ساتھ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے جا ملتا ہے ایسی نعمتیں اور احسان ہے کہ جس پر حق شکر ادا نہیں ہوسکتا۔ ایک مرتبہ شیخ الحدیث حضرت مولانا زکریا (قدس سرہ) دارالعلوم کراچی تشریف لائے (یہ اللہ کے بندے اخلاص کے پیکر عند اللہ اتنے مقبول و منظور تھے کہ ان کی تصنیف شدہ کتب فضائل اعمال ۲۴ گھنٹوں میں سے کوئی لمحہ بھی ایسا نہیں ہے جس میں دنیا کے کسی نہ کسی حصہ میں پڑھی نہ جاتی ہوں) ہم نے عرض کیا کہ حضرت کوئی نصیحت فرما دیجیے۔ تقریر کرنے کا تو معمول نہ تھا صرف ایک جملہ ارشاد فرمایا۔

طالب علمو! ''اپنی حقیقت پہچانو! اپنی قدر پہچانو'' اشارہ اس بات کی طرف تھا کہ بعض اوقات تمہارے دلوں میں یہ خیال پیدا ہوجاتا ہے کہ ہم تو یوں ہی بوریوں پر بیٹھنے والے ہیں دنیا کہاں سے کہاں پہنچ گئی لیکن اللہ تعالیٰ نے جو نعمت عظمیٰ تمہیں عطا کی ہے اس کا مقابلہ دنیا اور اس کی دولت نہیں کرسکتی وہ نعمت ہے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نسبت، یہ جو ہم پڑھتے ہیں حدثنا فلاں حدثنا عن فلاں عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس سند متصل کے ساتھ اپنے آپ کو جوڑ دینا آج تو شاید اس کی قدر و منزلت ہمیں معلوم نہ ہو لیکن جب آنکھیں بند ہوں گی اور اللہ تعالیٰ کے ہاں حاضری ہوگی اس وقت پتہ چلے گا کہ اس سلسلہ کے ساتھ وابستگی کتنی بڑی نعمت ہے۔

میرے شیخ حضرت عارفی رحمۃ اللہ علیہ مثال دیا کرتے تھے کہ کراچی سے صدر مملکت کی ایک ٹرین جا رہی ہے جس میں بہترین سیلون لگا ہوا ہے عمدہ اور عالیشان ڈبے لگے ہوئے ہیں اس کے ساتھ کھانے پینے کا بہترین انتظام موجود ہے. بہت ہی پر کیف خوشبوئیں اٹھ رہی ہیں روانگی کے وقت اسٹیشن ماسٹر نے ایک پرانا اور بوسیدہ ڈبہ بھی اس ٹرین کے ساتھ جوڑ دیا یہ بھی ٹرین کے ساتھ منزل مقصود تک پہنچ جائے گا ایسے ہی ہم بوسیدہ اور خستہ حالت میں سہی لیکن ہمارا کنڈا اعلیٰ اور عمدہ ڈبوں پر مشتمل ٹرین کے ساتھ جڑا ہوا ہے، ہمارا تعلق سند متصل کے ساتھ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ قائم ہو چکا ہے اس نسبت اور تعلق کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی بے پایاں رحمتیں ہم پر نازل ہوں گی اس لیے ہمیں چاہیے کہ اس سلسلہ کی قدر پہچانیں۔

پڑھنے پڑھانے والوں کے علاوہ دوسرے لوگ بھی اپنے آپ کو محروم نہ سمجھیں وہ ان پڑھنے پڑھانے والوں کے ساتھ محبت کریں **المرء مع من احب** ۔اگر کسی کی محبت اس سلسلہ والوں کے ساتھ ہوگی تو ان کا حشر بھی انہی کے ساتھ ہوگا۔خود بھی تعاون کریں دوسروں کو بھی توجہ دلائیں تو اس سلسلہ کے ساتھ وابستگی ہو جائے گی۔خدا کے لیے ان دینی مدارس کی قدر پہچاننے کی کوشش کریں۔

بس اس مختصر وقت میں یہی بات آپ سے عرض کرنی تھی اللہ تعالیٰ ہمیں ان دینی علوم کی قدر و منزلت پہچاننے اور ان پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔آمین۔

واخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین۔

مضمون: ۹

حصول علم اور دعوت الی اللہ

نحمدہ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم

اس وقت باقاعدہ کوئی طویل بیان کرنا پیش نظر نہیں ہے۔ آپ حضرات کے امتحان کا زمانہ ہے اور یوں تو طالب علموں کا ہر وقت اور ہر لمحہ قیمتی ہے لیکن امتحان کا زمانہ خاص طور پر اس کا ایک ایک منٹ بڑی نعمت ہے جس کو غنیمت سمجھ کر استعمال کرنا چاہیے۔ اس لیے کوئی طویل بیان کرنا نہیں ہے۔ بلکہ ایک وقتی ضرورت کے تحت چند مختصر باتیں عرض کرنی ہیں۔ یوں سمجھ لیجیے کہ عشاء کے بعد ہمارے یہاں تبلیغ کے سلسلہ کی جو تعلیم ہوا کرتی ہے یہ اسی کا ایک حصہ ہے۔ اس لیے تھوڑے سے وقت میں چند باتیں عرض کر کے اس کی طرف توجہ دلانا چاہتا ہوں۔

اللہ تعالیٰ کا بڑا فضل و کرم ہے کہ اس نے ہمیں آپ کو پڑھنے پڑھانے کے مشغلہ سے وابستہ فرمادیا۔

خیر کم من تعلم القرآن وعلمہ ط

اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے اس کا صحیح مصداق بننے کی توفیق نصیب فرمائے، یہ بڑی نعمت ہے اس پر جتنا اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا جائے یہ کم ہے۔ لیکن خوب سمجھ لیجیے کہ علم کا پڑھنا اور پڑھانا بذات خود مقصود نہیں۔ اس سب جدو جہد کاوش اور کوشش کا کچھ اور مقصد ہے۔ کیونکہ محض حروف اور نقوش کا جان لینا، کسی زبان کے واقف ہو جانا اور محض کسی بات کو درجہ علم میں حاصل کر لینا یہ بذات خود کوئی فضیلت کی بات نہیں جب تک کہ یہ چیز کسی بلند مقصد کے لیے نہ ہو۔

ہمارے والد ماجد قدس اللہ سرہ، فرمایا کرتے تھے کہ:۔

''اگر علم بذات خود مقصود اور معیار فضیلت ہوتا تو شیطان اور ابلیس سے زیادہ کوئی بھی شخص افضل نہ ہوتا۔ کیونکہ اللہ نے اسے علم بہت

دیا ہے۔ اتنا علم دیا کہ امام رازی جیسے زبردست عالم کو جاتے جاتے شکست دے گیا۔"

اس واسطے علم تنہا جان لینے کے معنی میں کوئی معیار فضیلت نہیں جب تک کہ اس کا کوئی اعلیٰ مقصد نہ ہو۔ تو ہمیں بار بار اپنی زندگی کے صبح و شام کے ہر مرحلہ میں اس کا جائزہ لیتے رہنا چاہیے کہ ہم کیوں پڑھ رہے ہیں؟ کیا اس کا مقصد ہے؟ اور وہ مقصد کس درجہ میں ہمیں حاصل ہوا؟ اور کس درجہ میں حاصل نہیں ہوا؟ جب آدمی کسی سفر پر روانہ ہوتا ہے۔ مثلاً فرض کرو یہاں سے لاہور جاتا ہے، ریل میں بیٹھتا ہے اور راستہ میں دیکھتا ہوا جاتا ہے کہ اب کون سا اسٹیشن آگیا، اب کون سا اسٹیشن آگیا اور اب کون سا اسٹیشن آگیا۔ یہ جاننے کے لیے کہ میں ٹھیک جا رہا ہوں کہ نہیں۔ منزل مقصود کی طرف بڑھ رہا ہوں کہ نہیں بڑھ رہا اور جو اسٹیشن لاہور جانے والے ہیں راستے میں ہیں آ رہے ہیں یا نہیں آ رہے۔ اگر گاڑی میں بیٹھ گیا لاہور جانے کے لیے اور اسٹیشن کوئٹہ جانے والے آ رہے ہیں تو معلوم ہوا کہ گاڑی صحیح انتخاب نہیں کی۔ راستہ صحیح طے نہیں ہو رہا تو ہم سب کو بار بار اپنا جائزہ لیتے رہنا چاہیے کہ مقصد کیا ہے اور وہ حاصل ہو رہا ہے کہ نہیں۔

یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ اس سارے پڑھنے پڑھانے کا مقصد یہ ہے کہ جو علم حاصل ہو رہا ہے انسان خود اس پر عمل کرے۔ اپنی اصلاح کرے۔ پھر دوسرا مقصد یہ ہے کہ اس علم سے ان لوگوں کو فیض پہنچائے جو اس سے محروم ہیں اور آپ نے جو دین کا پیغام پڑھا ہے وہ اپنی حد تک محدود رکھنے کے بجائے دوسرے انسانوں تک پہنچائیں۔ پھیلائیں اور اسے دعوت کے ذریعہ سے عام کریں۔ یہ ہے سارا پڑھنے پڑھانے کا مقصد۔ اگر ان دو کاموں کی طرف توجہ ہے، دھیان ہے، فکر ہے تو ماشاءاللہ یہ پڑھنا پڑھانا بڑا مبارک ہے اور اگر ان دو مقصدوں کی طرف توجہ نہیں، پڑھا جا رہا ہے، پڑھ رہا ہے، صبح سے شام تک لگا ہوا ہے۔ مطالعہ میں، تکرار میں، درس میں تدریس میں اور جو مقصد ہے وہ نگاہ سے اوجھل ہے۔ پتہ نہیں کہ کیا ہو رہا ہے۔ بس ایک پہیہ ہے جو صبح سے شام تک چل رہا ہے۔ اگر یہی بات ہے تو پھر خطرے کی بات ہے۔ پھر یہ علم کا ہمارا پڑھنا پڑھانا سود مند نہیں۔ فائدہ مند نہیں ہے۔ تو پہلے جائزہ اس بات کا لینا چاہیے کہ جو کچھ پڑھا ہے اس پر کچھ عمل بھی ہو رہا ہے کہ نہیں ہو رہا۔ عمل میں کچھ ترقی ہو رہی ہے کہ نہیں،

اصلاح ہورہی ہے کہ نہیں ہورہی اور دوسرے اس بات کا جائزہ لینا چاہیے کہ جب ہمارا مقصد خود اپنی اصلاح بھی ہے اور دوسرں تک دین پہنچانا بھی ہے تو اس دین کے پہنچانے کے لیے بھی کوئی تیاری ہورہی ہے کہ نہیں ہورہی۔ تو پہلا کام خود اپنا جائزہ لو اور اس کا ایک آسان طریقہ ہے جس کے اوپر اپنے آپ کو جانچ کر دیکھتے رہو۔ وہ آسان طریقہ یہ ہے کہ بچپن سے یعنی جب سے درجہ اولیٰ پڑھنا شروع کیا تو نورالایضاح پڑھی مثلاً نور الایضاح کے بعد قدوری پڑھی، قدوری کے بعد کنز پڑھی، کنز کے بعد شرح وقایہ پڑھی، شرح وقایہ کے بعد ہدایہ پڑھی، اولین پڑھی، اخرین پڑھی خدا جانے کیا کچھ پڑھا۔ پھر مشکوٰۃ پڑھی، پھر بخاری پڑھی۔ سب میں کتاب الصلوٰۃ کتاب الصلوٰۃ آرہی ہے کہ نہیں آرہی؟ تو ذرا یہ دیکھو کہ آٹھ سال تک کتاب الصلوٰۃ پڑھتے چلے گئے۔ کنز میں پڑھی، قدوری میں پڑھی، کہاں کہاں پڑھتے رہے۔ تو آیا اس نماز میں جو پہلے پڑھتے تھے یعنی یہاں آنے سے پہلے اس میں کچھ فرق واقع ہوا ہے یا نہیں۔ یا ویسے ہی پڑھ رہے ہیں جیسے پہلے پڑھتے تھے۔

نورالایضاح کو دیکھو اس میں کتنی سنتیں لکھی ہوئی ہیں کچھ یاد ہے (مکرر فرمایا) باون سنتیں ہیں یا نہیں۔ اچھا وہ باون سنتیں نورالایضاح میں پڑھیں تو کیا کبھی اس نقطۂ نظر سے بھی اپنی نماز کا جائزہ لے کر دیکھا کہ نورالایضاح میں جو باون سنتیں لکھی ہوئی ہیں وہ ہماری نماز کے اندر بھی آگئی ہیں یا نہیں، کبھی جائزہ لیا؟ اگر لیا تو اس کے معنی یہ ہیں کہ یہ پڑھ رہے ہیں عمل کے لیے۔ اگر نہیں لیا تو اس کے یہ معنی ہیں کہ بے مقصد پڑھ رہے ہیں۔

کیا وجہ ہے کہ نورالایضاح سے لے کر بخاری تک کتاب الصلوٰۃ پڑھتے چلے گئے اور نماز درست نہ ہوئی اگر مقصد سامنے ہوتا اور مقصد کی اہمیت ہوتی تو یہ صورت حال پیدا نہ ہوتی۔ یہ میں نے ایک مثال دی ہے اس کا جائزہ لے کر دیکھو۔ پھر جہاں صلوٰۃ ہے وہاں زکوٰۃ بھی ہے۔ بیوی بھی ہے، معاملات بھی ہیں، اخلاق بھی ہیں اور معاشرت بھی ہے وغیرہ وغیرہ۔ جتنا پڑھتے چلے آرہے ہو اس کا جائزہ لے کر دیکھو کہ کچھ تبدیلی ہوئی کہ نہیں ایسا معلوم ہوا کہ **"جاء حماراً صغیراً ورجع حماراً کبیراً"** جیسا تھا ویسا ہی ہو کر رہ گیا اور عمر کے سوا اور کسی چیز میں اضافہ نہ ہوا ایسا تو نہیں! اس کا جائزہ لو۔ تو

بھائی یہیں رہتے ہوئے اس تعلیم و تعلم کے طالب علمی کے دوران مشق کرنی ہے، تربیت کرنی ہے اپنے اعمال کی، اخلاق کی اصلاح کی۔ ورنہ اگر یہاں نہیں کی تو باہر جا کر بڑا مشکل ہو جاتا ہے۔

من کان فی هذه اعمٰی فهو فی الآخرة اعمٰی.

اللہ بچائے!! تو اس واسطے یہیں پر رہ کر تربیت کرنی ہے، یہیں پر رہ کر اصلاح کرنی ہے۔

اور یاد رکھو کہ اصلاح اور تربیت کا سب سے بہترین طریقہ جو بزرگوں کا بھی مجرب اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے لے کر آج تک متواتر چلا آ رہا ہے، وہ طریقہ ہے صحبت کا، یعنی صحیح صحبت اور درست ماحول کا، آدمی کی صحبت ایسے آدمیوں کے ساتھ ہو جنہیں سنتوں کا اہتمام ہے۔ جنہیں اتباع سنت کی فکر ہے، جو قدم قدم پر اس فکر میں ہیں کہ کسی طرح نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بتائے ہوئے طریقہ کے مطابق زندگی ہو جائے، ان کے ساتھ اٹھنا، ان کے ساتھ بیٹھنا، ان کے ساتھ دوستیاں، ان کے ساتھ تعلقات، ان کے ساتھ چلنا اور ان کے ساتھ پھرنا تو یہ چیز رفتہ رفتہ اپنے اندر منتقل ہوتی ہے صحبت کے طفیل اور دوسرے اس بات کی تربیت بھی یہیں پر حاصل کرنا ضروری ہے کہ یہ پیغام دعوت جب دوسرے کے پاس لے کر جائیں تو کس طرح لے کر جائیں، کیا اس کا طریقہ ہو اور کیا اس کا سلیقہ ہو؟ یہ کام اگر یہاں نہ آیا تو باہر نکل کر جاؤ گے تو کچھ کام نہیں کر سکو گے۔ اس لیے یہاں پر تربیت حاصل کرنا ضروری ہے۔

ان دونوں کاموں کے لیے ماشاء اللہ بہترین راستہ ہے اللہ کے فضل و کرم سے جماعتوں میں نکلنے کا۔ اللہ تعالیٰ حضرت مولانا محمد الیاس صاحب قدس اللہ سرہٗ کے درجات بلند فرمائے اور کروٹ کروٹ جنت عطا فرمائے۔ اللہ تبارک و تعالیٰ نے پتہ نہیں ان کے سینے میں کیا آگ بھر رکھی تھی دین کی فکر کی کہ آج اس آگ کے شعلے ساری دنیا میں بھڑک رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے دنیا کا کوئی کونہ ایسا نہیں جہاں پر اس کا فیض جاری نہ ہو۔ تو اس میں نکلنے کے معنی خاص طور سے طالبعلموں کے لیے اور عوام کے لیے بھی اس کا پہلا مقصد اپنی اصلاح ہے اور اپنے اعمال کی درستگی ہے۔ یہ مت سمجھو کہ دوسروں کی اصلاح کرنے جا رہے ہیں بلکہ یہ سمجھو کہ اس راستہ میں ہم اس لیے نکل

رہے ہیں تا کہ ہمارے اندر اعمال صالحہ اور فضائل اعمال کی رغبت اور شوق اور اس کا جذبہ اور اتباع سنت کی فکر پیدا ہو جائے۔ اکیلے رہتے ہوئے یا ایسے پڑھنے پڑھانے کے دوران کوئی ایسا وقت نہیں ملتا کہ جس میں سارا رجحان اسی طرف ہو کہ ہم یہ کام سنت کے مطابق کر رہے ہیں یا نہیں کر رہے۔ جب جماعت میں اللہ کے کچھ نیک بندوں کے ساتھ اس غرض سے نکلتے ہیں تا کہ یہ چیزیں ہماری زندگی میں عملاً آجائیں تو اس کے نتیجہ میں ایک ماحول بنتا ہے۔

ایک صحبت صحیح ہوتی ہے اور...... انسان کے اندر خود ایک جذبہ پیدا ہوتا ہے کہ میں درست ہو جاؤں۔

یہ تو پڑھ لیا کہ فلاں چیز سنت، فلاں چیز سنت لیکن اس پر عمل کا شوق، داعیہ اور فکر ان لوگوں کے ساتھ اور ان لوگوں کی صحبت میں بیٹھنے سے پیدا ہوتی ہے جو صرف اسی فکر میں نکلتے ہیں تو اس سے یہ باتیں خود اپنی زندگی میں آتی ہیں اور شروع میں جو میں نے کہا تھا کہ اصلاح اعمال کے لیے صحبت کا اچھا ہونا ضروری ہے تو اس کے لیے بھی یہ بہترین راستہ ہے اور دوسری طرف آج ہی یہ بات بھی ضروری ہے کہ یہ معلوم ہو کہ عوام کے ساتھ رابطہ کس طرح پیدا کیا جاتا ہے اور عوام سے دین کی بات کس طرح کہی جاتی ہے۔ کیا اس کا سلیقہ ہوتا ہے اور کیا اس کا طریقہ ہوتا ہے تو یہ تربیت حاصل کرنا بھی ضروری ہے کیونکہ علم اپنی جگہ لیکن مسلمانوں تک دین کی بات، دین کی دعوت پہنچانا یہ ایک مستقل کام ہے۔ ابھی تربیت تو ہے نہیں تم جا کے حاصل محصول کی بحث تو نہیں سنا سکتے عوام کے سامنے، یا ایسی زبان میں گفتگو شروع کر دو جو کسی کے پلے ہی نہ پڑے کہ کیا کہہ رہے ہو۔ تو عوام کے ساتھ رابطہ اور ان کے ساتھ بات کرنے کا سلیقہ ان تک دین پہنچانے کا طریقہ یہ سیکھنا ضروری ہے اور اس کے ساتھ جب اللہ تعالیٰ توفیق عطاء فرمادے کوئی کلمہ زبان سے نکل گیا، دل سے نکل گیا اور کسی اللہ کے بندے کے کان میں پڑ گیا، اس کے دل میں بیٹھ گیا۔ عمل کی توفیق ہوگئی تو تمہاری ساری عمر کے لیے صدقہ جاریہ ہے۔ تو اتنے بڑے فوائد کا یہ کام ہے۔ اپنی اصلاح کا بہترین راستہ، دعوت کا سلیقہ، طریقہ سیکھنے کا بہترین راستہ اور فی نفسہ دعوت کے ذریعہ اپنے اعمال کو صدقہ جاریہ بنانے کا بہترین راستہ۔ تو اللہ تعالیٰ اگر توفیق عطاء فرمادے اس میں حصہ

لینے کی تو یہ عظیم فوائد حاصل ہوتے ہیں۔

جیسے میں نے عرض کیا کہ آج اس امتحان کی رات میں لمبی چوڑی تقریر نہیں کرنی، لیکن یہ عرض کرنا ہے کہ اس طرف توجہ ہو۔ اس کو ایسا نہ سمجھو کہ جیسے بعض لوگ پرو پیگنڈے کرتے ہیں کہ یہ تو ایسا ہی کام ہے اور اس کی معاذ اللہ ناقدری کرتے ہیں یا اس کی توہین کر.تے ہیں۔ تو خوب سمجھ لو کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کے راستہ میں جو بھی قدم اٹھتا ہے، جو بھی زبان اٹھتی ہے وہ اللہ تعالیٰ کے ہاں نہ صرف یہ کہ اس کے لیے اجر عظیم ہے۔ بلکہ دنیا کے اندر بھی آدمی اس کے فوائد وثمرات محسوس کرتا ہے اور دیکھتا ہے۔ اس واسطے اس کام میں توجہ کے ساتھ طلباء کو حصہ لینے کی ضرورت ہے۔ تاکہ یہیں اس طالب علمی کے زمانہ میں خود بھی اپنی اصلاح ہو اور دعوت کا طریقہ بھی آئے تو اس کے لیے الحمدللہ یہاں مدرسہ میں جماعتوں میں جانے کا ایک نظم قائم ہے اور طلباء خاص طور پر چھٹیوں کے ایام میں اس کام کے لیے وقت لگاتے ہیں تو اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے بڑا نفع اس سے ہو رہا ہے۔ تو اب بھی امتحان ختم ہو رہا ہے اور امتحان ختم ہونے کے بعد چند روز کی چھٹیاں ہوں گی۔ ان چھٹیوں کو چاہو تو سو کے گزار دو اور چاہو تو لغویات میں صرف کر دو اور چاہو تو اللہ تبارک وتعالیٰ کے راستہ میں یہ چند دن لگا کر یہ عظیم فوائد حاصل کر لو جن کا میں نے ابھی ذکر کیا۔ تو یاد رکھو کہ انسان کی زندگی کا ایک ایک لمحہ بڑا قیمتی ہے۔ لوٹ کر آنے والا نہیں ہے۔ اس لیے اپنے اوقات کو کسی بے مقصد کام میں خرچ کرنے کے بجائے اس کام میں خرچ کرو جو دنیا و آخرت میں ذخیرہ بننے والا ہے۔

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی قدس اللہ سرہ کا ایک ارشاد سنا کر بات ختم کرتا ہوں۔ حضرت حکیم الامت مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ جب بستر پر بیمار تھے اور بیماری بھی وہ جس میں وفات پائی۔ بستر پر لیٹے ہوئے ہیں۔ ڈاکٹروں نے ہلنے سے منع کیا ہوا ہے، ہر کام کرنے سے منع کیا ہوا ہے اس حالت میں لیٹے لیٹے آنکھیں بند کی ہوئی ہیں، آواز دی کہ مولوی شفیع صاحب کہاں ہیں بلاؤ (یعنی میرے والد صاحب) تو وہ آ گئے کہا کہ۔

"بھائی آپ معارف القرآن تالیف کر رہے ہو تو معارف القرآن کے اندر فلاں مسئلہ ہے اور فلاں آیت سے یہ مسئلہ مستنبط

ہوتا ہے یہ مسئلہ بھی اس مسئلہ میں لکھ دینا'' تو کسی نے کہا کہ ''حضرت یہ کیا آپ نے اپنی جان کے ساتھ ظلم کر رکھا ہے کہ ڈاکٹروں نے ملاقات سے منع کر رکھا ہے، بات کرنے سے منع کر رکھا ہے اور اس وقت آپ بلا بلا کر یہ باتیں کر رہے ہیں'' تو سبحان اللہ اس پر ارشاد فرمایا۔ وہ جملہ سنانے کا ہے ارشاد فرمایا کہ ''میاں وہ لمحات زندگی کس کام کے جو کسی دوسرے کی خدمت میں صرف نہ ہو۔''

تو ان لمحات زندگی کو غنیمت سمجھ کر کہ یہ لوٹ کر آنے والے نہیں ہیں۔ ان کو فضولیات میں لگانے کی بجائے، کھیل کود میں لگانے کے بجائے ان کو ایسے کام میں لگاؤ جو خدمت کا کام ہو، جو دعوت کا کام ہو اور جو اپنی اصلاح کا کام ہو تو اس بات کو مدنظر رکھتے ہوئے طلباء سے گزارش ہے کہ وہ ان اوقات فرصت میں چھٹی کے اوقات میں زیادہ سے زیادہ تعداد میں اس سہ روزہ جماعت میں حصہ لیں اور بڑھ چڑھ کر حصہ لیں۔

مضمون: ۱۰

علماء دیوبند کا دینی رخ اور مسلکی مزاج

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ وکفی وسلام علیٰ عبادہ الذی اصطفی.

پیش لفظ:

از:۔ شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم، استاد الحدیث و نائب صدر دارالعلوم کراچی۔ (جج شریعت اپیلیٹ بنچ سپریم کورٹ پاکستان)

علمائے دیوبند کے مسلک کی تشریح وتوضیح کے لیے اصلاً کسی الگ کتاب کی تالیف کی چنداں ضرورت نہیں تھی۔ اس لیے کہ ''علماء دیوبند'' کوئی ایسا فرقہ یا جماعت نہیں ہیں جس نے جمہور امت سے ہٹ کر فکر وعمل کی کوئی الگ راہ نکالی ہو۔ بلکہ اسلام کی تشریح و تعبیر کے لیے چودہ سو سال میں جمہور علماء امت کا جو مسلک رہا ہے وہی علمائے دیوبند کا مسلک ہے۔ دین اور اس کی تعلیمات کا بنیادی سرچشمہ قرآن وسنت ہیں اور قرآن و سنت کی تمام تعلیمات اپنی جامع شکل وصورت میں فیض دارالعلوم دیوبند کو قرار دے کر اس سے اپنے آپ کو منسوب کرتے ہیں اور ان کے فضلاء کو بھی عرف عام میں علمائے دیو بند'' ہی کہا جاتا ہے۔

اب ظاہر ہے کہ ان درسگاہوں سے لاکھوں کی تعداد میں فارغ التحصیل ہونے والوں میں سے ہر ہر فرد کے بارے میں یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ ''مسلک علماء دیوبند'' کا صحیح ترجمان ہے۔ کوئی بھی باقاعدہ درس گاہ جو کسی خاص نصاب نظام یا نظم وضبط کی پابند ہو۔ وہ اپنے زیر تعلیم افراد کی خدمت اسی حد تک انجام دے سکتی ہے اور ان کی نگرانی اسی حد تک کر سکتی ہے جس حد تک اس کی لگے بندھے قواعد وضوابط اجازت دیں، لیکن وہ

ایک ایک طالب علم کے بارے میں اس بات کی مکمل نگرانی نہیں کرسکتی کہ تنہائی میں اس کے دل و دماغ میں کیا خیالات پرورش پارہے ہیں؟ اور وہ کن خطوط پر آگے بڑھنے کی سوچ رہا ہے؟ بالخصوص درس گاہ سے ضابطے کا تعلق ختم ہونے کے بعد تو اس قسم کی نگرانی کا کوئی امکان ہی نہیں رہتا۔

چنانچہ ان درس گاہوں سے کچھ ایسے حضرات بھی نکل کر میدان عمل میں آئے ہیں جو تعلیمی حیثیت سے بلاشبہ دارالعلوم دیوبند کی طرف منسوب ہیں، لیکن انہیں اکابر علماء دیو بند کا مسلک و مشرب یا ان کا وہ متوارث مزاج و مذاق جو صرف کتابوں سے حاصل نہیں ہوتا۔ ٹھیک ٹھیک حاصل کرنے کا موقع نہیں ملا، اس لحاظ سے وہ مسلک علماء دیو بند کے ترجمان نہیں تھے لیکن تعلیمی طور پر دارالعلوم دیوبند یا اس کی فیض یافتہ کسی اور درس گاہ سے منسوب ہونے کی بناء پر بعض لوگوں نے انہیں مسلک علماء دیو بند کا ترجمان سمجھ لیا اور ان کی ہر بات کو بھی علمائے دیو بند کی طرف منسوب کرنا شروع کر دیا۔

ان میں سے بعض حضرات ایسے بھی تھے جو علمائے دیو بند کے بعض عقائد و افکار کی نہ صرف تردید مخالفت کرتے رہے، بلکہ ان کو گمراہی تک قرار دیا اور اس کے باوجود اپنے آپ کو مسلک علماء دیو بند کا ترجمان بھی کہتے رہے۔ بعض حضرات نے اپنے ذاتی افکار کو علمائے دیو بند کی طرف منسوب کرنا شروع کر دیا۔ بعض نے مسلک علماء دیو بند کے جامع اور معتدل ڈھانچے سے صرف کسی ایک جزء کو لے کر بس اسی جزء کو ''دیو بندیت'' کے نام سے متعارف کرایا اور اس کے دوسرے پہلوؤں کو نظر انداز کر دیا۔

مثلاً بعض حضرات نے یہ دیکھ کر کہ حضرات اکابر علمائے دیو بند نے ضرورت کے وقت ہر باطل نظریے کی مدلل تردید کر کے اپنا فریضہ ادا فرمایا ہے بس اسی تردید کو علمائے دیو بند کا مسلک قرار دے لیا اور اپنے عمل سے تاثر یہ دیا کہ ''مسلک علمائے دیو بند'' صرف ایک منفی تحریک کا نام ہے جس کے نصب العین میں دین کے مثبت پہلو کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتے۔ پھر باطل نظریات کی تردید میں بھی مختلف حضرات نے مختلف میدان عمل طے کر لیے جو تقسیم کار کی حد تک تو درست ہو سکتے تھے لیکن بعض حضرات نے ان میں مبالغہ کر کے مسلک علماء دیو بند کے صرف اپنے میدان عمل کی حد تک محدود ہونے کا تاثر دیا۔ بعض حضرات نے باطل کی تردید کے اصول کو تو اختیار کر لیا۔ لیکن تردید کے

طریقے میں اکابر علمائے دیو بند نے جن اصولوں کی پیروی فرمائی تھی، ان کی طرف کما حقہ التفات نہیں کیا اور بعض حضرات کے طرز عمل سے کچھ ایسا تاثر قائم ہوا کہ مسلک علمائے دیو بند بھی (خدانخواستہ) انہی دھڑے بندیوں کا ایک حصہ ہے جو دنیا میں پھیلی نظر آتی ہیں اور جن کا مسلک یہ ہے کہ اپنے دھڑے کے آدمی کی ہر خطا بھی معاف اور قابل دفاع ہے اور باہر کے آدمی کی ہر نیکی بھی دریا برد کرنے کے لائق ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ "مسلک علماء دیو بند" ان تمام بے اعتدالیوں سے بری ہے اور یہ ایسے حضرات کی طرف سے منظر عام پر آئی ہیں جو ضابطے کی تعلیم کے لحاظ سے خواہ دار العلوم دیو بند یا اس کے منتسب اداروں میں سے کسی ادارے سے وابستہ رہے ہوں لیکن مسلک و مشرب اور مزاج و مذاق میں اکابر علمائے دیو بند کے ترجمان نہیں تھے اور نہ انہوں نے یہ مزاج و مذاق اس متواتر طریقے پر حاصل کیا تھا جو اس کے حصول کا صحیح طریقہ ہے۔

اگر چہ دار العلوم دیو بند کے قیام سے لے کر آج تک کی تاریخ سامنے ہو تو اس قسم کی بے اعتدالیوں کی مقدار کچھ زیادہ نہیں تھی۔ لیکن اکابر علماء کے رخصت ہونے کے ساتھ ساتھ ان کی تعداد میں اضافہ ہونے لگا اور ناواقف لوگ ان کو مسلک علمائے دیو بند سے منسوب کرنے لگے۔

اس لیے بھی اس بات کی ضرورت محسوس کی جانے لگی کہ علمائے دیو بند کے مسلک و مشرب اور مزاج و مذاق کی تشریح کر کے ایسے جامع انداز میں مرتب و مدون کر دیا جائے جس کے بعد کوئی التباس و اشتباہ پیدا نہ ہو۔

اس ترتیب و تدوین کے لیے اس آخری دور میں بلاشبہ کوئی شخصیت حکیم الاسلام حضرت قاری محمد طیب صاحب قدس سرہ کی شخصیت سے زیادہ موزوں نہیں ہو سکتی تھی۔ حضرت قاری صاحب رحمۃ اللہ علیہ نہ صرف نصف صدی سے زیادہ مدت تک دار العلوم دیو بند کے مہتمم رہے ہیں بلکہ انہوں نے براہ راست ان اکابر علمائے دیو بند سے اکتساب فیض فرمایا ہے جو بلا اختلاف مسلک علماء دیو بند کے حقیقی ترجمان تھے۔ انہوں نے شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ، حکیم الامت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ، امام العصر حضرت علامہ سید انور شاہ صاحب کشمیری رحمۃ

اللہ علیہ اور مفتی اعظم حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ جیسے اساطین سے صرف ضابطے ان کے مزاج و مذاق کی خوشبو کو بنے قلب و ذہن میں بسایا تھا کسی سیاسی اور انتظامی مسئلے میں کسی کو حضرت رحمۃ اللہ علیہ سے خواہ کتنا اختلاف رائے رہا ہو۔ لیکن اس بات میں دو رائے ممکن نہیں کہ اس آخری دور میں وہ مسلک علماء دیو بند کے مستند ترین شارح تھے۔

چنانچہ مذکورہ دو اسباب کے تحت جب کبھی مسلک علماء دیو بند کی تشریح و تفصیل کی ضرورت محسوس ہوئی، نگاہیں حضرت قاری صاحب رحمۃ اللہ علیہ ہی کی طرف اٹھیں اور وقت کی اس ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے اس موضوع پر کئی تحریریں قلم بند یا شائع فرمائیں جن میں اب تک سب سے مفصل تحریر سمجھی جاتی ہے جو ''مسلک علماء دیو بند'' کے نام سے شائع ہو چکی ہے۔

لیکن جیسا کہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے خود زیر نظر کتاب کے مقدمے میں تحریر فرمایا ہے یہ تمام تحریریں کسی اور موضوع کا ضمنی حصہ بنا کر لکھی گئی تھیں جن کا براہ راست موضوع ''مسلک علماء دیو بند'' کی مفصل توضیح نہیں تھا اور ظاہر ہے کہ کسی موضوع کے ضمنی تذکرے میں وہ وضاحت ممکن نہیں جو اسے براہ راست مقصود بنا کر لکھنے کی صورت میں ہو سکتی ہے۔

چنانچہ حضرت قاری صاحب قدس سرہ نے اس ضرورت کو محسوس فرماتے ہوئے اپنے آخری ایام حیات میں یہ مفصل کتاب تالیف فرمائی جو اس وقت آپ کے سامنے ہے۔

افسوس ہے کہ یہ کتاب حضرت کی حیات میں شائع نہیں ہو سکی، حضرت رحمۃ اللہ علیہ اپنے آخری ایام حیات میں جن شدید آزمائشوں سے گذرے۔ شاید ان کے جھمیلوں نے اس گراں قدر ذخیرے کو منظر عام تک لانے کی مہلت نہیں دی اور یہ کتاب مسودے ہی کی شکل میں رکھی رہی۔

بالآخر حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے مسودات میں یہ جلیل القدر مسودہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے اہل خانہ کو دستیاب ہوا اور انہوں نے پاکستان میں احقر کے برادر زادہ عزیز مولانا محمود اشرف عثمانی (استاد حدیث دار العلوم کراچی کو اس کے طبع اور شائع کرنے کی

اجازت دی اور اس طرح حکمت و معرفت کا یہ خزانہ پہلی بار ان کے ادارہ اسلامیات سے شائع ہو رہا ہے۔

اس کتاب کا پس منظر تو احقر نے بیان کر دیا۔ لیکن جہاں تک اس کے مضامین کا تعلق ہے اس کے بارے میں احقر ناکارہ کا کچھ عرض کرنا سورج کو چراغ دکھانے کے مترادف ہے۔ یہ مہکتا ہوا نامہ مشک اب خود آپ کے سامنے ہے، لہٰذا اسے کسی عطار کے تعارف کی حاجت نہیں۔ بس مختصر یہ ہے کہ اکابر علمائے دیوبند کے مسلک و مشرب اور مزاج و مذاق کی وہ خوشبو جو علمائے دیوبند کے فکر و عمل سے پھوٹی۔ حضرت قاری صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے قلب و ذہن نے اسے جذب کر کے اس کتاب میں الفاظ و نقوش کی شکل دے دی ہے اور حضرات علمائے دیوبند کے فکر و عمل کو اس طرح کھول کر بیان فرما دیا ہے کہ اس میں کوئی التباس واشتباہ باقی نہیں رہا۔

اس سے زیادہ کچھ کہہ کر میں آپ کے اور کتاب کے درمیان مزید حائل نہیں ہونا چاہتا۔ کہ کسی پڑھے لکھے مسلمان کو، بالخصوص دینی مدارس کے کسی استاد یا طالب علم کو اس کتاب کے مطالعے سے محروم نہ رہنا چاہیے۔ بلکہ دینی مدارس میں اس کتاب کے مطالعہ یا تدریس کو نصاب کا حصہ بننا چاہیے۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کے ذریعے مسلمانوں کو زیادہ سے زیادہ فائدہ پہنچائے اور یہ حضرت مصنف رحمۃ اللہ علیہ ان کے اہل خانہ کے ناشرین کے لیے ذخیرہ آخرت ثابت ہو۔ آمین۔

محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۲۵ر شوال المکرم ۱۴۰۸ھ۔

مضمون: ۱۱

دینی مدارس، عظیم الشان نعمت

خطبہ مسنونہ......امابعد۔

حضرات علماء کرام، میرے عزیز طالب علم ساتھیو اور معزز حاضرین!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔

میرے استاد مکرم شیخ الحدیث حضرت مولانا سبحان محمود صاحب دامت برکاتہم العالیہ کے درس کے بعد میری لب کشائی یوں تو مناسب نہ تھی کہ حضرت کے درس کی بعد کسی اور بات کی گنجائش نہیں۔ لیکن پھر حضرت نے ہی حکم فرمایا کہ کچھ کلمات عرض کروں اور معمول بھی یہ رہا ہے کہ ختم بخاری کے اس موقعہ پر میرے برادر بزرگ صدر دار العلوم حضرت مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی مدظلہم العالی کچھ بیان فرمایا کرتے ہیں وہ اس وقت سفر پر ہیں۔ اس لیے حضرت کا ارشاد ہوا کہ ان کی نیابت میں کچھ گزارشات آپ حضرات کی خدمت میں پیش کروں۔

گندم اگر بہم نہ رسد جو غنیمت است

اس لیے حضرت کے تعمیل ارشاد میں آپ کے سامنے حاضر ہوں۔

اللہ جل جلالہ کا بے پایاں کرم و انعام ہے اس کا شکر کسی طرح بھی ادا نہیں ہوسکتا کہ آج اس نے اپنے فضل و کرم سے دار العلوم کی تعلیمی مصروفیات تکمیل تک پہنچانے کی توفیق عطا فرمائی۔ یہ مبارک درس جس میں ابھی اللہ تعالیٰ نے ہم سب کو شرکت کی سعادت بخشی۔ یہ صحیح بخاری کا آخری درس تھا۔ اللہ تعالیٰ کی کتاب کے بعد اس روئے زمین پر سب سے زیادہ صحیح کتاب امام بخاری کی یہ کتاب ہے اور حضرت والا نے سارے سال از اول تا آخر طلبہ کو اس درس سے فیض یاب کیا ہے۔

آج الحمدللہ یہ مبارک سلسلہ تکمیل کو پہنچا اور اس کے ساتھ ساتھ دار العلوم کے تعلیمی سال کا بھی اختتام ہوا۔ دار العلوم کے تمام درس میں یہ آخری درس ہوتا ہے، جس پر اس

سال کا تعلیمی سلسلہ اختتام پذیر ہوتا ہے۔

سال کے شروع میں جب تعلیم کا آغاز ہوا تھا، تو اس وقت کیا کہا جا سکتا تھا کہ کون اس تکمیل میں شریک ہو سکے گا اور کون شریک نہیں ہوگا۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنے فضل وکرم سے ہمیں یہ موقع عطا فرمایا اور اس کی توفیق عطا فرمائی...... اس پر جتنا بھی شکر ادا کیا جائے کم ہے۔

انسان پر خالق کائنات کی نعمتیں لامتناہی ہیں، تنہا سانس ہی کی نعمت کو دیکھئے کہ یہ کتنی عظیم نعمت ہے۔

شیخ سعدی رحمتہ اللہ علیہ نے نہایت آسان طریقہ پر اس بات کو یوں سمجھایا ہے کہ

"ہر انسان جب ایک سانس لیتا ہے تو ایک سانس کے اندر دو نعمتیں اللہ تبارک وتعالیٰ کی جمع ہیں۔ سانس کا اندر جانا ایک نعمت ہے اور باہر آنا دوسری نعمت ہے۔"

اگر سانس اندر نہ جائے تو موت ہے اور اندر جانے کے بعد باہر نہ آئے تو موت ہے۔ اس طرح ایک سانس میں دو نعمتیں جمع ہیں اور ہر نعمت پر شکر ادا کرنا واجب ہے۔ تو ایک ہی سانس میں اللہ تبارک وتعالیٰ کے دو شکر واجب ہوئے۔ اگر انسان صرف سانس کی نعمت پر شکر ادا کرنا چاہے تو ادا نہیں کر سکتا، دیگر نعمتوں کی بات تو دوسری ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ کی رحمتیں بارش کی طرح برس رہی ہیں اور ان کا شمار بھی ممکن نہیں۔

لیکن ان تمام نعمتوں میں سب سے جلیل القدر نعمت، سب سے عظیم الشان نعمت جس کے برابر اور کوئی نعمت نہیں ہو سکتی وہ ایمان کی نعمت ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے ہمیں اپنے فضل وکرم سے ایمان کی نعمت سے نوازا، اس کی قدر و قیمت کا احساس ہم کو اس لیے نہیں ہے کہ یہ نعمت ہم کو ماں باپ سے مفت میں مل گئی، اسے حاصل کرنے کے لیے کوئی دوڑ دھوپ نہیں کرنی پڑی، کوئی قربانی نہیں دینی پڑی، کوئی تکلیف نہیں اٹھانی پڑی۔ اس واسطے اس کی قدر و قیمت کا احساس نہیں۔

اس کی قدر و قیمت پوچھئے بلال حبشی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے، صہیب رومی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے، زید بن حارثہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے، جنہوں نے اس کلمہ **لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ** کے حاصل کرنے کے لیے طرح طرح کی اذیتیں سہیں، قربانیاں

جھلیں، تب جا کر انہیں یہ نعمت حاصل ہوئی۔ اللہ جل جلالہ نے ہمیں گھر بیٹھے مسلمان گھرانہ میں پیدا کیا اور بغیر کسی مشقت کے یہ نعمت حاصل ہوگئی، اس لیے اس کی قدر و قیمت کا صحیح اندازہ نہیں ہوتا، ورنہ ساری نعمتوں پر سب سے زیادہ فوقیت رکھنے والی یہی ایمان کی نعمت ہے۔

ایمان کے بعد اس کائنات کی سب سے عظیم نعمت، ایمان کے تقاضوں کے علم کی نعمت ہے کہ ایمان کیا تقاضا کرتا ہے؟ کیا مطالبات رکھتا ہے؟ اس کے نتیجہ میں انسان کے اوپر کیا فرائض و واجبات عائد ہوتے ہیں۔ یہ علم ایمان کے بعد سب سے بڑی نعمت ہے۔

یہ ادارہ دارالعلوم جس کے تعلیمی سال کا آج اختتام ہو رہا ہے، الحمدللہ اسی علم دین کی خدمت کے لیے اور اسی علم کے پہنچانے اور پھیلانے کے لیے کچھ اللہ والوں نے اپنے اخلاص کے ساتھ قائم فرمایا تھا اور اسی راستہ پر حتیٰ الامکان چلنے کی کوشش کر رہا ہے۔

آج کی فضاء میں طرح طرح کے نعرے، طرح طرح کے پروپیگنڈے، طرح طرح کے اعتراضات، ان مدارس دینیہ پر کیے جا رہے ہیں، اعتراضات اور طعنوں کا ایک سیلاب ہے جو ان مدارس کی طرف بہایا جا رہا ہے۔ یہ اعتراضات کچھ تو ان معاندین کی طرف سے ہیں جو دین کے دشمن، اسلام کے دشمن اور اس زمین پر اللہ کے کلمہ کے غلبہ کے دشمن ہیں وہ ان مدارس کے خلاف پروپیگنڈہ کرتے ہیں، لیکن بعض اوقات اچھے خاصے پڑھے لکھے اور دین سے تعلق رکھنے والے بھی اس پروپیگنڈہ کا شکار ہو جاتے ہیں، دانستہ یا غیر دانستہ ان مدارس دینیہ کے بارے میں طرح طرح کے خیالات ان کے دلوں میں پیدا ہو جاتے ہیں۔

میرے والد ماجد قدس اللہ سرہ بعض اوقات ہنسی میں فرمایا کرتے تھے کہ ''یہ مولوی ملامتی فرقہ ہے''، یعنی جب کہیں دنیا میں کوئی خرابی ہوگی تو لوگ اس کو مولوی کی طرف موڑنے کی کوشش کرتے ہیں۔ مولوی کوئی بھی کام کرے، اس میں کوئی اعتراض کا پہلو ضرور نکال لیتے ہیں، مولوی اگر بیچارہ گوشہ نشین ہے اور اللہ اللہ کر رہا ہے، قال الرسول کا درس دے رہا ہے تو اعتراض یہ ہے کہ یہ تو دنیا سے بے خبر ہے، دنیا کہاں جا رہی ہے، ان

کو اپنے بسم اللہ کے گنبد سے نکلنے کی فرصت نہیں، اگر کوئی مولوی بیچارہ اصلاح کے لیے یا کسی اجتماعی کام کے لیے گوشہ سے باہر نکل آئے، تو لوگ اعتراض کرتے ہیں کہ مولوی صاحب کا تو کام تھا مدرسہ میں بیٹھ کر اللہ اللہ کرنا اور آج یہ سیاست میں اور حکومت کے معاملات میں دخل انداز ہو رہے ہیں۔

اگر مولوی بیچارہ ایسا ہو کہ اس کے پاس مالی وسائل کا فقدان ہو، فقر و تنگدستی کا شکار ہو تو لوگ اعتراض کرتے ہیں کہ انہوں نے اپنے طالب علموں کے لیے مالی وسائل کا انتظام نہیں کر رکھا ہے یہ مدرسہ سے نکل کر کہاں جائیں گے کہاں سے روٹی کھائیں گے، کہاں سے گزارہ ہوگا اور اگر کسی مولوی کے پاس پیسے زیادہ آگئے تو کہتے ہیں کہ لیجیے یہ مولانا صاحب ہیں؟ یہ تو لکھ پتی اور کروڑ پتی بن گئے ان کے پاس تو دولت آگئی تو اس بیچارے مولوی کی کسی حالت میں معافی نہیں۔ یہ مولوی ملامتی فرقہ ہے۔

ایک قوم تو وہ ہے جو باقاعدہ اہتمام کے ساتھ پروپیگنڈہ کر کے عناد کے ذریعے اہل علم اور طلبہ کے خلاف بدظنیاں اور بدگمانیاں پھیلا رہی ہے خوب سمجھ لیں، یہ اسلام دشمنی ہے، اس لیے کہ اسلام کے دشمن اس بات کی حقیقت سے واقف ہیں کہ اس روئے زمین کے اوپر جو طبقہ الحمدللہ اسلام کے لیے اس کی ڈھال بنا ہوا ہے وہ یہی بوریہ نشینوں کی جماعت ہے، انہی بوریہ پر بیٹھنے والوں نے الحمدللہ اسلام کے لیے ڈھال کا کام کیا ہے۔ یہ لوگ جانتے ہیں کہ جب تک مولوی اس روئے زمین پر موجود ہے تو انشاء اللہ ثم انشاء اللہ اس زمین سے اسلام کا بیج نہیں مٹایا جا سکتا اور یہ مشاہدہ ہے کہ جس جگہ پر یہ بوریہ نشین مولوی ختم ہو گئے وہاں اسلام کا کس کس طرح حلیہ بگاڑا گیا اور اسلام کو مٹانے کی سازشیں کس طرح کامیاب ہوئیں۔

اللہ تعالیٰ نے بہت دنیا دکھائی ہے اور عالم اسلام کے ایسے ایسے خطوں پر بھی جانے کا اتفاق ہوا۔ جہاں اب ان مدارس کا بیج مار دیا گیا ہے لیکن اس کا نتیجہ کھلی آنکھوں یوں نظر آتا ہے کہ جیسے۔

کسی چرواہے کو قتل کر دینے کے بعد بھیڑوں کا کوئی ذمہ دار نہیں ہوتا اور بھیڑیے انہیں پھاڑ کر کھا جاتے ہیں۔ بہت سے خطوں میں آج عام مسلمانوں کا دینی اعتبار سے یہی حال ہے۔

میر ا بغداد جانا ہوا اور بغداد وہ شہر ہے جو صدیوں تک عالم اسلام کا پایہ تخت رہا ہے، وہاں خلافت عباسیہ کا جاہ و جلال دنیا نے دیکھا اور علوم و فنون کے بازار گرم ہوئے، میں بغداد پہنچا تو کسی سے معلوم کیا کہ کیا یہاں کوئی مدرسہ ہے؟ علم دین کا کوئی مرکز جہاں علم دین کی تعلیم دی جاتی ہو؟ میں اس کی زیارت کرنا چاہتا ہوں۔

کسی نے بتایا کہ یہاں ایسے مدرسے کا کوئی نام و نشان نہیں ہے۔ اب تو سارے مدارس اسکولوں اور کالجوں میں تبدیل ہو چکے ہیں۔ اگر دین کی تعلیم ہے تو اس کے لیے یونیورسٹیوں کی فیکلٹیز ہیں۔ ان میں دینیات کی تعلیم دی جاتی ہے اور ان کے اساتذہ کو دیکھ کر یہ پتہ چلانا مشکل ہوتا ہے کہ عالم تو کجا یہ مسلمان بھی ہیں یا نہیں؟ ان اداروں میں مخلوط تعلیم رائج ہے، مرد، عورتیں ایک ساتھ زیر تعلیم ہیں اور اسلام محض ایک نظریہ ہو کر رہ گیا جس کو تاریخی فلسفے کے طور پر پڑھا پڑھایا جارہا ہے۔ زندگیوں میں اس کا کوئی اثر نظر نہیں آتا۔ جس طرح مستشرقین پڑھتے ہیں۔ آج امریکہ، کینیڈا اور یورپ کی یونیورسٹیوں میں بھی اسلامی تعلیم ہو رہی ہے، اسلام پڑھایا جارہا ہے۔ وہاں پر بھی حدیث فقہ اور تفسیر کی تعلیم کا انتظام ہے ان کے مقالات اگر آپ پڑھیں تو ایسی ایسی کتابوں کے نام نظر آئیں گے جن کا ہمارے سیدھے سادھے مولویوں کو بھی پتہ نہیں ہوتا۔ بظاہر بڑی تحقیق کے ساتھ کام ہو رہا ہے۔ لیکن وہ دین کی کیا تعلیم ہوئی، جو انسان کو ایمان کی دولت بھی عطا نہ کر سکے۔ صبح سے شام تک اسلامی علوم کے سمندر میں غوطے لگانے کے باوجود ناکام ہی لوٹتے ہیں اور اس کے قطرہ سے حلق بھی تر نہیں کرتے، مغرب کی ان تعلیم گاہوں میں کلیۃ الشریعہ بھی ہے، کلیۃ اصول الدین بھی ہے۔ لیکن اس کا کوئی اثر زندگی میں نظر نہیں آتا۔ ان علوم کی روح فنا کر دی گئی ہے۔

پھر میں نے ان سے عرض کیا کہ کوئی مدرسہ نہ سہی، کوئی عالم، جو پرانے طریقہ کے ہوں مجھے ان کا پتہ بتلا دیا جائے میں ان کی خدمت میں حاضر ہونا چاہتا ہوں۔ تو معلوم ہوا کہ شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کے مزار مبارک کے قریب ایک مسجد میں مکتب قائم ہے، اس مکتب میں ایک قدیم استاد رہتے ہیں۔ جنہوں نے قدیم طریقہ سے پڑھا ہے، میں تلاش کرتا ہوا ان کی خدمت میں پہنچ گیا، دیکھ کر معلوم ہوا کہ واقعی پرانے طرز کے بزرگ ہیں اور انہیں دیکھ کر احساس ہوا کہ کسی متقی عالم، اللہ والے کی زیارت کی

ہے۔انہوں نے بھی بوریہ پر بیٹھ کر پڑھاتھا،یہی روکھی سوکھی کھا کر،موٹا جھوٹا پہن کر تعلیم حاصل کی تھی۔ان کے چہرے پر اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے علوم شریعت کے انوار نظر آئے اوران کی خدمت میں تھوڑی دیر بیٹھ کراندازہ ہوا کہ میں جنت کی فضا میں آ گیا۔

سلام دعا کے بعد انہوں نے مجھ سے پوچھا: آپ کہاں سے آئے؟ میں نے بتلادیا، پاکستان سے، انہوں نے مجھ سے دارالعلوم کے بارے میں کچھ سوالات کیے کہ جس مدرسہ میں آپ پڑھتے پڑھاتے ہیں وہ کیسا مدرسہ ہے؟ میں نے انہیں تفصیل بتلادی، پوچھنے لگے وہاں کیاپڑھایا جاتا ہے کون سی کتابیں پڑھائی جاتی ہیں۔میں نے ان کتابوں کے نام ذکر کیے جو ہمارے یہاں پڑھائی جاتی ہیں تو ان کی چیخ نکل گئی، رو پڑے، آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے، کہنے لگے،اب تک یہ کتابیں تمہارے یہاں پڑھائی جاتی ہیں؟ میں نے کہا کہ الحمدللہ پڑھائی جاتی ہیں۔تو فرمایا کہ ہم تو آج ان کتابوں کا نام سننے سے بھی محروم ہوگئے اور آج ان کا نام سن کر مجھے رونا آ گیا۔یہ کتابیں اللہ والے پیدا کیا کرتی تھیں۔یہ صحیح مسلمان پیدا کیا کرتی تھیں، ہمارے ملک سے توان کا خاتمہ ہوگیا، میں آپ کونصیحت کرتا ہوں، میرا یہ پیغام آپ اپنے ملک کے اہل علم وعوام تک پہنچادیجیے، کہ اللہ کے لیے، ہر چیز کو برداشت کرلینا، مگر اس طرح کے مدرسوں کوختم کرنا ہرگز برداشت نہ کرنا، دشمنان اسلام اس راز سے واقف ہیں کہ جب تک یہ سیدھا سادہ بوریہ پر بیٹھنے والا مولوی اس معاشرہ میں موجود ہے، مسلمانوں کے دلوں سے ایمان کو کھرچانہیں جاسکتالہٰذا دشمنان اسلام نے اس کے خلاف پروپیگنڈہ کے اوپر اپنی پوری مشینری لگائی ہوئی ہے۔

شاعر مشرق اقبال مرحوم کے بارے میں یہ بات بڑی مشہور ہے کہ انہوں نے ملا کے بارے میں طنز آمیز کلمات کہے ہیں لیکن جگہ جگہ انہوں نے ایسی باتیں بھی کہہ دی ہیں۔جو انسان کو حقیقت تک پہنچانے والی ہیں۔ایک جگہ انہوں نے انگریزوں اور دشمنان اسلام کی ترجمانی کرتے ہوئے افغانستان کے بارے میں ایک شعر کہا ہے۔

افغانیوں کی غیرت دیں کا ہے یہ علاج
ملا کو ان کے کوہ و دامن سے نکال دو

افغانیوں کی دینی غیرت کواگر تباہ کرنا ہےاوراس کوختم کرنا ہےتو اس کاواحد راستہ

یہ ہے کہ ملا کو اس معاشرے سے نکال دو، جب تک یہ ملا بیٹھا ہوا ہے تو ان کے دلوں سے ایمان کی غیرت کو نہیں نکالا جا سکتا۔ غرض مدارس کے بارے میں طرح طرح کے پروپیگنڈے پھیلائے جا رہے ہیں کہ یہ چودہ سو سال پرانے لوگ ہیں، دقیانوسی لوگ ہیں۔ یہ رجعت پسند لوگ ہیں۔ ان کو دنیا کے حالات کی خبر نہیں ہے ان کو اس دنیا میں رہنے کا سلیقہ نہیں ہے۔ ان کے پاس دنیاوی علوم وفنون نہیں ہیں۔ یہ امت مسلمہ کا پہیہ الٹا چلانے کی کوشش میں ہیں۔ یہ نعرے مختلف اوقات میں لگائے جاتے رہے ہیں اور آج ایک دفعہ پھر پوری شدت سے ان کی صدائے بازگشت ہمارے ملک میں سنائی دے رہی ہے۔

یہ اعتراض بھی ہوتا ہے کہ دینی مدارس دہشت گرد بن گئے ہیں، یہ ترقی کے دشمن ہیں دہشت گردی کا بھی طعنہ ان کے اوپر، بنیاد پرستی کا بھی طعنہ ان کے اوپر، رجعت پسندی کا بھی طعنہ ان کے اوپر۔ تنگ نظری کا بھی طعنہ ان کے اوپر، ترقی کے دشمن ہونے کا بھی طعنہ ان کے اوپر، ساری دنیا کے طعنوں کی بارش اس بیچارے مولوی کے اوپر ہے، لیکن یہ مولوی بہت پکا ہے۔

میرے والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ یہ مولوی بڑا سخت جان ہے۔ اس پر ان طعنوں کی کتنی ہی بارش کر دو یہ ہر طرح کے حالات سہہ لیتا ہے اس لیے کہ جب کوئی آدمی اس کوچہ میں داخل ہوتا ہے تو الحمد للہ، کمر مضبوط کر کے داخل ہوتا ہے، اس کو پتہ ہے کہ یہ سارے طعنے مجھے سہنے پڑیں گے۔ دنیا مجھے برا کہے گی وہ ان سب طعنوں کا استقبال کرتے ہوئے اور خوش آمدید کہتے ہوئے ان میں داخل ہوتا ہے

جس کو ہو جان و دل عزیز اس کی گلی میں جائے کیوں

اس گلی میں تو آتا ہی وہ ہے جس کو معلوم ہے کہ یہ سب طعنے سہنے پڑیں گے۔ اللہ تعالیٰ حقیقت بین نگاہ عطا کرے تو یہ طعنے ایک داعی حق کے گلے کا زیور ہیں اس کے سر کا تاج ہیں، یہ وہ طعنے ہیں جو حضرات انبیاء کرام علیہم الصلاۃ والسلام نے بھی سنے اور انبیاء کرام کے وارثوں نے بھی سنے اور قیامت تک یہ طعنے دیئے جاتے رہیں گے، اللہ تعالیٰ اپنے سیدھے راستہ پر رکھے، اخلاص عطا فرمائے، اپنی رضا جوئی کی فکر عطا فرمائے۔ یہ طعنے بے حقیقت ہیں، ایک دن وہ آئے گا جب یہ مولوی انشاء اللہ تعالیٰ یہ کہنے کی پوزیشن

میں ہوگا۔

فالیوم الذین آمنوا من الکفار یضحکون

وہ وقت آئے گا، جب طعنے دینے والوں کے گلے بیٹھ جائیں گے، ان کی آواز دھیمی پڑ جائے گی۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے اس طبقے کو عزت و شرف عطا فرمائیں گے جس کو آج بے حقیقت سمجھا جاتا ہے۔

وللہ العزة ولرسولہ وللمومنین

عزت درحقیقت اللہ تبارک و تعالیٰ ہی عطا فرماتا ہے اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے یہ دینی مدارس ان تمام طعنوں کے طوفان میں الحمدللہ چل رہے ہیں اور جب تک اللہ تعالیٰ کو اس دین حق کی بقاء منظور ہے اس وقت تک انشاء اللہ یہ مدارس موجود رہیں گے، لوگ ہزار طعنے دیا کریں، ان کے طعنوں کی کوئی پرواہ نہیں۔

آج ہمارے ماحول کے اندر، بار بار آوازیں اٹھتی ہیں کہ ان دینی مدارس کو بند کر دیا جائے ان کو ختم کر دیا جائے، بہت سے لوگ ایسے بھی ہیں جو اگرچہ عناد کی وجہ سے نہیں لیکن ہمدردی ہی کے پیرایہ میں ان نعروں کے ساتھ ہم آواز ہو جاتے ہیں اور بعض اوقات اپنی دانست میں اصلاح ہی کی غرض سے مشورے دیتے ہیں۔ **انما نحن مصلحون۔**

کبھی کوئی یہ کہہ دیتا ہے کہ مولویوں کے کھانے، کمانے کا کوئی بندوبست نہیں ہے۔ لہٰذا ان کو کوئی ہنر سکھانا چاہیے۔ بڑھئی کا کام سکھا دو کچھ لوہار کا کام سکھا دو، کچھ ایسے صنعتی کام سکھا دو کہ یہ اپنی روٹی کما سکیں، لوگ طرح طرح کی تجویزیں لے کر آتے ہیں کہ ایک دارالصنائع قائم کر دو، تاکہ ان مولویوں کی روٹی کا بندوبست ہو جائے۔

میرے والد ماجد قدس اللہ سرہ فرمایا کرتے تھے کہ بھئی اللہ کے لیے اس مولوی کی روٹی کی فکر چھوڑ دو، یہ اپنی روٹی خود کھا کما لے گا، اس کی فکر چھوڑ دو، مجھے کچھ مثالیں ایسی دے دو کہ کسی مولوی نے فقر و فاقہ کی وجہ سے خودکشی کی ہو۔ بہت سے پی ایچ ڈی والوں کی مثالیں میں دے دیتا ہوں، بہت سے ماسٹر کی ڈگری رکھنے والوں کی مثالیں دے دیتا ہوں جنہوں نے خودکشی کی اور حالات سے تنگ آ کر اپنے آپ کو ختم کر ڈالا۔ لیکن ایک مولوی ایسا نہیں بتا سکتے۔ جس نے حالات سے تنگ آ کر خودکشی کی ہو، یا اس کے

بارے میں یہ کہا گیا ہو کہ وہ بھوکا مر گیا، اللہ تبارک وتعالیٰ اپنی رحمت سے مولوی کا بھی انتظام کر دیتے ہیں۔ دوسروں سے بہت اچھا انتظام فرماتے ہیں۔

میرے طالب علم ساتھیو! اچھی طرح سمجھ لو، اس دنیا کا خاصہ یہ ہے کہ جتنا آدمی اس دنیا کے پیچھے دوڑے گا، دنیا اس سے بھاگے گی اور جتنا اس دنیا سے بھاگے گا، دنیا اس کے پیچھے بھاگے گی۔ کسی نے اس کی مثالیں سایہ سے دی ہے، اگر کوئی آدمی سایہ کے پیچھے بھاگنا شروع کر دے، تو سایہ اس سے آگے آگے بڑھتا رہے گا اور اگر پیٹھ موڑ کر بھاگنا شروع کر دو تو سایہ اس کے پیچھے بھاگنا شروع کر دے گا۔

انسان جتنا اس دنیا کا طالب ہوگا، دنیا اس سے بھاگے گی اور جتنا ایک مرتبہ اس سے سچے دل سے منہ موڑ لے گا تو **تاتیہ الدنیا وھی راغمۃ** دنیا اس کے آگے ذلیل ہو کر آئے گی وہ ٹھوکریں مارے گا دنیا اس کے قدموں پر آ کر گرے گی اور عام طور پر دیکھ لو، اللہ کے جن بندوں نے اللہ پر بھروسہ کر کے اللہ کے دین کے لیے اپنی زندگیوں کو وقف کر دیا اور اس کی خاطر دنیا کو ایک مرتبہ ٹھوکر ماردی تو اللہ نے ان کے قدموں میں دنیا کو اس طرح بھیج دیا کہ دوسرے رشک کرتے ہیں۔ اللہ تبارک وتعالیٰ ایسا انتظام کرتے ہیں اور آنکھوں سے دکھاتے ہیں کہ اللہ والوں کی عزت کیا ہے؟ رب کریم ہمیں اپنے فضل وکرم سے اپنا اخلاص عطا فرمائے اور اپنا بنا لے۔ رب کریم ہمارے دلوں کے اندر یہ جذبہ پیدا فرما دے اور ہمیں اپنی زندگیاں اپنے دین کی خاطر وقف کرنے کی توفیق عطا فرما دے۔ انشاء اللہ دنیا آخرت میں کہیں گھاٹا نہیں...... تو بھئی مولوی کی روٹی کی فکر آپ چھوڑ دو، اللہ تبارک وتعالیٰ بہترین کفیل ہے۔

حضرت والد قدس سرہ فرمایا کرتے تھے کہ خالق کائنات کتوں کو دیتا ہے، گدھوں کو دیتا ہے خنزیروں کو دیتا ہے۔ وہ اپنے دین کے حاملوں کو کیوں نہیں دے گا، اس لیے یہ دار الصنائع وغیرہ کی فکر چھوڑ دو۔

ہاں دین کے ایک حامل کو دین کا پیغام موثر انداز میں پہنچانے کے لیے اور اس کو دنیا میں پھیلانے کے لیے بعض دنیاوی علوم وفنون کی بھی ضرورت ہے اور فقیہ وہ ہے جو حالات زمانہ سے واقف ہو، اس نیت سے وہ جو کچھ پڑھے اور پڑھائے وہ دین کا ہی حصہ ہے۔

لیکن یاد رکھو اگر ایک مرتبہ آپ نے مولوی کو بڑھئی یا لوہار بنا دیا تو پھر وہ بڑھئی یا لوہار ہی ہو جائے گا۔

میرے والد ماجد فرمایا کرتے تھے کہ منطق کا قاعدہ ہے کہ نتیجہ ارذل کے تابع ہوتا ہے ایک مولوی ہے اور اس کے ساتھ اس نے بڑھئی یا لوہار کا کام بھی سیکھ لیا اور وہ یہ کہے کہ سارا وقت تو لگاؤں گا بڑھئی یا لوہار کے کام میں اور اللہ تعالیٰ موقعہ دے گا تو بغیر تنخواہ کے دین کی خدمت کروں گا۔ وہ بڑھئی یا لوہار ہی بن جائے گا دین کا کام نہیں کر سکے گا۔

میرے والد ماجد قدس اللہ سرہ نے ایک واقعہ سنایا تھا کہ: ہمارے ایک بڑے بزرگ دارالعلوم دیوبند کے نامی گرامی اساتذہ میں سے تھے حضرت مولانا محمد سہیل عثمانی صاحبؒ، یہ حضرت شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسن صاحب کے خاص شاگرد تھے، علم ادب میں بہت آگے تھے، دارالعلوم دیوبند میں پڑھایا کرتے تھے، پڑھاتے پڑھاتے خیال آیا کہ ہم مدرسے میں پڑھا کر تنخواہ لیتے ہیں یہ تو مزدوری ہوئی، دین کی خدمت نہ ہوئی، دین کی خدمت تو وہ ہے جو بغیر تنخواہ کے کی جائے، ہم جو تنخواہ لے کر پڑھاتے ہیں، معلوم نہیں اس کا اجر بھی ملے گا یا نہیں؟ اس واسطے اپنے لیے کوئی ایسا ذریعہ معاش تلاش کریں کہ اپنا گزارہ اسی میں ہو جائے اور فارغ وقت میں اللہ کے دین کی خدمت بغیر معاوضہ کے کریں، کہیں وعظ کر دیا، کہیں تقریر کر دی، کبھی فتویٰ لکھ دیا، چنانچہ اسی دوران ایک سرکاری تعلیم گاہ سے ایک پیش کش آگئی کہ آپ ہمارے یہاں آکر پڑھائیں، اس میں اتنی تنخواہ آپ کو دی جائے گی۔ یہ آپ جانتے ہیں کہ سرکاری اداروں کے اندر استاد کا کام بڑا ہلکا ہوتا ہے، سارے دن میں گھنٹہ، دو گھنٹہ پڑھانے کے ہوتے ہیں اور پڑھانے میں بھی ایسا مواد نہیں ہوتا کہ اس کے مطالعہ میں کوئی مشکل پیدا ہو، یہ تو دینی مدارس ہی ہیں کہ مولوی پانچ گھنٹے پڑھاتا ہے اور پانچ گھنٹے پڑھانے کے لیے دس گھنٹے مطالعہ کرتا ہے، اس طرح کا کولھو کا بیل وہاں نہیں پایا جاتا۔ تو مولانا نے سوچا کہ دین کی خدمت کرنے کا اچھا موقعہ ہے، وہاں دو گھنٹے پڑھاؤں گا۔ باقی وقت بغیر اجرت و معاوضہ کے دین کی خدمت انجام دوں گا۔ اسی جذبے کے تحت حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ سے عرض کیا کہ حضرت مجھے یہ پیشکش آئی ہے اور اس غرض سے جانا چاہتا ہوں، حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ اچھا بھئی تمہارے دل کے اندر

داعیہ ہے تو جا کے دیکھ لو، حضرت نے سوچا کہ ان کے دل میں داعیہ تو ہے اور اس وقت روکنا مناسب نہیں چنانچہ چلے گئے۔ چھ مہینے گزر گئے، چھ مہینے کے بعد چھٹیوں میں دیو بند آئے تو شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے پہلی ہی ملاقات میں پوچھا کہ مولانا سہول صاحب! آپ اس خیال سے گئے تھے کہ سرکاری مدرسہ میں پڑھانے کے اوقات کے علاوہ دین کی خدمت انجام دیں گے یہ بتاؤ کہ اس عرصہ میں کتنی تصانیف ہوئیں کتنے فتوے لکھے اور کتنے وعظ کہے۔ اس کا حساب تو دے دو، تو مولانا رو پڑے اور فرمایا کہ حضرت یہ شیطانی دھوکہ تھا، اس دارالعلوم میں رہ کر اللہ تعالیٰ جو توفیق عطا فرماتے تھے، وہاں جا کر اس کی آدھی بھی توفیق نہیں رہی۔ حالانکہ فارغ وقت کئی گناہ زیادہ تھا۔ میرے والد قدس اللہ سرہ فرمایا کرتے تھے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان مدارس کی فضا میں ایک خاص برکت اور نور رکھا ہے اور اس میں رہ کر اللہ تبارک وتعالیٰ یہ توفیق عطا فرما دیتے ہیں، اللہ تعالیٰ اخلاص عطا فرمائے، یہ تنخواہ جو مل رہی ہے یہ تنخواہ نہیں ہے یہ درحقیقت نفقہ ہے اور اس نفقہ پر رہتے ہوئے کام کرو تو اللہ تبارک وتعالیٰ خدمت دین کی توفیق عطا فرما دیتے ہیں۔

میں اپنا ذاتی تجربہ عرض کرتا ہوں اور شاید میرے سارے رفقاء اس کی تائید فرمائیں گے کہ جس زمانہ میں دارالعلوم میں درس جاری رہتا ہے اس زمانہ کا مقابلہ چھٹی کے زمانہ سے کر کے دیکھ لو، جب چھٹی کا زمانہ آتا ہے تو ہم پہلے سے منصوبے بناتے ہیں کہ فلاں فلاں کام کریں گے، لیکن جتنا کام درس کے زمانہ میں ہو جاتا ہے چھٹی کے زمانہ میں نہیں ہوتا۔ اللہ تعالیٰ درس کی وجہ سے برکت عطا فرما دیتے ہیں۔ مدرسہ سے جو کچھ ملتا ہے تنخواہ نہیں ہے۔ نفقہ ہے۔ بقول حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ اس میں رہ کر خدمت انجام دو، اللہ تعالیٰ زیادہ سے زیادہ خدمت کا موقع عطا فرمائیں گے۔ انشاء اللہ۔

کچھ اس دارالعلوم کے بارے میں بھی عرض کرنا چاہتا ہوں۔

اس سال دارالعلوم میں تعلیم حاصل کرنے والوں کی تعداد دو ہزار آٹھ سو پچاس ہے اور قرآن کریم کے جو مکاتیب شہر میں قائم ہیں ان میں طلبہ کی تعداد پانچ چھ ہزار سے زیادہ ہے، دورہ حدیث میں ایک سو اٹھاون طالب علم تھے جو اس سال فارغ التحصیل

ہو رہے ہیں، الحمد للہ! عالم بن رہے ہیں، لوگ پوچھتے ہیں کہ اتنی ساری تعداد کہاں کھپے گی، ایک لفظ زبان زد ہے کہ ان کا کیریئر کیا ہے؟ ان کا مستقبل کیا ہے؟

یہ بات زبان پر اس لیے آگئی کہ دینی مدارس کے بارے میں بہت طوفان مچا ہوا ہے، مجھے ایک واقعہ یاد آ گیا۔

حضرت معروف کرخی رحمۃ اللہ علیہ بڑے درجہ کے اولیاء اللہ میں سے ہیں۔ بغداد میں ان کا مزار ہے، میں بھی الحمد للہ ان کے مزار پر حاضر ہوا ہوں۔ ایک مرتبہ دجلہ کے کنارے اپنے ساتھیوں کے ساتھ جا رہے تھے۔ اسی دوران دریائے دجلہ میں ایک کشتی گزری جس میں کچھ آزاد منش نوجوان سوار تھے اور گاتے بجاتے جا رہے تھے، شوخیوں اور رنگ رلیوں میں مست تھے، کشتی پاس سے گزری تو ویسے بھی بیچارہ مولوی ملامتی فرقہ تو ہے ہی، ان حضرات کو دیکھ کر ان نوجوان کی رگ ظرافت پھڑک اٹھی، کوئی جملہ بھی چست کر دیا، رنگ رلیوں کے دوران کوئی مولوی آ جائے اور اس پر کوئی جملہ کس دیا جائے، اس سے اچھی کیا بات ہے؟ حضرت معروف کرخی رحمۃ اللہ علیہ کے برابر میں جو صاحب تھے، انہوں نے عرض کیا کہ: حضرت یہ اوباش لوگ جو خود تو فسق و فجور میں مبتلا ہیں ہی، یہ اللہ والوں کی شان میں بھی گستاخی کرتے ہیں، آپ ان کے لیے بددعا کر دیجیے۔ حضرت معروف کرخی رحمۃ اللہ علیہ نے ہاتھ اٹھائے اور بارگاہ الٰہی میں عرض کیا:

> ”یا اللہ آپ نے ان نوجوانوں کو دنیاوی مسرتیں عطا فرمائی ہیں یا اللہ ان کو آخرت کی بھی مسرتیں عطا فرما۔“

آپ کا ساتھی کہنے لگا کہ: حضرت آپ نے تو ان کے حق میں بددعا کرنے کے بجائے دعا کر دی۔ حضرت کرخی رحمۃ اللہ علیہ نے جواب دیا کہ میرا کیا نقصان ہوا؟ میں نے تو ان کے لیے آخرت میں مسرتوں کی دعا کی ہے اور آخرت میں مسرتیں تب ہی حاصل ہو سکتی ہیں جب یہ صحیح معنی میں مسلمان اور نیک بنیں۔

تو بھائی! کسی کی نیت خراب ہو تو اللہ ہی جانے، لیکن ظاہر یہ ہے کہ جو آدمی مدرسہ میں دینی تعلیم حاصل کرنے کے لیے آیا تو وہ درحقیقت حضرت معروف کرخی رحمۃ اللہ علیہ کی اس بات پر عمل کرتا ہے کہ میرے دوسرے مسلمان بھائیوں کی جس طرح دنیا بہتر

ہے، اللہ تعالیٰ ان کی آخرت کو بھی بہتر کر دے۔ یہ طلبہ اپنی اور دوسروں کی آخرت بہتر بنانے کے لیے یہاں آتے ہیں یہی ان کا کیریر ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کے مستقبل کو خراب نہیں کرتے۔ ان کو کسی فکر کی ضرورت نہیں، فکر کی بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں اپنے فضل وکرم سے ایمان پر قائم رکھے اور دین کے تقاضوں پر عمل کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

یہ بھی سوچ لیا کریں اور اس سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے کس تائید سے ان اداروں کو نوازا ہے۔ اس دار العلوم کا ماہانہ خرچ لاکھوں روپے میں ہے اور اس کا کوئی بجٹ نہیں بنتا، اتنے بڑے خرچ کا کوئی ادارہ آپ مجھے دکھا دیجیے، جس کا بجٹ نہ بنتا ہو، علاوہ دینی مدارس، اس کا...... بجٹ وہاں بنتا ہے جہاں آمدنی کے ذرائع متعین ہوں۔ آمدنی ہی کے دائرے میں اخراجات کا میزانیہ بنایا جاتا ہے جب کہ ہمیں نہیں معلوم کہ آئندہ کتنی آمدنی ہوگی؟ آج تک کبھی بجٹ کی بنیاد پر کوئی کام نہیں ہوا اور اللہ کے فضل وکرم سے ضرورت کے سب کام ہو جاتے ہیں۔ لوگ پوچھتے ہیں کہ سالانہ اتنا بڑا خرچہ ہے تو آمدنی کیا ہے؟ مستقل آمدنی جس کے بارے میں یقین سے میں بتلا سکوں، کچھ نہیں ہے البتہ کچھ مکانات وقف کے ہیں ان کے کرایہ کی مجموعی آمدنی بمشکل پچاس ساٹھ ہزار کے قریب ہوگی لوگ پوچھتے ہیں کہ کہاں سے آتا ہے؟ میں جواب میں عرض کیا کرتا ہوں کہ۔ مجھے معلوم نہیں کہ کہاں سے آتا ہے۔ واقعہ بھی یہ ہے اور اس میں کوئی مبالغہ نہیں، باقی ساڑھے انیس لاکھ روپے کہاں سے آرہے ہیں اور کس طرح آرہے ہیں، مجھے نہیں معلوم۔

دار العلوم کی طرف سے نہ کوئی اشتہار ہے، نہ کوئی اعلان ہے نہ اپیل کی جاتی ہے کہ دار العلوم کے اندر اتنا خرچ ہوتا ہے آپ اس میں چندہ دیں۔ فون اٹھا کر کسی سے ذکر کرنے کا بھی معمول نہیں ہے۔ ۲۱ شعبان کے مہینے کے اخراجات موجود نہیں ہیں جو بیلنس ہے وہ شعبان کے اخراجات کے لیے بھی کافی نہیں۔ اس وقت بھی کسی سے ذکر نہیں کیا، البتہ ایک دوست اتفاق سے آگئے، ان سے ضمناً ذکر آگیا، پھر معلوم نہیں کہ کیا ہوا؟

البتہ میرے والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ ایک بات سکھا گئے ہیں کہ جب کبھی ایسا موقعہ آئے تو ہاتھ اٹھا کر اللہ تبارک وتعالیٰ سے مانگ لیا کرو، تو الحمد للہ اس کی توفیق ہوئی۔ اللہ

تبارک وتعالیٰ کے سامنے ہاتھ پھیلا دیئے اور مانگ لیا۔ میں نے آنے کے بعد ابھی تک پوچھا بھی نہیں کہ پوزیشن کیا ہے؟ ابھی تک معلوم نہیں، لیکن الحمدللہ ضرورت کا کوئی کام اللہ تبارک وتعالیٰ روکتے نہیں۔ یہ صدقہ ہے ہمارے والد ماجد کے اخلاص کا۔ ان کی نالہ نیم شبی کا، میرے شیخ حضرت ڈاکٹر عبدالحیٰ کی دعاؤں کا اور ان کے اخلاص کا۔

اس میں ہمارا کوئی کمال نہیں ہے۔ اگر ہمارے زور بازو پر چھوڑا جاتا تو اتنا بڑا ادارہ نہیں چل سکتا تھا۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل وکرم سے، ان بزرگوں کی دعاؤں اور اخلاص کے نتیجہ میں الحمدللہ اس کو چلا رہے ہیں۔ اللہ تبارک وتعالیٰ خود اس کے کفیل ہیں۔

میرے والد ماجد رحمتہ اللہ علیہ نے یہ بات فرمادی تھی کہ ہم نے کوئی دوکان نہیں کھولی ہے۔ جس کا ہر دم ہر آن چلتا رہنا ضروری ہو، جب تک اصول صیحہ سے اس کو چلا سکو چلاؤ، جب یہ خیال ہو کہ اصول کو پامال کرنا پڑے گا اور دین کی بے توقیری کرنی پڑے گی۔ اسے تالہ ڈال دینا، بند کردینا، یہ وصیت کر کے تشریف لے گئے۔ الحمدللہ آج تک اللہ تعالیٰ اپنے فضل وکرم سے، اپنی رحمت سے اس کو چلا رہے ہیں یہ مثال دنیا کے کسی ادارہ میں نہیں ملے گی۔ یہ اللہ جل جلالہ کی قدرت کا کرشمہ ہے، جس کو ہر انسان اپنی آنکھوں سے دیکھ سکتا ہے۔ بے شک کوئی آدمی اس میں اصلاحات کی غرض سے کوئی تجویز پیش کرے تو اس کا خیر مقدم کرنے کے لیے تیار ہیں۔

لیکن کوئی شخص یہ چاہے کہ یہ دینی مدرسہ اپنی روش سے ہٹ کر کسی اور طریقے میں تبدیل ہو جائے۔ یہ انشاء اللہ کبھی نہیں ہوگا۔ جب تک ہمارے دم میں دم ہے اور جب تک سانس میں سانس ہے یہ اپنی روش سے نہیں ہٹے گا انشاء اللہ اور جس دن اس کو ہٹانا پڑا، اس دن اس کو بند کردیا جائے گا۔ اللہ تعالیٰ اس کو اس مزاج کے ساتھ قیامت تک قائم رکھے اور اس کو اپنی رضا کے مطابق چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔ میں نے آپ کا وقت لے لیا، لیکن یہ ایک ضروری بات تھی جو ہمارے ماحول اور فضا میں کہنی ضروری تھی۔

میرے طالب علم ساتھی جو اس سال دورہ حدیث سے فارغ ہو رہے ہیں اب آپ یہاں سے فارغ ہونے کے بعد مختلف شعبہ ہائے زندگی میں جائیں گے آپ طالب علم ساتھیوں سے بھی چند باتیں کہنی تھیں مگر حضرت مولانا سبحان محمود صاحب مدظلہم

نے نصیحتیں فرمادی ہیں۔ اب اس کا موقع نہیں ہے لیکن ایک بات آخر میں ذکر کر کے اپنی بات کو ختم کرتا ہوں وہ یہ ہے کہ۔

میرے ساتھیو!

آپ یہاں سے فارغ ہونے کے بعد اب دنیا میں جاؤ گے، اس دنیا میں جاؤ گے جس میں لوگ طعنوں اور اعتراضات کے تیر کمانوں میں چڑھائے ہوئے ہیں، جہاں پہنچو گے وہاں ان تیروں اور طعنوں کی بارش ہوگی لیکن یہ بات دل میں اچھی طرح ذہن نشین کرلو کہ تم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جماعت کے سپاہی ہو۔

میرے بزرگ حضرت شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحب رحمۃ اللہ علیہ ایک مرتبہ اسی مسجد میں بیٹھ کر صرف ایک جملہ فرما گئے تھے۔ وہ اپنے دل پر نقش کرلو، وہ جملہ یہ ہے۔

"طالب علمو! اپنی قدر پہچانو"

"اللہ تبارک وتعالیٰ نے تم کو علم کی دولت سے نوازا ہے، اللہ تعالیٰ نے تم کو اپنے دین کی خدمت کے لیے چنا ہے۔"

یہ نعمت اور یہ عزت تمام دنیا پر بھاری ہے، خواہ دنیا والے کتنے ہی اعتراضات کریں۔ تمہارے دل کے اندر دین کی عزت ہوگی تو اس کو کوئی نہیں مٹا سکے گا۔

اللہ تبارک وتعالیٰ تمہارا حامی و ناصر ہو۔ اس یقین کے ساتھ جاؤ گے تو انشاء اللہ تم ہر جگہ سر بلند ہوگے۔ بشرطیکہ تم نے جو علم یہاں حاصل کیا ہے اس کو اپنی زندگیوں میں اپناؤ اور اس کو دنیا میں پھیلانے اور پہنچانے کی کوشش کرو، اللہ تعالیٰ تمہیں قدم قدم پر اپنی نصرت سے نوازے۔ تمہارے لیے قدم قدم پر کامیابیوں اور کامرانیوں کے دروازے کھولے اور اللہ تعالیٰ ہم سب کو ہمیشہ اپنے دین پر قائم رہنے اور اس علم کی قدر پہچاننے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔ ان الفاظ کے ساتھ میں آپ سے رخصت ہوتا ہوں۔

وآخر دعوانا ان الحمدلله رب العلمين.

مضمون: ۱۲

انتخابی مہم کے منکرات اور ہمارا طرز عمل

ملک میں نئے انتخابات کی آمد آمد ہے اور جو سیاسی سرگرمیاں انتخابات کا لازمہ سمجھی جاتی ہیں وہ دھیرے دھیرے زور پکڑ رہی ہیں۔ یہ مسئلہ تو اپنی جگہ ہے کہ "جمہوریت" کے نام سے جو نظام حکومت اس وقت رائج ہے اور حکمرانوں کے انتخاب کا جو طریقہ اس میں اختیار کیا گیا ہے، وہ کس حد تک اسلامی احکام کے مطابق اور ہمارے قومی اور ملی حالات کے لیے کتنا موزوں ہے؟ اس وقت یہ علمی اور نظریاتی مسئلہ چھیڑنا منظور نہیں، یہ متنازعہ سیاسی موضوع بھی اس وقت زیر بحث لانا مقصود نہیں ہے کہ جو انتخابات اس وقت منعقد ہو رہے ہیں ان کا کوئی جواز تھا یا نہیں؟ لیکن یہ ایک امر واقعہ ہے کہ انتخابات ہونے والے ہیں اور ہر متعلقہ سطح پر ان کی تیاریاں جاری ہیں۔ لہٰذا اس حقیقت واقعہ کو تسلیم کرتے ہوئے اسوقت دو مسئلوں کی طرف قارئین کو متوجہ کرنا پیش نظر ہے۔

پہلا مسئلہ یہ ہے کہ ہمارے ملک میں جب بھی انتخابات کی گہما گہمی شروع ہوتی ہے اور اس معرکے میں حصہ لینے والے انتخابی مہم چلاتے ہیں تو اس مہم کے دوران عموماً شریعت، اخلاق اور بسا اوقات قانون کی بھی کوئی حد سلامت نہیں رہتی اور جو لوگ ہر قیمت پر انتخاب میں کامیابی کو اپنی منزل مقصود بنا کر انتخابی مہم چلاتے ہیں، ان کے بارے میں۔ گستاخی معاف۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے کچھ لوگ آنکھوں پر پٹی باندھ کر ریس لگا رہے ہیں اور انہیں اس بات کی کوئی پرواہ نہیں کہ ہدف کی طرف دوڑتے ہوئے کون کون اور کیا کیا ان کے پاؤں تلے کچلا جا رہا ہے۔

اس صورت حال کا نتیجہ یہ ہے کہ انتخابات کا ہنگامہ ہمارے معاشرے میں بے شمار گناہوں اور بدعنوانیوں کا ایسا طوفان لے کر آتا ہے جس کی ظلمت پورے ماحول پر چھا جاتی ہے اور اس میں شریعت، اخلاق شرافت اور مروت کی بنیادوں پر اتنی متواتر ضربیں

لگتی ہیں کہ پورا ملک لرز کر رہ جاتا ہے۔ ان گناہوں اور بدعنوانیوں کا انتہائی افسوس ناک پہلو یہ ہے کہ دلوں سے ان گناہوں کے گناہ ہونے کا احساس مٹتا جارہا ہے اور اقتدار طلبی کی اس اندھی دوڑ میں سب کچھ شیر مادر بن کر رہ گیا ہے اور چونکہ معاشرے میں ان برائیوں کا چلن کسی روک ٹوک کے بغیر اتنا عام ہو گیا ہے کہ اب کوئی ان برائیوں کے خلاف بولتا بھی نہیں، اس لیے ایسے حضرات کو بھی ان کے برا یا گناہ ہونے کا خیال نہیں آتا، جن کی نیت جان بوجھ کر برائی کرنے کی نہیں ہوتی۔ لہٰذا آج کی محفل میں ایسی ہی چند برائیوں کا ذکر اس جذبے سے کیا جارہا ہے کہ جو اللہ کا بندہ ان سے بچ سکے بچ جائے اور دوسرے حضرات کے دل میں کم از کم ان کے گناہ اور برا ہونے کا احساس پیدا ہو جائے۔

۱۔ انتخابات کے تعلق سے جو گناہ اور منکرات ہمارے ماحول میں پھیلے ہوئے ہیں، ان سب کی بنیادی جڑ تو اقتدار کی ہوس اور کسی منصب تک پہنچنے کی حرص ہے۔ جس کا جواز تلاش کرنے کے لیے بعض اوقات ملک وملت کی خیر خواہی کی معصوم تاویل کر لی جاتی ہے۔ حکومت واقتدار کے بارے میں قرآن وسنت کی ہدایات یہ ہیں کہ وہ کوئی پھولوں کی سیج نہیں ہے جس کی طرف لپکنے میں ایک دوسرے سے آگے نکلنے کی کوشش کی جائے، بلکہ یہ دنیا و آخرت کی ذمہ داری کا وہ جوا ہے جسے گردن پر رکھنے سے پہلے انسان کو لرزنا ضرور چاہیے اور شدید مجبوری کی بغیر اپنے آپ کو اس آزمائش میں نہ ڈالنا چاہیے۔ یہی وجہ ہے کہ جب سیدنا فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ان کے صاحبزادے عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو خلافت کے لیے نامزد کرنے کو کہا گیا تو انہوں نے ایک جواب یہ بھی دیا کہ ذمہ داری کا یہ طوق خطاب کے خاندان میں بس ایک ہی شخص (یعنی خود حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ) کے گلے میں پڑ گیا تو کافی ہے، میں اپنے بیٹے کے گلے کو اس سے گرانبار کرنا نہیں چاہتا۔"

اگر کسی شخص کی دل میں واقعتاً اس گرانبار ذمہ داری کا کما حقہ، احساس ہو تو بے شک اس کا جائز ذرائع سے اقتدار تک پہنچنا ملک وملت کی خیر خواہی کے جذبے سے ہوتا ہے جو اس کی ادا ادا سے جھلکتا ہے اور اس کے نتیجے میں کبھی وہ خرابیاں، بدعنوانیاں اور

گناہ وجود میں نہیں آتے جن کے زہریلے اثرات سے ہماری آج کی سیاسی فضا مسموم ہے۔

لیکن جب اقتدار کو ایک منفعت، ایک لذت اور ایک مادی مفاد سمجھ لیا جائے اور اسے حاصل کرنے کے لیے تن من دھن کی ساری طاقتیں لٹائی جانے لگیں تو یہ اقتدار کی وہ حرص ہے جس کے بطن سے خیر وفلاح برآمد نہیں ہو سکتی، اور اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ وہ گناہوں، برائیوں، خود غرضیوں اور بدعنوانیوں کو جنم دے کر معاشرے میں شر اور فساد پھیلائے۔

۲۔ اسی شر و فساد کا ایک حصہ یہ ہے کہ ہماری انتخابی مہمات میں ایک دوسرے پر الزام تراشی اور بہتان طرازی کو شیر مادر سمجھ لیا گیا ہے۔ اپنے مقابل کو چت کر کے اپنی فتح کا ہاتھ بلند کرنے کے لیے اس پر بلا تحقیق ہر قسم کا الزام عائد کرنا حلال وطیب قرار پا چکا ہے بلکہ یہ اس سیاسی جنگ کا لازمی حصہ ہے جس کے بغیر سیاسی فتح کو ناممکن سمجھا جاتا ہے۔

اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ کوئی شخص کتنا برا ہو، لیکن اس پر کوئی ایسا الزام عائد کرنا ہرگز جائز نہیں ہے جس کی سچائی کی مکمل تحقیق نہ ہو چکی ہو۔ لیکن انتخابی جلسوں کی شاید ہی کوئی تقریر اس قسم کے بلا تحقیق الزامات سے خالی ہوتی ہو جو ''بہتان'' کے گناہ کبیرہ میں داخل ہیں۔ پھر بعض اوقات اس ''بہتان طرازی'' کے لیے اتنی گھٹیا اور بازاری زبان استعمال کی جاتی ہے کہ وہ ''دشنام طرازی'' کا گناہ بھی سمیٹ لیتی ہے، ایک حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی مسلمان کی جان، مال اور آبرو کو کعبۃ اللہ سے بھی زیادہ مقدس قرار دیا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ مسلمان کی جان، مال یا آبرو، پر ناروا حملہ کرنا (معاذ اللہ) کعبے کو ڈھانے سے بھی زیادہ سنگین گناہ ہے لیکن انتخابی مہم کے جوش میں مدمقابل کا کعبہ آبرو گلی گلی میں ڈھایا جاتا ہے اور اخباروں کے صفحات سے لے کر انتخابی جلسوں اور کارنر میٹنگز تک کوئی جگہ ایسی نہیں ہے جو بہتان تراشی اور دشنام طرازی کی عفونت سے بدبودار نہ ہو۔

۳۔ پھر چونکہ انتخابات کا موقع ایسا ہوتا ہے کہ کسی امیدوار کے بارے میں حقائق

منظر عام پر لانے کی واقعی ضرورت بھی ہوتی ہے، تاکہ عوام کو دھوکے اور نقصان سے بچایا جاسکے، اس لیے کسی امیدوار کے حقیقی اوصاف بیان کرنے کی توجیہہ کی جاسکتی ہے، لیکن اس کے لیے اول تو یہ ضروری ہے کہ کوئی بات ضروری تحقیق کے بغیر ناگوار فریضہ صرف بقدر ضرورت ہی انجام دیا جائے، اسے محض مزے لینے اور مجلس آرائی کا ذریعہ نہ بنایا جائے ورنہ اگر وہ بہتان نہ ہو، تب بھی غیبت کے اس گناہ عظیم میں داخل ہے جسے قرآن کریم نے مردہ بھائی کا گوشت کھانے کے مترادف قرار دیا ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ایک مجلس میں کسی شخص نے حجاج بن یوسف کی برائیاں بیان کرنی شروع کردیں۔ حجاج کا ظلم وستم لوگوں میں مشہور تھا، لیکن چونکہ اس مقام پر برائی کرنے کا کوئی صحیح مقصد یا فائدہ نہیں تھا، اس لیے حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ یہ غیبت ہے اور اگر حجاج نے بہت سے لوگوں پر ظلم کیا ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ اب ہر شخص کے لیے اس کی غیبت حلال ہوگئی ہے۔ یاد رکھو کہ اللہ تعالیٰ اگر حجاج کے بے گناہوں کے خون کا حساب لے گا تو دوسرے سے اس کی ناروا غیبت کا بھی حساب لے گا۔

۴۔ دوسروں کی برائی اور ان پر الزام تراشی کے علاوہ انتخاب میں کامیابی کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ منہ بھر بھر کر خود اپنی تعریف اور اپنی خدمات کا مبالغہ آمیز تذکرہ کیا جائے۔ خودنمائی، نام ونمود اور دکھاوے کو مذہب واخلاق کے ہر نظام میں گناہ یا کم از کم برا ضرور سمجھا گیا ہے، لیکن ہماری انتخابی سیاست کے مذہب میں یہ عمل کسی قید وشرط کا پابند نہیں رہا۔

۵۔ عوام کو ووٹ دینے پر مائل کرنے کے لیے یہ بھی لازمی سمجھ لیا گیا ہے کہ ان سے سوچے سمجھے بغیر خوشنما وعدے کیے جائیں۔ وعدہ کرتے وقت اس بات سے بحث نہیں ہوتی کہ ان کو پورا کرنے کا کیا طریقہ ہوگا؟ اور اقتدار حاصل ہونے کے بعد وہ کس طرح روبعمل لائے جاسکیں گے؟ مسئلہ صرف یہ ہے کہ وعدوں کے نیلام میں کس طرح دوسروں سے بڑھ چڑھ کر بولی لگائی جائے؟...... ''ہم برسر اقتدار آکر غریبوں کی قسمت بدل دیں گے''، ''ہم پسماندہ علاقوں کو پیرس

کا نمونہ بنا دیں گے''، ''ہم ہر ضلع میں ایک ہائی کورٹ قائم کر دیں گے''، ''ہم غربت اور جہالت کا خاتمہ کر دیں گے''...... اس قسم کے بلند بانگ دعوے اخباری بیانات سے لے کر تقریروں تک ہر جگہ سنائی دیتے ہیں اور ان جھوٹے دعوں اور وعدوں کے ذریعے سادہ لوح عوام کو بے وقوف بنانے کی کوشش کی جاتی ہے۔

۶۔ جلسے جلوس اور اشتہار بھی انتخابی سرگرمیوں کا ایک لازمی حصہ ہیں اور اگر وہ اخلاق وشرافت کی حدود میں ہوں تو ناجائز بھی نہیں، لیکن جلسوں جلوسوں میں غنڈہ گردی روزمرہ کا معمول بن چکی ہے جس کے نزدیک سیاسی حریفوں کی جان، مال اور آبرو کوئی قیمت نہیں رکھتی۔ چنانچہ جس وقت جس کا داؤ چل جائے وہ دوسروں کو زک پہنچانے میں کسر نہیں چھوڑتا۔

۷۔ پھر بعض اوقات انتخابی جلسے جلوس ایسے عام اور مصروف راستوں پر منعقد کیے جاتے ہیں جن کی وجہ سے شہر کی آبادی کے لیے نقل وحرکت محال ہو جاتی ہے اور ٹریفک کا ایسا مسئلہ کھڑا ہو جاتا ہے جو بے گناہ شہریوں کو عذاب میں مبتلا کر دیتا ہے، نہ جانے کتنے ضعیف اور بیمار لوگ اس قسم کی بدنظمی کی وجہ سے اپنے علاج سے محروم رہ جاتے ہیں کتنے ضرورت منداپنے روزگار تک نہیں پہنچ پاتے اور اس طرح عام گذر گاہوں کو بلاک کر کے نہ جانے کتنے انسانوں کو ناقابل برداشت تکلیف پہنچانے کا گناہ عظیم اس قسم کے جلسوں جلوسوں کے حصے میں آتا ہے۔

۸۔ دیواروں کو انتخابی نعروں سے سیاہ کرنا اور شخصی اور سرکاری عمارتوں پر اشتہارات چسپاں کرنا بھی انتخابی مہم کا جزء لاینفک ہے جس کے نتیجے میں شہر کی بیشتر عمارتیں متضاد نعروں اور اشتہارات سے داغ دار نظر آتی ہیں اور کسی اللہ کے بندے کو یہ خیال نہیں آتا کہ کسی دوسرے کی عمارت کو اس کی مرضی کے بغیر استعمال کر کے اس کا حلیہ بگاڑنا درحقیقت چوری اور غصب کے مترادف ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ کسی دوسرے کی ملکیت کو اس کی خوش دلی کے بغیر استعمال کرنا حلال نہیں، عمارتیں اور دیواریں کسی نہ کسی کی ملکیت ہوتی ہیں اور

ان کو اپنے اشتہار کے لیے استعمال کرنا مالک کی اجازت کے بغیر حرام ہے، چہ جائے کہ ان کو خراب اور بدنما بنانا، لیکن غربت اور جہالت کے خاتمے کے دعویدار بے تکان اس چوری اور غصب کا ارتکاب کرتے ہیں اور اگر کوئی شریف انسان اس عمل سے روکنے کی کوشش کرے تو اسے پتھروں اور فائرنگ کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

۹۔ ووٹوں کی خرید وفروخت اور اس غرض کے لیے لوگوں کو رشوت دینا اور جن لوگوں کے قبضے میں بہت سے ووٹ ہوں، ان کے ناجائز کام کرادینا یا اس کا وعدہ کرلینا ایک مستقل جرم ہے جو خدا اور آخرت سے بے فکر امیدواروں میں بہ کثرت رائج ہے اور اس نے معاشرے کو اخلاقی تباہی کے کنارے لا کھڑا کیا ہے۔

۱۰۔ ظاہر ہے کہ ساری انتخابی مہم چلانے کے لیے ہر جماعت کو کروڑوں روپیہ درکار ہوتا ہے کروڑوں روپے کے اس سرمائے کے حصول کے لیے جو طریقے اختیار کیے جاتے ہیں، ان میں غیر ملکی طاقتوں سے گٹھ جوڑ اور ان کی دی ہوئی لائن پر کام کرنا ایک ایسی بیماری ہے جو ملک کو دیمک کی طرح چاٹ رہی ہے اور جو لوگ باہر سے سرمایہ حاصل نہیں کر پاتے، وہ اپنے ہی ملک کے بڑے بڑے دولت مند افراد سے اپنی جماعتوں کے لیے چندے وصول کرتے ہیں اور بسا اوقات یہ چندہ درحقیقت اس بات کی رشوت ہوتا ہے کہ برسر اقتدار آنے کے بعد چندہ دینے والوں کو خصوصی مراعات دی جائیں گی اور اگر وہ دینے سے انکار کریں تو انہیں طرح طرح سے تنگ کیا جائے گا۔ جو جماعت جتنی زیادہ طاقتور ہے اور اس کے اقتدار میں آنے کے جتنے زیادہ امکانات ہیں، اس کی چندے کی اپیل اتنی ہی زیادہ مؤثر ہے۔

یہ دس موٹے موٹے گناہ محض مثال کے طور پر ذکر کیے گئے ہیں، لیکن اگر آپ باریک بینی سے غور فرمائیں تو نظر آئے گا کہ ان میں سے ہر گناہ بذات خود بہت سے گناہوں کا مجموعہ ہے اور انتخابی مہم کے دوران اسی قسم کے نہ جانے کتنے گناہوں کا ارتکاب دھڑلے سے ہو رہا ہے۔

اب غور فرمائیے! کہ جن حکومتوں کی بنیاد میں جھوٹ، الزام تراشی، بہتان، غیبت، خودستائی، جھوٹے وعدوں، دوسروں کے ساتھ غنڈہ گردی مخلوق خدا کی ایذا رسانی، دوسروں کی املاک پر ناجائز تصرف جیسے عظیم گناہ داخل ہوں، ان سے ملک وملت کو سکھ چین کس طرح نصیب ہو؟ اور جس ماحول میں ان گناہوں کی ظلمت چھائی ہوئی ہو، وہاں سے خیر وفلاح کی روشنی نمودار ہونے کی کیا توقع رکھی جائے؟

لیکن ان گذارشات کا مقصد محض تنقید برائے تنقید نہیں، نہ اس کا منشایہ ہے کہ لوگوں میں مایوسی پھیلائی جائے۔ بلکہ مقصد صرف یہ ہے کہ کم از کم ہم اپنی بیماریوں سے آگاہ ہوں اور ان میں سے جس کسی بیماری کا سدباب اپنی قدرت میں ہو، اس سے دریغ نہ کریں اور کم از کم عام مسلمان ان گناہوں سے محفوظ رہنے کا اہتمام کریں جن میں وہ بعض اوقات نادانستہ طور پر مبتلا ہو جاتے ہیں۔ یہ سمجھنا چاہیے کہ اس ہنگامہ خیز طوفان میں ایک تنہا شخص خود کسی برائی سے رک جائے تو اس سے معاشرے پر مجموعی طور سے کیا اثر پڑ جائے گا؟

یاد رکھئے! کہ معاشرے سے گندگی جس چھوٹی سے چھوٹی مقدار میں بھی کم ہو، غنیمت ہے اور معاشرہ درحقیقت افراد ہی کے مجموعے سے عبارت ہے، یہاں چراغ سے چراغ جلتا ہے، لہٰذا بعض اوقات کسی ایک شخص کا عزم وہمت بھی معاشرے کی تبدیلی میں فیصلہ کن کردار ادا کرسکتا ہے۔

ہر فرد ہے ملت کے مقدر کا ستارا

دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ موجودہ انتخابات میں ایک عام مسلمان کے لیے راہ عمل کیا ہے؟ کیا انتخابات میں اچھلنے والی اس گندکو دیکھتے ہوئے یہ بہتر ہے کہ انسان اس ہنگامے سے مکمل یکسوئی اختیار کرے اور اپنا ووٹ بھی نہ ڈالے؟...... ہمارے نزدیک اس سوال کا جواب نفی میں ہے، یہ درست ہے کہ سیاسی فضا بدعنوانیوں کے گرد وغبار سے اَٹی ہوئی ہے، یہ بھی درست ہے کہ ملک کی سیاسی افق پر امید کی کوئی ایسی کرن نظر نہیں آرہی جسے دیکھ کر ایک عام مسلمان مطمئن ہو سکے، لیکن یہ بھی اپنی جگہ حقیقت ہے کہ جو کچھ اوپر عرض کیا گیا ہے وہ مجموعی سیاسی فضا کے اعتبار سے عرض کیا گیا ہے اور اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ دنیا اچھائی سے بالکل خالی ہوگئی ہے، ظاہر ہے کہ بعض افراد اس مجموعی صورت

حال سے مستثنیٰ بھی ضرور ہوں گے اور انہیں تلاش کرنے کی ضرورت ہے۔ دوسرے ایک مسلمان کا کام مایوس ہو کر بے عمل ہو جانا نہیں، بلکہ اپنی بساط اور اپنی مقدور کی حد تک اپنا فرض ادا کرنا ہے، اس فریضے کی ادائیگی کے بعد نتائج اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہیں۔

انتخابات کی فضاء میں پائی جانے والی مذکورہ بالا خرابیوں کے باوجود بہر صورت! یہ ایک ایسا موقع ہے جس میں ہر ووٹر اتنا کر سکتا ہے کہ وہ اپنے ووٹ کا وزن اس شخص کے پلڑے میں ڈال دے جس کو وہ ملک و ملت کے لیے نسبتاً بہتر سمجھتا ہو۔ چنانچہ اس موقع سے ہر ووٹر کو فائدہ اٹھانا چاہیے اور اپنا ووٹ دیانتداری کے ساتھ صحیح جگہ استعمال کر کے اپنا فریضہ ادا کر دینا چاہیے۔

ووٹ کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ اس موضوع پر ایک مضمون البلاغ کے اسی شمارے میں الگ شائع ہو رہا ہے، لیکن اس کا خلاصہ یہ ہے کہ ووٹ کی حیثیت شرعی اعتبار سے ایک شہادت اور گواہی کی ہے، غلط جگہ ووٹ دینے میں جھوٹی گواہی کا سخت گناہ ہے اور اگر کسی ووٹر کے حلقے میں کوئی واقعتاً اہل شخص موجود ہے، تو اس کو ووٹ نہ دینے میں گواہی چھپانے کا گناہ ہے، لہٰذا اگر کسی حلقے میں کوئی ایسا امیدوار موجود ہے جس کو ایک ووٹر پوری دیانت داری سے تمام امیدواروں میں سب سے بہتر سمجھتا ہے اور جس کی کامیابی میں ملک و ملت کا فائدہ دیکھتا ہے تو اس کو ووٹ دینا شرعاً بھی ضروری ہے، تاکہ گواہی چھپانے کا گناہ نہ ہو اور اگر کوئی شخص بھی کلی طور پر تو اہل نہیں ہے، لیکن ایک شخص زیادہ برا ہے اور دوسرا کم برا، تب بھی بڑی برائی کو روکنے کے لیے چھوٹی برائی کو اختیار کر لینا شریعت کا ایک اصول ہے، چنانچہ ایسی صورت میں بڑی برائی کو روکنے کی ہر ممکن کوشش کرنی چاہیے، خواہ اس کے لیے ایسے شخص کو ووٹ دینا پڑے جو پوری طرح اہل نہیں، لیکن اس کی برائی بڑی برائی کے مقابلے میں کم ہے۔ ہاں! اگر کسی جگہ تمام امیدوار یکساں حیثیت کے حامل ہیں اور کسی کو کسی پر فوقیت دینا ممکن نہیں ہے تو ایسی صورت میں بے شک خاموشی بہتر ہے اور ایسے موقع پر یہ جائز اور درست ہے کہ کسی کو بھی ووٹ نہ دیا جائے۔

ان اصولوں کو مد نظر رکھتے ہوئے اپنے ووٹ کا فیصلہ کرنا ہر مسلمان کے لیے ضروری ہے اور اس فیصلے پر پہنچنے کے لیے ہر ممکن تحقیق، تفتیش اور ملک و ملت کے مجموعی

حالات کو مدنظر رکھنا بھی ضروری ہے۔ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو وہ فیصلہ کرنے کی توفیق عطا فرمائے جس میں ملک وملت کے لیے دین ودنیا کی بہتری ہو۔ آمین۔

وما علینا الا البلاغ۔

محمد تقی عثمانی۔

۲۵ ربیع الاول ۱۴۱۴ھ۔

مضمون:۱۳

یہ ناچ گانا بند کیجیے

اس وقت روز نامہ جنگ لاہور کی ہفتہ ۱۰ر جنوری ۱۹۸۷ء کی اشاعت ہمارے پیش نظر ہے اور اس میں ایک انتہائی شرم ناک خبر پڑھ کر ذہن اس حالت سے دوچار ہے جس میں اسے رنج واذیت کے اظہار کے لیے الفاظ میسر نہیں آتے۔ دکھے ہوئے دل سے بے ساختہ یہ کلمات ابھر۔نے ہیں کہ یا اللہ! ہم کہاں پہنچ گئے ہیں؟ اور صبح سے لے کر شام تک ''اسلام''، ''اسلام'' کی رٹ لگانے کے باوجود عملی اعتبار سے اخلاقی دیوالیہ پن کی کن کن پستیوں میں گرے ہوئے ہیں؟

خبر کی تلخیص کرنے سے اس کے پورے مضمرات کا شاید اندازہ نہیں ہو سکے گا، اس لیے ذیل میں یہ خبر ''جنگ'' ہی کے الفاظ میں من وعن پیش خدمت ہے:۔

بازار حسن میں ناچ گانا پھر شروع ہوگیا:

ناچ گانے والیاں بالکونیوں میں کھڑی نہیں ہوں گی، دروازوں پر پردے لٹکائیں گی، پولیس حکام کے ساتھ مذاکرات میں فیصلہ ہم نے آرٹ کونسلوں سے زیادہ فن کی خدمت کی ہے، بازار حسن کے نمائندوں کا موقف۔

لاہور: (رپورٹنگ ڈیسک، نمائندہ جنگ) گذشتہ رات ٹبی پولیس اور بازار حسن کی نمائندہ تنظیم کے عہدیداروں کے مابین مذاکرات کے نتیجے میں ٹبی کے علاقے میں ناچ گانے کا کاروبار مشروط طور پر شروع ہوگیا۔ مذاکرات میں ڈی ایس پی چودھری غلام رسول، ایس ایچ او ٹبی سید پرویز شاہ کے مطابق یہ تو درحقیقت انسان کی روحانی تسکین کا ایک ذریعہ ہے۔

روحانی تسکین کے لیے انسان جس مذہب کو بہتر سمجھے اختیار کرلے۔ کسی کو بت پرستی میں زیادہ مزہ آتا ہے اسی میں اس کو زیادہ سکون ملتا ہے وہ اس کو اختیار کرلے اور

اگر کسی کو توحید میں زیادہ سکون ملتا ہے تو وہ اس کو اختیار کر لے...... سوال حق و باطل کا نہیں کہ کون سا مذہب حق ہے اور کون سا باطل ہے بلکہ یہ ہے کہ کس مذہب میں اس شخص کو زیادہ روحانی سکون محسوس ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے جو شخص بھی جو مذہب اختیار کر لیتا ہے وہ قابل احترام ہے اور اس میں کسی دوسرے کو دخل اندازی کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ چونکہ ذاتی اور پرائیویٹ زندگی کا معاملہ ہے لٰہذا زندگی کے دوسرے شعبوں میں اس کے عمل دخل کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔

لادینی جمہوریت کا نظریہ:

یہیں سے یہ نظریہ وجود میں آیا جس کو آج کی اصطلاح میں سیکولرازم کہتے ہیں ...... اس نظریۂ زندگی کا خلاصہ یہ ہے کہ جہاں تک زندگی کے اجتماعی کام ہیں معیار اور سیاست وغیرہ یہ ہر مذہب سے آزاد ہیں اور انسانی عقل، تجربہ، مشاہدہ اور جمہوری اقدار جس طریقے کو لیں ہر معاشرے میں وہ طریقہ اختیار کرنا چاہیے...... مذہب کی ان کے اوپر کوئی بالادستی نہیں ہوتی اور جہاں تک ذاتی زندگی کا سوال ہے تو جو شخص جس مذہب میں سکون پائے وہ مذہب اختیار کر لے کسی کو یہ کہنے کا حق نہیں کہ تمہارا یہ مذہب باطل ہے...... ہر شخص اپنے مذہب پر عمل کرنے میں آزاد ہے اس وجہ سے نہیں کہ وہ حق ہے، بلکہ اس وجہ سے کہ اس میں اس کو راحت وسکون میسر آتا ہے...... ان الفاظ میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ مذہب کا تصور آج مغربی نظریات کے تحت یہ ہے کہ "مذہب کی کوئی حقیقت نہیں" بلکہ لطف وسکون کے حصول کا ایک ذریعہ ہے...... ایک شخص کو اگر اپنے دنیاوی مشاغل کے فرصت کے وقت بندروں کے تماشے کو دیکھ کر ذہنی سکون ملتا ہے تو اس کے لیے بندروں کا تماشہ اچھی چیز ہے اور جس طرح بندروں کے تماشے کا حقیقی زندگی سے کوئی تعلق نہیں اسی طرح اگر کسی کو مسجد میں جا کر نماز میں لطف آتا ہے اور سکون ملتا ہے تو اس کے لیے یہی طریقہ مناسب ہے لیکن اس کا حقیقی زندگی سے کوئی تعلق یعنی اس سے بحث نہیں کہ مسجد میں جا کر نماز پڑھنا فی نفسہ حق ہے؟ یا باطل؟ (العیاذ باللہ) یہ ہوا ہے جو اس وقت پوری مغربی دنیا کے اوپر چھایا ہوا ہے...... اور اسی کا دوسرا نام ہے سیکولر ڈیموکریسی لادینی جمہوریت......

آخری نظریہ:

اوراب تو بغلیں بجائی جارہی ہیں کہ دنیا کے اندر ہر نظام فیل ہوگیا ہے، اب صرف آخری نظریہ جو کبھی فیل ہونے والا نہیں ہے وہ یہی سیکولر ڈیموکریسی ہے۔ اسی موضوع پر امریکہ سے ایک کتاب شائع کی گئی ہے جو ساری دنیا کے اندر بڑی دلچسپی کے ساتھ پڑھی جارہی ہے...... لاھوں کی تعداد میں اس کے نسخے فروخت ہو چکے ہیں اور اس کو اس دور کی عظیم ترین کتاب کی حیثیت سے متعارف کرایا جارہا ہے یہ کتاب امریکی وزارت خارجہ کے ترجمان نے ایک تحقیقی مقالے کی شکل میں لکھی ہے جس کا نام ہے۔ "THE END OF THE HISTORY AND THE LAST MAN" یعنی تاریخ کا خاتمہ اور آخری آدمی...... اس کا پورا محاصل یہ ہے کہ سوویت یونین کے خاتمے پر ایک تاریخ کا خاتمہ ہوگیا ہے اور آخری انسان جو ہر لحاظ سے مکمل ہے وہ وجود میں آ گیا ہے...... یعنی سیکولر ڈیموکریسی کا نظریہ ثابت ہوگیا ہے اور اب رہتی دنیا تک اس سے بہتر کوئی نظام یا نظریہ وجود میں نہیں آئے گا۔

ہم پر الزام ہے کہ اسلام تلوار کے زور سے پھیلا:

جب مغربی استعمار نے اسلامی ملکوں پر اپنا تسلط جمایا تو اس نے اپنی لادینی جمہوریت کا تصور بھی پھیلایا اور بزور شمشیر پھیلایا مسلمانوں پر یہ الزام تھا کہ انہوں نے اسلام تلوار کے زور پر پھیلایا، حالانکہ خود مغرب نے اپنا ڈیموکریسی کا نظام زبردستی اور بزور شمشیر پھیلایا ہے، اسی کی طرف اکبر مرحوم نے اپنے مشہور قطعے میں اشارہ کیا تھا کہ

اپنے عیبوں کی کیا آپ کو کچھ پرواہ ہے
غلط الزام بھی اوروں پہ لگا رکھا ہے
یہی فرماتے رہیں تیغ سے پھیلا اسلام
یہ نہ ارشاد ہوا توپ سے کیا پھیلا ہے

توپ وتفنگ کے بل بوتے پر انہوں نے پہلے سیاسی تسلط قائم کیا اس کے بعد رفتہ رفتہ سیاسی اور معاشی اداروں سے دین کا رابطہ توڑا...... اور اس رابطے کو توڑنے کے لیے ایسا تعلیمی نظام وجود میں لائے جو ہندوستان میں لارڈ میکالے نے متعارف کرایا اور کھلم

ہورہے ہیں، الحمدللہ! عالم بن رہے ہیں، لوگ پوچھتے ہیں کہ اتنی ساری تعداد کہاں کھپے گی، ایک لفظ زبان زدہے کہ ان کا کیریئر کیا ہے؟ ان کا مستقبل کیا ہے؟

یہ بات زبان پر اس لیے آگئی کہ دینی مدارس کے بارے میں بہت طوفان مچا ہوا ہے، مجھے ایک واقعہ یاد آگیا۔

حضرت معروف کرخی رحمۃ اللہ علیہ بڑے درجہ کے اولیاء اللہ میں سے ہیں۔ بغداد میں ان کا مزار ہے، میں بھی الحمدللہ ان کے مزار پر حاضر ہوا ہوں۔ ایک مرتبہ دجلہ کے کنارے اپنے ساتھیوں کے ساتھ جارہے تھے۔ اسی دوران دریائے دجلہ میں ایک کشتی گزری جس میں کچھ آزاد منش نوجوان سوار تھے اور گاتے بجاتے جارہے تھے، شوخیوں اور رنگ رلیوں میں مست تھے، کشتی پاس سے گزری تو ویسے بھی بیچارہ مولوی ملامتی فرقہ تو ہے ہی، ان حضرات کو دیکھ کر ان نوجوان کی رگ ظرافت پھڑک اٹھی، کوئی جملہ بھی چست کردیا، رنگ رلیوں کے دوران کوئی مولوی آجائے اور اس پر کوئی جملہ کس دیا جائے، اس سے اچھی کیا بات ہے؟ حضرت معروف کرخی رحمۃ اللہ علیہ کے برابر میں جو صاحب تھے، انہوں نے عرض کیا کہ: حضرت یہ اوباش لوگ جو خود تو فسق وفجور میں مبتلا ہیں ہی، یہ اللہ والوں کی شان میں بھی گستاخی کرتے ہیں، آپ ان کے لیے بددعا کردیجیے۔ حضرت معروف کرخی رحمۃ اللہ علیہ نے ہاتھ اٹھائے اور بارگاہ الٰہی میں عرض کیا:

''یا اللہ آپ نے ان نوجوانوں کو دنیاوی مسرتیں عطا فرمائی ہیں یا اللہ ان کو آخرت کی بھی مسرتیں عطا فرما۔''

آپ کا ساتھی کہنے لگا کہ: حضرت آپ نے تو ان کے حق میں بددعا کرنے کے بجائے دعا کردی۔ حضرت کرخی رحمۃ اللہ علیہ نے جواب دیا کہ میرا کیا نقصان ہوا؟ میں نے تو ان کے لیے آخرت میں مسرتوں کی دعا کی ہے اور آخرت میں مسرتیں تب ہی حاصل ہوسکتی ہیں جب یہ صحیح معنی میں مسلمان اور نیک بنیں۔

تو بھائی! کسی کی نیت خراب ہو تو اللہ ہی جانے، لیکن ظاہر یہ ہے کہ جو آدمی مدرسہ میں دینی تعلیم حاصل کرنے کے لیے آیا تو وہ درحقیقت حضرت معروف کرخی رحمۃ اللہ علیہ کی اس بات پر عمل کرتا ہے کہ میرے دوسرے مسلمان بھائیوں کی جس طرح دنیا بہتر

ہے، اللہ تعالیٰ ان کی آخرت کو بھی بہتر کردے۔ یہ طلبہ اپنی اور دوسروں کی آخرت بہتر بنانے کے لیے یہاں آتے ہیں یہی ان کا کیریئر ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کے مستقبل کو خراب نہیں کرتے۔ ان کو کسی فکر کی ضرورت نہیں، فکر کی بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں اپنے فضل وکرم سے ایمان پر قائم رکھے اور دین کے تقاضوں پر عمل کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

یہ بھی سوچ لیا کریں اور اس سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے کس تائید سے ان اداروں کو نوازا ہے۔ اس دارالعلوم کا ماہانہ خرچ لاکھوں روپے میں ہے اور اس کا کوئی بجٹ نہیں بنتا، اتنے بڑے خرچ کا کوئی ادارہ آپ مجھے دکھا دیجیے، جس کا بجٹ نہ بنتا ہو، علاوہ دینی مدارس، اس کا...... بجٹ وہاں بنتا ہے جہاں آمدنی کے ذرائع متعین ہوں۔ آمدنی ہی کے دائرے میں اخراجات کا میزانیہ بنایا جاتا ہے جب کہ ہمیں نہیں معلوم کہ آئندہ کتنی آمدنی ہوگی؟ آج تک کبھی بجٹ کی بنیاد پر کوئی کام نہیں ہوا اور اللہ کے فضل وکرم سے ضرورت کے سب کام ہو جاتے ہیں۔ لوگ پوچھتے ہیں کہ سالانہ اتنا بڑا خرچہ ہے تو آمدنی کیا ہے؟ مستقل آمدنی جس کے بارے میں یقین سے میں بتلا سکوں، کچھ نہیں ہے البتہ کچھ مکانات وقف کے ہیں ان کے کرایہ کی مجموعی آمدنی بمشکل پچاس ساٹھ ہزار کے قریب ہوگی لوگ پوچھتے ہیں کہ کہاں سے آتا ہے؟ میں جواب میں عرض کیا کرتا ہوں کہ۔ مجھے معلوم نہیں کہ کہاں سے آتا ہے۔ واقعۃ بھی یہ ہے اور اس میں کوئی مبالغہ نہیں، باقی ساڑھے انیس لاکھ روپے کہاں سے آرہے ہیں اور کس طرح آرہے ہیں، مجھے نہیں معلوم۔

دارالعلوم کی طرف سے نہ کوئی اشتہار ہے، نہ کوئی اعلان ہے نہ اپیل کی جاتی ہے کہ دارالعلوم کے اندر اتنا خرچ ہوتا ہے آپ اس میں چندہ دیں۔ فون اٹھا کر کسی سے ذکر کرنے کا بھی معمول نہیں ہے۔ ۲۱ شعبان کے مہینے کے اخراجات موجود نہیں ہیں جو بیلنس ہے وہ شعبان کے اخراجات کے لیے بھی کافی نہیں۔ اس وقت بھی کسی سے ذکر نہیں کیا، البتہ ایک دوست اتفاق سے آگئے، ان سے ضمناً ذکر آ گیا، پھر معلوم نہیں کہ کیا ہوا؟

البتہ میرے والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ ایک بات سکھا گئے ہیں کہ جب کبھی ایسا موقعہ آئے تو ہاتھ اٹھا کر اللہ تبارک وتعالیٰ سے مانگ لیا کرو، تو الحمد للہ اس کی توفیق ہوئی۔ اللہ

تبارک وتعالیٰ کے سامنے ہاتھ پھیلا دیئے اور مانگ لیا۔ میں تو آنے کے بعد ابھی تک پوچھا بھی نہیں کہ پوزیشن کیا ہے؟ ابھی تک معلوم نہیں، لیکن الحمدللہ ضرورت کا کوئی کام اللہ تبارک وتعالیٰ روکتے نہیں۔ یہ صدقہ ہے ہمارے والد ماجد کے اخلاص کا۔ ان کی نالہ نیم شبی کا، میرے شیخ حضرت ڈاکٹر عبدالحیٔ کی دعاؤں کا اور ان کے اخلاص کا۔

اس میں ہمارا کوئی کمال نہیں ہے۔ اگر ہمارے زور بازو پر چھوڑا جاتا تو اتنا بڑا ادارہ نہیں چل سکتا تھا۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل وکرم سے، ان بزرگوں کی دعاؤں اور اخلاص کے نتیجہ میں الحمدللہ اس کو چلا رہے ہیں۔ اللہ تبارک وتعالیٰ خود اس کے کفیل ہیں۔

میرے والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ نے یہ بات فرمادی تھی کہ ہم نے کوئی دوکان نہیں کھولی ہے۔ جس کا ہردم ہرآن چلتا رہنا ضروری ہو، جب تک اصول صحیحہ سے اس کو چلا سکو چلاؤ، جب یہ خیال ہو کہ اصول کو پامال کرنا پڑے گا اور دین کی بے توقیری کرنی پڑے گی۔ اسے تالہ ڈال دینا، بند کردینا، یہ وصیت کر کے تشریف لے گئے۔ الحمدللہ آج تک اللہ تعالیٰ اپنے فضل وکرم سے، اپنی رحمت سے اس کو چلا رہے ہیں یہ مثال دنیا کے کسی ادارہ میں نہیں ملے گی۔ یہ اللہ جل جلالہ کی قدرت کا کرشمہ ہے، جس کو ہر انسان اپنی آنکھوں سے دیکھ سکتا ہے۔ بے شک کوئی آدمی اس میں اصلاحات کی غرض سے کوئی تجویز پیش کرے تو اس کا خیر مقدم کرنے کے لیے تیار ہیں۔

لیکن کوئی شخص یہ چاہے کہ یہ دینی مدرسہ اپنی روش سے ہٹ کر کسی اور طریقے میں تبدیل ہوجائے۔ یہ انشاء اللہ کبھی نہیں ہوگا۔ جب تک ہمارے دم میں دم ہے اور جب تک سانس میں سانس ہے یہ اپنی روش سے نہیں ہٹے گا انشاء اللہ اور جس دن، ن کو ہٹانا پڑا، اس دن اس کو بند کردیا جائے گا۔ اللہ تعالیٰ اس کو اس مزاج کے ساتھ قیامت تک قائم رکھے اور اس کو اپنی رضا کے مطابق چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔ میں نے آپ کا وقت لے لیا، لیکن یہ ایک ضروری بات تھی جو ہمارے ماحول اور فضا میں کہنی ضروری تھی۔

میرے طالب علم ساتھی جو اس سال دورہ حدیث سے فارغ ہورہے ہیں اب آپ یہاں سے فارغ ہونے کے بعد مختلف شعبہ ہائے زندگی میں جائیں گے آپ طالب علم ساتھیوں سے بھی چند باتیں کہنی تھیں مگر حضرت مولانا سبحان محمود صاحب مدظلہم

نے نصیحتیں فرمادی ہیں۔اب اس کا موقع نہیں ہے لیکن ایک بات آخر میں ذکر کر کے اپنی بات کو ختم کرتا ہوں وہ یہ ہے کہ۔

میرے ساتھیو!

آپ یہاں سے فارغ ہونے کے بعد اب دنیا میں جاؤ گے،اس دنیا میں جاؤ گے جس میں لوگ طعنوں اور اعتراضات کے تیر کمانوں میں چڑھائے ہوئے ہیں، جہاں پہنچو گے وہاں ان تیروں اور طعنوں کی بارش ہوگی لیکن یہ بات دل میں اچھی طرح ذہن نشین کرلو کہ تم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جماعت کے سپاہی ہو۔

میرے بزرگ حضرت شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحب رحمۃ اللہ علیہ ایک مرتبہ اسی مسجد میں بیٹھ کر صرف ایک جملہ فرما گئے تھے۔وہ اپنے دل پر نقش کرلو، وہ جملہ یہ ہے۔

''طالب علمو! اپنی قدر پہچانو''

''اللہ تبارک وتعالیٰ نے تم کو علم کی دولت سے نوازا ہے، اللہ تعالیٰ نے تم کو اپنے دین کی خدمت کے لیے چنا ہے۔''

یہ نعمت اور یہ عزت تمام دنیا پر بھاری ہے، خواہ دنیا والے کتنے ہی اعتراضات کریں۔تمہارے دل کے اندر دین کی عزت ہوگی تو اس کو کوئی نہیں مٹا سکے گا۔

اللہ تبارک وتعالیٰ تمہارا حامی وناصر ہو۔اس یقین کے ساتھ جاؤ گے تو انشاء اللہ تم ہر جگہ سربلند ہوگے۔ بشرطیکہ تم نے جو علم یہاں حاصل کیا ہے اس کو اپنی زندگیوں میں اپناؤ اور اس کو دنیا میں پھیلانے اور پہنچانے کی کوشش کرو، اللہ تعالیٰ تمہیں قدم قدم پر اپنی نصرت سے نوازے۔تمہارے لیے قدم قدم پر کامیابیوں اور کامرانیوں کے دروازے کھولے اور اللہ تعالیٰ ہم سب کو ہمیشہ اپنے دین پر قائم رہنے اور اس علم کی قدر پہنچاننے کی توفیق عطا فرمائے۔آمین۔ان الفاظ کے ساتھ میں آپ سے رخصت ہوتا ہوں۔

وآخر دعوانا ان الحمدلله رب العلمين.

مضمون: ۱۲

انتخابی مہم کے منکرات اور ہمارا طرز عمل

ملک میں نئے انتخابات کی آمد آمد ہے اور جو سیاسی سرگرمیاں انتخابات کا لازمہ سمجھی جاتی ہیں وہ دھیرے دھیرے زور پکڑ رہی ہیں۔ یہ مسئلہ تو اپنی جگہ ہے کہ ''جمہوریت'' کے نام سے جو نظام حکومت اس وقت رائج ہے اور حکمرانوں کے انتخاب کا جو طریقہ اس میں اختیار کیا گیا ہے، وہ کس حد تک اسلامی احکام کے مطابق اور ہمارے قومی اور ملی حالات کے لیے کتنا موزوں ہے؟ اس وقت یہ علمی اور نظریاتی مسئلہ چھیڑنا منظور نہیں، یہ متنازعہ سیاسی موضوع بھی اس وقت زیر بحث لانا مقصود نہیں ہے کہ جو انتخابات اس وقت منعقد ہو رہے ہیں ان کا کوئی جواز تھا یا نہیں؟ لیکن یہ ایک امر واقعہ ہے کہ انتخابات ہونے والے ہیں اور ہر متعلقہ سطح پر ان کی تیاریاں جاری ہیں۔ لہٰذا اس حقیقت واقعہ کو تسلیم کرتے ہوئے اسوقت دو مسئلوں کی طرف قارئین کو متوجہ کرنا پیش نظر ہے۔

پہلا مسئلہ یہ ہے کہ ہمارے ملک میں جب بھی انتخابات کی گہما گہمی شروع ہوتی ہے اور اس معرکے میں حصہ لینے والے انتخابی مہم چلاتے ہیں تو اس مہم کے دوران عموماً شریعت، اخلاق اور بسا اوقات قانون کی بھی کوئی حد سلامت نہیں رہتی اور جو لوگ ہر قیمت پر انتخاب میں کامیابی کو اپنی منزل مقصود بنا کر انتخابی مہم چلاتے ہیں، ان کے بارے میں۔ گستاخی معاف۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے کچھ لوگ آنکھوں پر پٹی باندھ کر ریس لگا رہے ہیں اور انہیں اس بات کی کوئی پرواہ نہیں کہ ہدف کی طرف دوڑتے ہوئے کون کون اور کیا کیا ان کے پاؤں تلے کچلا جا رہا ہے۔

اس صورت حال کا نتیجہ یہ ہے کہ انتخابات کا ہنگامہ ہمارے معاشرے میں بے شمار گناہوں اور بدعنوانیوں کا ایسا طوفان لے کر آتا ہے جس کی ظلمت پورے ماحول پر چھا جاتی ہے اور اس میں شریعت، اخلاق شرافت اور مروت کی بنیادوں پر اتنی متواتر ضربیں

لگتی ہیں کہ پورا ملک لرز کر رہ جاتا ہے۔ ان گناہوں اور بدعنوانیوں کا انتہائی افسوس ناک پہلو یہ ہے کہ دلوں سے ان گناہوں کے گناہ ہونے کا احساس مٹتا جارہا ہے اور اقتدار طلبی کی اس اندھی دوڑ میں سب کچھ شیر مادر بن کر رہ گیا ہے اور چونکہ معاشرے میں ان برائیوں کا چلن کسی روک ٹوک کے بغیر اتنا عام ہوگیا ہے کہ اب کوئی ان برائیوں کے خلاف بولتا بھی نہیں، اس لیے ایسے حضرات کو بھی ان کے برا یا گناہ ہونے کا خیال نہیں آتا، جن کی نیت جان بوجھ کر برائی کرنے کی نہیں ہوتی۔ لہٰذا آج کی محفل میں ایسی ہی چند برائیوں کا ذکر اس جذبے سے کیا جارہا ہے کہ جو اللہ کا بندہ ان سے بچ سکے بچ جائے اور دوسرے حضرات کے دل میں کم از کم ان کے گناہ اور برا ہونے کا احساس پید اہو جائے۔

۱۔ انتخابات کے تعلق سے جو گناہ اور منکرات ہمارے ماحول میں پھیلے ہوئے ہیں، ان سب کی بنیادی جڑ تو اقتدار کی ہوس اور کسی منصب تک پہنچنے کی حرص ہے۔ جس کا جواز تلاش کرنے کے لیے بعض اوقات ملک وملک و ملت کی خیر خواہی کی معصوم تاویل کرلی جاتی ہے۔ حکومت و اقتدار کے بارے میں قرآن وسنت کی ہدایات یہ ہیں کہ وہ کوئی پھولوں کی سیج نہیں ہے جس کی طرف لپکنے میں ایک دوسرے سے آگے نکلنے کی کوشش کی جائے، بلکہ یہ دنیا و آخرت کی ذمہ داری کا وہ جوا ہے جسے گردن پر رکھنے سے پہلے انسان کو لرزنا ضرور چاہیے اور شدید مجبوری کی بغیر اپنے آپ کو اس آزمائش میں نہ ڈالنا چاہیے۔ یہی وجہ ہے کہ جب سیدنا فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ان کے صاحبزادے عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو خلافت کے لیے نامزد کرنے کو کہا گیا تو انہوں نے ایک جواب یہ بھی دیا کہ ذمہ داری کا یہ طوق خطاب کے خاندان میں بس ایک ہی شخص (یعنی خود حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ) کے گلے میں پڑ گیا تو کافی ہے، میں اپنے بیٹے کے گلے کو اس سے گرانبار کرنا نہیں چاہتا۔"

اگر کسی شخص کی دل میں واقعتاً اس گرانبار ذمہ داری کا کما حقہ، احساس ہو تو بے شک اس کا جائز ذرائع سے اقتدار تک پہنچنا ملک وملت کی خیر خواہی کے جذبے سے ہوتا ہے جو اس کی ادا ادا سے جھلکتا ہے اور اس کے نتیجے میں کبھی وہ خرابیاں، بدعنوانیاں اور

گناہ وجود میں نہیں آتے جن کے زہریلے اثرات سے ہماری آج کی سیاسی فضا مسموم ہے۔

لیکن جب اقتدار کو ایک منفعت، ایک لذت اور ایک مادی مفاد سمجھ لیا جائے اور اسے حاصل کرنے کے لیے تن من دھن کی ساری طاقتیں لٹائی جانے لگیں تو یہ اقتدار کی وہ حرص ہے جس کے بطن سے خیر وفلاح برآمد نہیں ہو سکتی، اور اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ وہ گناہوں، برائیوں، خودغرضیوں اور بدعنوانیوں کو جنم دے کر معاشرے میں شر اور فساد پھیلائے۔

۲۔ اسی شر وفساد کا ایک حصہ یہ ہے کہ ہماری انتخابی مہمات میں ایک دوسرے پر الزام تراشی اور بہتان طرازی کو شیر مادر سمجھ لیا گیا ہے۔ اپنے مقابل کو چت کر کے اپنی فتح کا ہاتھ بلند کرنے کے لیے اس پر بلا تحقیق ہر قسم کا الزام عائد کرنا حلال وطیب قرار پا چکا ہے بلکہ یہ اس سیاسی جنگ کا لازمی حصہ ہے جس کے بغیر سیاسی فتح کو ناممکن سمجھا جاتا ہے۔

اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ کوئی شخص کتنا برا ہو، لیکن اس پر کوئی ایسا الزام عائد کرنا ہرگز جائز نہیں ہے جس کی سچائی کی مکمل تحقیق نہ ہو چکی ہو۔ لیکن انتخابی جلسوں کی شاید ہی کوئی تقریر اس قسم کے بلا تحقیق الزامات سے خالی ہوتی ہو جو ''بہتان'' کے گناہ کبیرہ میں داخل ہیں۔ پھر بعض اوقات اس ''بہتان طرازی'' کے لیے اتنی گھٹیا اور بازاری زبان استعمال کی جاتی ہے کہ وہ ''دشنام طرازی'' کا گناہ بھی سمیٹ لیتی ہے، ایک حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی مسلمان کی جان، مال اور آبرو کو کعبۃ اللہ سے بھی زیادہ مقدس قرار دیا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ مسلمان کی جان، مال یا آبرو، پر ناروا حملہ کرنا (معاذ اللہ) کعبے کو ڈھانے سے بھی زیادہ سنگین گناہ ہے لیکن انتخابی مہم کے جوش میں مدمقابل کا کعبہ آبرو گلی گلی میں ڈھایا جاتا ہے اور اخباروں کے صفحات سے لے کر انتخابی جلسوں اور کارنر میٹنگز تک کوئی جگہ ایسی نہیں ہے جو بہتان تراشی اور دشنام طرازی کی عفونت سے بدبودار نہ ہو۔

۳۔ پھر چونکہ انتخابات کا موقع ایسا ہوتا ہے کہ کسی امیدوار کے بارے میں حقائق

منظر عام پر لانے کی واقعی ضرورت بھی ہوتی ہے، تا کہ عوام کو دھوکے اور نقصان سے بچایا جا سکے، اس لیے کسی امیدوار کے حقیقی اوصاف بیان کرنے کی توجیہہ کی جا سکتی ہے، لیکن اس کے لیے اول تو یہ ضروری ہے کہ کوئی بات ضروری تحقیق کے بغیر نا گوار فریضہ صرف بقدر ضرورت ہی انجام دیا جائے، اسے محض مزے لینے اور مجلس آرائی کا ذریعہ نہ بنایا جائے ورنہ اگر وہ بہتان نہ ہو، تب بھی غیبت کے اس گناہ عظیم میں داخل ہے جسے قرآن کریم نے مردہ بھائی کا گوشت کھانے کے مترادف قرار دیا ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ایک مجلس میں کسی شخص نے حجاج بن یوسف کی برائیاں بیان کرنی شروع کر دیں۔ حجاج کا ظلم وستم لوگوں میں مشہور تھا، لیکن چونکہ اس مقام پر برائی کرنے کا کوئی صحیح مقصد یا فائدہ نہیں تھا، اس لیے حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ یہ غیبت ہے اور اگر حجاج نے بہت سے لوگوں پر ظلم کیا ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ اب ہر شخص کے لیے اس کی غیبت حلال ہو گئی ہے۔ یاد رکھو کہ اللہ تعالیٰ اگر حجاج کے بے گناہوں کے خون کا حساب لے گا تو دوسرے سے اس کی ناروا غیبت کا بھی حساب لے گا۔

۴۔ دوسروں کی برائی اور ان پر الزام تراشی کے علاوہ انتخاب میں کامیابی کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ منہ بھر بھر کر خود اپنی تعریف اور اپنی خدمات کا مبالغہ آمیز تذکرہ کیا جائے۔ خودنمائی، نام ونمود اور دکھاوے کو مذہب واخلاق کے ہر نظام میں گناہ یا کم از کم برا ضرور سمجھا گیا ہے، لیکن ہماری انتخابی سیاست کے مذہب میں یہ عمل کسی قید وشرط کا پابند نہیں رہا۔

۵۔ عوام کو ووٹ دینے پر مائل کرنے کے لیے یہ بھی لازمی سمجھ لیا گیا ہے کہ ان سے سوچے سمجھے بغیر خوشنما وعدے کیے جائیں۔ وعدہ کرتے وقت اس بات سے بحث نہیں ہوتی کہ ان کو پورا کرنے کا کیا طریقہ ہوگا؟ اور اقتدار حاصل ہونے کے بعد وہ کس طرح روبعمل لائے جا سکیں گے؟ مسئلہ صرف یہ ہے کہ وعدوں کے نیلام میں کس طرح دوسروں سے بڑھ چڑھ کر بولی لگائی جائے؟ ...... ''ہم برسر اقتدار آ کر غریبوں کی قسمت بدل دیں گے''، ''ہم پسماندہ علاقوں کو پیرس

کا نمونہ بنادیں گے"، "ہم ہر ضلع میں ایک ہائی کورٹ قائم کردیں گے"، "ہم غربت اور جہالت کا خاتمہ کردیں گے" ...... اس قسم کے بلند بانگ دعوے اخباری بیانات سے لے کر تقریروں تک ہر جگہ سنائی دیتے ہیں اور ان جھوٹے دعوں اور وعدوں کے ذریعے سادہ لوح عوام کو بے وقوف بنانے کی کوشش کی جاتی ہے۔

۶۔ جلسے جلوس اور اشتہار بھی انتخابی سرگرمیوں کا ایک لازمی حصہ ہیں اور اگر وہ اخلاق و شرافت کی حدود میں ہوں تو ناجائز بھی نہیں، لیکن جلسوں جلوسوں میں غنڈہ گردی روزمرہ کا معمول بن چکی ہے جس کے نزدیک سیاسی حریفوں کی جان، مال اور آبرو کوئی قیمت نہیں رکھتی۔ چنانچہ جس وقت جس کا داؤ چل جائے وہ دوسروں کو زک پہنچانے میں کسر نہیں چھوڑتا۔

۷۔ پھر بعض اوقات انتخابی جلسے جلوس ایسے عام اور مصروف راستوں پر منعقد کیے جاتے ہیں جن کی وجہ سے شہر کی آبادی کے لیے نقل و حرکت محال ہو جاتی ہے اور ٹریفک کا ایسا مسئلہ کھڑا ہو جاتا ہے جو بے گناہ شہریوں کو عذاب میں مبتلا کر دیتا ہے، نہ جانے کتنے ضعیف اور بیمار لوگ اس قسم کی بدنظمی کی وجہ سے اپنے علاج سے محروم رہ جاتے ہیں کتنے ضرورت منداپنے روزگار تک نہیں پہنچ پاتے اور اس طرح عام گذرگاہوں کو بلاک کر کے نہ جانے کتنے انسانوں کو ناقابل برداشت تکلیف پہنچانے کا گناہ عظیم اس قسم کے جلسوں جلوسوں کے حصے میں آتا ہے۔

۸۔ دیواروں کو انتخابی نعروں سے سیاہ کرنا اور شخصی اور سرکاری عمارتوں پر اشتہارات چسپاں کرنا بھی انتخابی مہم کا جزء لاینفک ہے جس کے نتیجے میں شہر کی بیشتر عمارتیں متضاد نعروں اور اشتہارات سے داغ دار نظر آتی ہیں اور کسی اللہ کے بندے کو یہ خیال نہیں آتا کہ کسی دوسرے کی عمارت کو اس کی مرضی کے بغیر استعمال کر کے اس کا حلیہ بگاڑنا درحقیقت چوری اور غصب کے مترادف ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ کسی دوسرے کی ملکیت کو اس کی خوش دلی کے بغیر استعمال کرنا حلال نہیں، عمارتیں اور دیواریں کسی نہ کسی کی ملکیت ہوتی ہیں اور

ان کو اپنے اشتہار کے لیے استعمال کرنا مالک کی اجازت کے بغیر حرام ہے، چہ جائے کہ ان کو خراب اور بدنما بنانا، لیکن غربت اور جہالت کے خاتمے کے دعویدار بے تکان اس چوری اور غصب کا ارتکاب کرتے ہیں اور اگر کوئی شریف انسان اس عمل سے روکنے کی کوشش کرے تو اسے پتھروں اور فائرنگ کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

۹۔ ووٹوں کی خرید و فروخت اور اس غرض کے لیے لوگوں کو رشوت دینا اور جن لوگوں کے قبضے میں بہت سے ووٹ ہوں، ان کے ناجائز کام کرا دینا یا اس کا وعدہ کر لینا ایک مستقل جرم ہے جو خدا اور آخرت سے بے فکر امیدواروں میں بہ کثرت رائج ہے اور اس نے معاشرے کو اخلاقی تباہی کے کنارے لا کھڑا کیا ہے۔

۱۰۔ ظاہر ہے کہ ساری انتخابی مہم چلانے کے لیے ہر جماعت کو کروڑوں روپیہ درکار ہوتا ہے کروڑوں روپے کے اس سرمائے کے حصول کے لیے جو طریقے اختیار کیے جاتے ہیں، ان میں غیر ملکی طاقتوں سے گٹھ جوڑ اور ان کی دی ہوئی لائن پر کام کرنا ایک ایسی بیماری ہے جو ملک کو دیمک کی طرح چاٹ رہی ہے اور جو لوگ باہر سے سرمایہ حاصل نہیں کر پاتے، وہ اپنے ہی ملک کے بڑے بڑے دولت مند افراد سے اپنی جماعتوں کے لیے چندے وصول کرتے ہیں اور بسا اوقات یہ چندہ درحقیقت اس بات کی رشوت ہوتا ہے کہ برسر اقتدار آنے کے بعد چندہ دینے والوں کو خصوصی مراعات دی جائیں گی اور اگر وہ دینے سے انکار کریں تو انہیں طرح طرح سے تنگ کیا جائے گا۔ جو جماعت جتنی زیادہ طاقتور ہے اور اس کے اقتدار میں آنے کے جتنے زیادہ امکانات ہیں، اس کی چندے کی اپیل اتنی ہی زیادہ مؤثر ہے۔

یہ دس موٹے موٹے گناہ محض مثال کے طور پر ذکر کیے گئے ہیں، لیکن اگر آپ باریک بینی سے غور فرمائیں تو نظر آئے گا کہ ان میں سے ہر گناہ بذات خود بہت سے گناہوں کا مجموعہ ہے اور انتخابی مہم کے دوران اسی قسم کے نہ جانے کتنے گناہوں کا ارتکاب دھڑلے سے ہو رہا ہے۔

اب غور فرمائیے! کہ جن حکومتوں کی بنیاد میں جھوٹ، الزام تراشی، بہتان، غیبت، خودستائی، جھوٹے وعدوں، دوسروں کے ساتھ غنڈہ گردی مخلوق خدا کی ایذا رسانی، دوسروں کی املاک پر ناجائز تصرف جیسے عظیم گناہ داخل ہوں، ان سے ملک وملت کو سکھ چین کس طرح نصیب ہو؟ اور جس ماحول میں ان گناہوں کی ظلمت چھائی ہوئی ہو، وہاں سے خیر وفلاح کی روشنی نمودار ہونے کی کیا توقع رکھی جائے؟

لیکن ان گذارشات کا مقصد محض تنقید برائے تنقید نہیں، نہ اس کا منشا یہ ہے کہ لوگوں میں مایوسی پھیلائی جائے۔ بلکہ مقصد صرف یہ ہے کہ کم از کم ہم اپنی بیماریوں سے آگاہ ہوں اور ان میں سے جس کسی بیماری کا سد باب اپنی قدرت میں ہو، اس سے دریغ نہ کریں اور کم از کم عام مسلمان ان گناہوں سے محفوظ رہنے کا اہتمام کریں جن میں وہ بعض اوقات نادانستہ طور پر مبتلا ہو جاتے ہیں۔ یہ سمجھنا چاہیے کہ اس ہنگامہ خیز طوفان میں ایک تنہا شخص خود کسی برائی سے رک جائے تو اس سے معاشرے پر مجموعی طور سے کیا اثر پڑ جائے گا؟

یاد رکھئے! کہ معاشرے سے گندگی جس چھوٹی سے چھوٹی مقدار میں بھی کم ہو، غنیمت ہے اور معاشرہ درحقیقت افراد ہی کے مجموعے سے عبارت ہے، یہاں چراغ سے چراغ جلتا ہے، لہٰذا بعض اوقات کسی ایک شخص کا عزم وہمت بھی معاشرے کی تبدیلی میں فیصلہ کن کردار ادا کر سکتا ہے۔

ہر فرد ہے ملت کے مقدر کا ستارا

دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ موجودہ انتخابات میں ایک عام مسلمان کے لیے راہ عمل کیا ہے؟ کیا انتخابات میں اچھلنے والی اس گند کو دیکھتے ہوئے یہ بہتر ہے کہ انسان اس ہنگامے سے مکمل یکسوئی اختیار کرے اور اپنا ووٹ بھی نہ ڈالے؟...... ہمارے نزدیک اس سوال کا جواب نفی میں ہے، یہ درست ہے کہ سیاسی فضا بدعنوانیوں کے گرد وغبار سے اٹی ہوئی ہے، یہ بھی درست ہے کہ ملک کی سیاسی افق پر امید کی کوئی ایسی کرن نظر نہیں آرہی جسے دیکھ کر ایک عام مسلمان مطمئن ہو سکے، لیکن یہ بھی اپنی جگہ حقیقت ہے کہ جو کچھ اوپر عرض کیا گیا ہے وہ مجموعی سیاسی فضا کے اعتبار سے عرض کیا گیا ہے اور اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ دنیا اچھائی سے بالکل خالی ہو گئی ہے، ظاہر ہے کہ بعض افراد اس مجموعی صورت

حال سے مستثنیٰ بھی ضرور ہوں گے اور انہیں تلاش کرنے کی ضرورت ہے۔ دوسرے ایک مسلمان کا کام مایوس ہو کر بے عمل ہو جانا نہیں، بلکہ اپنی بساط اور اپنی مقدور کی حد تک اپنا فرض ادا کرنا ہے، اس فریضے کی ادائیگی کے بعد نتائج اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہیں۔

انتخابات کی فضاء میں پائی جانے والی مذکورہ بالا خرابیوں کے باوجود بہر صورت! یہ ایک ایسا موقع ہے۔ جس میں ہر ووٹر اتنا کر سکتا ہے کہ وہ اپنے ووٹ کا وزن اس شخص کے پلڑے میں ڈال دے جس کو وہ ملک و ملت کے لیے نسبتاً بہتر سمجھتا ہو۔ چنانچہ اس موقع سے ہر ووٹر کو فائدہ اٹھانا چاہیے اور اپنا ووٹ دیانتداری کے ساتھ صحیح جگہ استعمال کر کے اپنا فریضہ ادا کر دینا چاہیے۔

ووٹ کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ اس موضوع پر ایک مضمون البلاغ کے اسی شمارے میں الگ شائع ہو رہا ہے، لیکن اس کا خلاصہ یہ ہے کہ ووٹ کی حیثیت شرعی اعتبار سے ایک شہادت اور گواہی کی ہے، غلط جگہ ووٹ دینے میں جھوٹی گواہی کا سخت گناہ ہے اور اگر کسی ووٹر کے حلقے میں کوئی واقعتاً اہل شخص موجود ہے، تو اس کو ووٹ نہ دینے میں گواہی چھپانے کا گناہ ہے، لہٰذا اگر کسی حلقے میں کوئی ایسا امیدوار موجود ہے جس کو ایک ووٹر پوری دیانت داری سے تمام امیدواروں میں سب سے بہتر سمجھتا ہے اور جس کی کامیابی میں ملک، وملت کا فائدہ دیکھتا ہے تو اس کو ووٹ دینا شرعاً بھی ضروری ہے، تاکہ گواہی چھپانے کا گناہ نہ ہو اور اگر کوئی شخص بھی کلی طور پر تو اہل نہیں ہے، لیکن ایک شخص زیادہ برا ہے اور دوسرا کم برا، تب بھی بڑی برائی کو روکنے کے لیے چھوٹی برائی کو اختیار کر لینا شریعت کا ایک اصول ہے، چنانچہ ایسی صورت میں بڑی برائی کو روکنے کی ہر ممکن کوشش کرنی چاہیے، خواہ اس کے لیے ایسے شخص کو ووٹ دینا پڑے جو پوری طرح اہل نہیں، لیکن اس کی برائی بڑی برائی کے مقابلے میں کم ہے۔ ہاں! اگر کسی جگہ تمام امیدوار یکساں حیثیت کے حامل ہیں اور کسی کو کسی پر فوقیت دینا ممکن نہیں ہے تو ایسی صورت میں بے شک خاموشی بہتر ہے اور ایسے موقع پر یہ جائز اور درست ہے کہ کسی کو بھی ووٹ نہ دیا جائے۔

ان اصولوں کو مد نظر رکھتے ہوئے اپنے ووٹ کا فیصلہ کرنا ہر مسلمان کے لیے ضروری ہے اور اس فیصلے پر پہنچنے کے لیے ہر ممکن تحقیق، تفتیش اور ملک وملت کے مجموعی

حالات کو مدنظر رکھنا بھی ضروری ہے۔ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو وہ فیصلہ کرنے کی توفیق عطا فرمائے جس میں ملک وملت کے لیے دین ودنیا کی بہتری ہو۔ آمین۔

وما علینا الا البلاغ.

محمد تقی عثمانی۔

۲۵؍ربیع الاول ۱۴۱۴ھ۔

مضمون: ۱۳

یہ ناچ گانا بند کیجیے

اس وقت روز نامہ جنگ لاہور کی ہفتہ ۱۰ر جنوری ۱۹۸۷ء کی اشاعت ہمارے پیش نظر ہے اور اس میں ایک انتہائی شرم ناک خبر پڑھ کر ذہن اس حالت سے دوچار ہے جس میں اسے رنج واذیت کے اظہار کے لیے الفاظ میسر نہیں آتے۔ دکھے ہوئے دل سے بے ساختہ یہ کلمات ابھرتے ہیں کہ یا اللہ! ہم کہاں پہنچ گئے ہیں؟ اور صبح سے لے کر شام تک ''اسلام''، ''اسلام'' لی رٹ لگانے کے باوجود عملی اعتبار سے اخلاقی دیوالیہ پن کی کن کن پستیوں میں گرے ہوئے ہیں؟

خبر کی تلخیص کرنے سے اس کے پورے مضمرات کا شاید اندازہ نہیں ہو سکے گا، اس لیے ذیل میں یہ خبر ''جنگ'' ہی کے الفاظ میں من وعن پیش خدمت ہے:۔

بازار حسن میں ناچ گانا پھر شروع ہو گیا:

ناچ گانے والیاں بالکونیوں میں کھڑی نہیں ہوں گی، دروازوں پر پردے لٹکائیں گی، پولیس حکام کے ساتھ مذاکرات میں فیصلہ ہم نے آرٹ کونسلوں سے زیادہ فن کی خدمت کی ہے، بازار حسن کے نمائندوں کا موقف۔

لاہور: (رپورٹنگ ڈیسک، نمائندہ جنگ) گذشتہ رات ٹبی پولیس اور بازار حسن کی نمائندہ تنظیم کے عہدیداروں کے مابین مذاکرات کے نتیجے میں ٹبی کے علاقے میں ناچ گانے کا کاروبار مشروط طور پر شروع ہو گیا۔ مذاکرات میں ڈی ایس پی چودھری غلام دسول، ایس ایچ او ٹبی سید پرویز شاہ کے مطابق یہ تو درحقیقت انسان کی روحانی تسکین کا ایک ذریعہ ہے۔

روحانی تسکین کے لیے انسان جس مذہب کو بہتر سمجھے اختیار کرلے۔ کسی کو بت پرستی میں زیادہ مزہ آتا ہے اسی میں اس کو زیادہ سکون ملتا ہے وہ اس کو اختیار کرلے اور

اگر کسی کو توحید میں زیادہ سکون ملتا ہے تو وہ اس کو اختیار کرلے...... سوال حق و باطل کا نہیں کہ کون سا مذہب حق ہے اور کون سا باطل ہے بلکہ یہ ہے کہ کس مذہب میں اس شخص کو زیادہ روحانی سکون محسوس ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے جو شخص بھی جو مذہب اختیار کرلیتا ہے وہ قابل احترام ہے اور اس میں کسی دوسرے کو دخل اندازی کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ چونکہ ذاتی اور پرائیویٹ زندگی کا معاملہ ہے لہٰذا زندگی کے دوسرے شعبوں میں اس کے عمل دخل کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔

لادینی جمہوریت کا نظریہ:

یہیں سے یہ نظریہ وجود میں آیا جس کو آج کی اصطلاح میں سیکولرازم کہتے ہیں ...... اس نظریۂ زندگی کا خلاصہ یہ ہے کہ جہاں تک زندگی کے اجتماعی کام ہیں معیار اور سیاست وغیرہ یہ ہر مذہب سے آزاد ہیں اور انسانی عقل، تجربہ، مشاہدہ اور جمہوری اقدار جس طریقے کولیں ہر معاشرے میں وہ طریقہ اختیار کرنا چاہیے ...... مذہب کی ان کے اوپر کوئی بالادستی نہیں ہوتی اور جہاں تک ذاتی زندگی کا سوال ہے تو جو شخص جس مذہب میں سکون پائے وہ مذہب اختیار کرلے کسی کو یہ کہنے کا حق نہیں کہ تمہارا یہ مذہب باطل ہے...... ہر شخص اپنے مذہب پر عمل کرنے میں آزاد ہے اس وجہ سے نہیں کہ وہ حق ہے، بلکہ اس وجہ سے کہ اس میں اس کو راحت وسکون میسر آتا ہے...... ان الفاظ میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ مذہب کا تصور آج مغربی نظریات کے تحت یہ ہے کہ ''مذہب کی کوئی حقیقت نہیں'' بلکہ لطف وسکون کے حصول کا ایک ذریعہ ہے...... ایک شخص کو اگر اپنے دنیاوی مشاغل کے فرصت کے وقت بندروں کے تماشے کو دیکھ کر ذہنی سکون ملتا ہے تو اس کے لیے بندروں کا تماشہ اچھی چیز ہے اور جس طرح بندروں کے تماشے کا حقیقی زندگی سے کوئی تعلق نہیں اسی طرح اگر کسی کو مسجد میں جا کر نماز میں لطف آتا ہے اور سکون ملتا ہے تو اس کے لیے یہی طریقہ مناسب ہے لیکن اس کا حقیقی زندگی سے کوئی تعلق یعنی اس سے بحث نہیں کہ مسجد میں جا کر نماز پڑھنا فی نفسہ حق ہے؟ یا باطل؟ (العیاذ باللہ) یہ ہوا ہے جو اس وقت پوری مغربی دنیا کے اوپر چھایا ہوا ہے...... اور اسی کا دوسرا نام ہے سیکولر ڈیموکریسی لادینی جمہوریت......

آخری نظریہ:

اوراب تو بغلیں بجائی جارہی ہیں کہ دنیا کے اندر ہر نظام فیل ہو گیا ہے، اب صرف آخری نظریہ جو کبھی فیل ہونے والا نہیں ہے وہ یہی سیکولر ڈیموکریسی ہے۔ اسی موضوع پر امریکہ سے ایک کتاب شائع کی گئی ہے جو ساری دنیا کے اندر بڑی دلچسپی کے ساتھ پڑھی جارہی ہے...... لاکھوں کی تعداد میں اس کے نسخے فروخت ہو چکے ہیں اور اس کو اس دور کی عظیم ترین کتاب کی حیثیت سے متعارف کرایا جارہا ہے یہ کتاب امریکی وزارت خارجہ کے ترجمان نے ایک تحقیقی مقالے کی شکل میں لکھی ہے جس کا نام ہے۔ "THE END OF THE HISTORY AND THE LAST MAN" یعنی تاریخ کا خاتمہ اور آخری آدمی...... اس کا پورا ما حاصل یہ ہے کہ سوویت یونین کے خاتمے پر ایک تاریخ کا خاتمہ ہو گیا ہے اور آخری انسان جو ہر لحاظ سے مکمل ہے وہ وجود میں آ گیا ہے...... یعنی سیکولر ڈیموکریسی کا نظریہ ثابت ہو گیا ہے اور اب رہتی دنیا تک اس سے بہتر کوئی نظام یا نظریہ وجود میں نہیں آئے گا۔

ہم پر الزام ہے کہ اسلام تلوار کے زور سے پھیلا:

جب مغربی استعمار نے اسلامی ملکوں پر اپنا تسلط جمایا تو اس نے اپنی لادینی جمہوریت کا تصور بھی پھیلایا اور بزور شمشیر پھیلایا مسلمانوں پر یہ الزام تھا کہ انہوں نے اسلام تلوار کے زور پر پھیلایا، حالانکہ خود مغرب نے اپنا ڈیموکریسی کا نظام زبردستی اور بزور شمشیر پھیلایا ہے، اسی کی طرف اکبر مرحوم نے اپنے مشہور قطعے میں اشارہ کیا تھا کہ

اپنے عیبوں کی کیا آپ کو کچھ پرواہ ہے
غلط الزام بھی اوروں پہ لگا رکھا ہے
یہی فرماتے رہیں تیغ سے پھیلا اسلام
یہ نہ ارشاد ہوا توپ سے کیا پھیلا ہے

توپ وتفنگ کے بل بوتے پر انہوں نے پہلے سیاسی تسلط قائم کیا اس کے بعد رفتہ رفتہ سیاسی اور معاشی اداروں سے دین کا رابطہ توڑا...... اور اس رابطے کو توڑنے کے لیے ایسا تعلیمی نظام وجود میں لائے جو ہندوستان میں لارڈ میکالے نے متعارف کرایا اور کھلم

ہو رہے ہیں، الحمدللہ! عالم بن رہے ہیں، لوگ پوچھتے ہیں کہ اتنی ساری تعداد کہاں کھپے گی، ایک لفظ زبان زد ہے کہ ان کا کیریئر کیا ہے؟ ان کا مستقبل کیا ہے؟

یہ بات زبان پر اس لیے آگئی کہ دینی مدارس کے بارے میں بہت طوفان مچا ہوا ہے، مجھے ایک واقعہ یاد آ گیا۔

حضرت معروف کرخی رحمۃ اللہ علیہ بڑے درجہ کے اولیاء اللہ میں سے ہیں۔ بغداد میں ان کا مزار ہے، میں بھی الحمدللہ ان کے مزار پر حاضر ہوا ہوں۔ ایک مرتبہ دجلہ کے کنارے اپنے ساتھیوں کے ساتھ جا رہے تھے۔ اسی دوران دریائے دجلہ میں ایک کشتی گزری جس میں کچھ آزاد منش نوجوان سوار تھے اور گاتے بجاتے جا رہے تھے، شوخیوں اور رنگ رلیوں میں مست تھے، کشتی پاس سے گزری تو ویسے بھی بیچارہ مولوی ملامتی فرقہ تو ہے ہی، ان حضرات کو دیکھ کر ان نوجوان کی رگ ظرافت پھڑک اٹھی، کوئی جملہ بھی چست کر دیا، رنگ رلیوں کے دوران کوئی مولوی آ جائے اور اس پر کوئی جملہ کس دیا جائے، اس سے اچھی کیا بات ہے؟ حضرت معروف کرخی رحمۃ اللہ علیہ کے برابر میں جو صاحب تھے، انہوں نے عرض کیا کہ: حضرت یہ اوباش لوگ جو خود تو فسق و فجور میں مبتلا ہیں ہی، یہ اللہ والوں کی شان میں بھی گستاخی کرتے ہیں، آپ ان کے لیے بددعا کر دیجیے۔ حضرت معروف کرخی رحمۃ اللہ علیہ نے ہاتھ اٹھائے اور بارگاہ الٰہی میں عرض کیا:

"یا اللہ آپ نے ان نوجوانوں کو دنیاوی مسرتیں عطا فرمائی ہیں یا اللہ ان کو آخرت کی بھی مسرتیں عطا فرما۔"

آپ کا ساتھی کہنے لگا کہ: حضرت آپ نے تو ان کے حق میں بددعا کرنے کے بجائے دعا کر دی۔ حضرت کرخی رحمۃ اللہ علیہ نے جواب دیا کہ میرا کیا نقصان ہوا؟ میں نے تو ان کے لیے آخرت میں مسرتوں کی دعا کی ہے اور آخرت میں مسرتیں تب ہی حاصل ہو سکتی ہیں جب یہ صحیح معنی میں مسلمان اور نیک بنیں۔

تو بھائی! کسی کی نیت خراب ہو تو اللہ ہی جانے، لیکن ظاہر یہ ہے کہ جو آدمی مدرسہ میں دینی تعلیم حاصل کرنے کے لیے آیا تو وہ درحقیقت حضرت معروف کرخی رحمۃ اللہ علیہ کی اس بات پر عمل کرتا ہے کہ میرے دوسرے مسلمان بھائیوں کی جس طرح دنیا بہتر

ہے، اللہ تعالیٰ ان کی آخرت کو بھی بہتر کردے۔ یہ طلبہ اپنی اور دوسروں کی آخرت بہتر بنانے کے لیے یہاں آتے ہیں یہی ان کا کیریر ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کے مستقبل کو خراب نہیں کرتے۔ ان کو کسی فکر کی ضرورت نہیں، فکر کی بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں اپنے فضل وکرم سے ایمان پر قائم رکھے اور دین کے تقاضوں پر عمل کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

یہ بھی سوچ لیا کریں اور اس سے اندازہ ہوجاتا ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے کس تائید سے ان اداروں کو نوازا ہے۔ اس دارالعلوم کا ماہانہ خرچ لاکھوں روپے میں ہے اور اس کا کوئی بجٹ نہیں بنتا، اتنے بڑے خرچ کا کوئی ادارہ آپ مجھے دکھادیجیے، جس کا بجٹ نہ بنتا ہو، علاوہ دینی مدارس، اس کا...... بجٹ وہاں بنتا ہے جہاں آمدنی کے ذرائع متعین ہوں۔ آمدنی ہی کے دائرے میں اخراجات کا میزانیہ بنایا جاتا ہے جب کہ ہمیں نہیں معلوم کہ آئندہ کتنی آمدنی ہوگی؟ آج تک کبھی بجٹ کی بنیاد پر کوئی کام نہیں ہوا اور اللہ کے فضل وکرم سے ضرورت کے سب کام ہوجاتے ہیں۔ لوگ پوچھتے ہیں کہ سالانہ اتنا بڑا خرچہ ہے تو آمدنی کیا ہے؟ مستقل آمدنی جس کے بارے میں یقین سے میں بتلا سکوں، کچھ نہیں ہے البتہ کچھ مکانات وقف کے ہیں ان کے کرایہ کی مجموعی آمدنی بمشکل پچاس ساٹھ ہزار کے قریب ہوگی لوگ پوچھتے ہیں کہ کہاں سے آتا ہے؟ میں جواب میں عرض کیا کرتا ہوں کہ۔ مجھے معلوم نہیں کہ کہاں سے آتا ہے۔ واقعہ بھی یہ ہے اور اس میں کوئی مبالغہ نہیں، باقی ساڑھے انیس لاکھ روپے کہاں سے آرہے ہیں اور کس طرح آرہے ہیں، مجھے نہیں معلوم۔

دارالعلوم کی طرف سے نہ کوئی اشتہار ہے، نہ کوئی اعلان ہے نہ اپیل کی جاتی ہے کہ دارالعلوم کے اندر اتنا خرچ ہوتا ہے آپ اس میں چندہ دیں۔ فون اٹھا کر کسی سے ذکر کرنے کا بھی معمول نہیں ہے۔ ۲۱ شعبان کے مہینے کے اخراجات موجود نہیں ہیں جو بیلنس ہے وہ شعبان کے اخراجات کے لیے بھی کافی نہیں۔ اس وقت بھی کسی سے ذکر نہیں کیا، البتہ ایک دوست اتفاق سے آگئے، ان سے ضمناً ذکر آگیا، پھر معلوم نہیں کہ کیا ہوا؟

البتہ میرے والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ ایک بات سکھا گئے ہیں کہ جب کبھی ایسا موقعہ آئے تو ہاتھ اٹھا کر اللہ تبارک وتعالیٰ سے مانگ لیا کرو، تو الحمد للہ اس کی توفیق ہوئی۔ اللہ

تبارک وتعالیٰ کے سامنے ہاتھ پھیلا دیئے اور مانگ لیا۔ میں تے آنے کے بعد ابھی تک پوچھا بھی نہیں کہ پوزیشن کیا ہے؟ ابھی تک معلوم نہیں، لیکن الحمدللہ ضرورت کا کوئی کام اللہ تبارک وتعالیٰ روکتے نہیں۔ یہ صدقہ ہے ہمارے والد ماجد کے اخلاص کا۔ ان کی نالہ نیم شبی کا، میرے شیخ حضرت ڈاکٹر عبدالحئی کی دعاؤں کا اور ان کے اخلاص کا۔

اس میں ہمارا کوئی کمال نہیں ہے۔ اگر ہمارے زور بازو پر چھوڑا جاتا تو اتنا بڑا ادارہ نہیں چل سکتا تھا۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل وکرم سے، ان بزرگوں کی دعاؤں اور اخلاص کے نتیجہ میں الحمدللہ اس کو چلا رہے ہیں۔ اللہ تبارک وتعالیٰ خود اس کے کفیل ہیں۔

میرے والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ نے یہ بات فرمادی تھی کہ ہم نے کوئی دوکان نہیں کھولی ہے۔ جس کا ہردم ہرآن چلتا رہنا ضروری ہو، جب تک اصول صحیحہ سے اس کو چلا سکو چلاؤ، جب یہ خیال ہو کہ اصول کو پامال کرنا پڑے گا اور دین کی بے توقیری کرنی پڑے گی۔ اسے تالہ ڈال دینا، بند کر دینا، یہ وصیت کر کے تشریف لے گئے۔ الحمدللہ آج تک اللہ تعالیٰ اپنے فضل وکرم سے، اپنی رحمت سے اس کو چلا رہے ہیں یہ مثال دنیا کے کسی ادارہ میں نہیں ملے گی۔ یہ اللہ جل جلالہ کی قدرت کا کرشمہ ہے، جس کو ہر انسان اپنی آنکھوں سے دیکھ سکتا ہے۔ بے شک کوئی آدمی اس میں اصلاحات کی غرض سے کوئی تجویز پیش کرے تو اس کا خیر مقدم کرنے کے لیے تیار ہیں۔

لیکن کوئی شخص یہ چاہے کہ یہ دینی مدرسہ اپنی روش سے ہٹ کر کسی اور طریقے میں تبدیل ہو جائے۔ یہ انشاءاللہ کبھی نہیں ہوگا۔ جب تک ہمارے دم میں دم ہے اور جب تک سانس میں سانس ہے یہ اپنی روش سے نہیں ہٹے گا انشاءاللہ اور جس دن اس کو ہٹانا پڑا، اس دن اس کو بند کر دیا جائے گا۔ اللہ تعالیٰ اس کو اس مزاج کے ساتھ قیامت تک قائم رکھے اور اس کو اپنی رضا کے مطابق چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔ میں نے آپ کا وقت لے لیا، لیکن یہ ایک ضروری بات تھی جو ہمارے ماحول اور فضا میں کہنی ضروری تھی۔

میرے طالب علم ساتھی جو اس سال دورہ حدیث سے فارغ ہو رہے ہیں اب آپ یہاں سے فارغ ہونے کے بعد مختلف شعبہ ہائے زندگی میں جائیں گے آپ طالب علم ساتھیوں سے بھی چند باتیں کہنی تھیں مگر حضرت مولانا سبحان محمود صاحب مدظلہم

نے نصیحتیں فرمادی ہیں۔اب اس کا موقع نہیں ہے لیکن ایک بات آخر میں ذکر کر کے اپنی بات کو ختم کرتا ہوں وہ یہ ہے کہ۔

میرے ساتھیو!

آپ یہاں سے فارغ ہونے کے بعد اب دنیا میں جاؤ گے،اس دنیا میں جاؤ گے جس میں لوگ طعنوں اور اعتراضات کے تیر کمانوں میں چڑھائے ہوئے ہیں، جہاں پہنچو گے وہاں ان تیروں اور طعنوں کی بارش ہوگی لیکن یہ بات دل میں اچھی طرح ذہن نشین کرلو کہ تم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جماعت کے سپاہی ہو۔

میرے بزرگ حضرت شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحب رحمۃ اللہ علیہ ایک مرتبہ اسی مسجد میں بیٹھ کر صرف ایک جملہ فرما گئے تھے۔وہ اپنے دل پر نقش کرلو، وہ جملہ یہ ہے۔

”طالب علمو! اپنی قدر پہچانو“

”اللہ تبارک وتعالیٰ نے تم کو علم کی دولت سے نوازا ہے، اللہ تعالیٰ نے تم کو اپنے دین کی خدمت کے لیے چنا ہے۔“

یہ نعمت اور یہ عزت تمام دنیا پر بھاری ہے، خواہ دنیا والے کتنے ہی اعتراضات کریں۔تمہارے دل کے اندر دین کی عزت ہوگی تو اس کو کوئی نہیں مٹا سکے گا۔

اللہ تبارک وتعالیٰ تمہارا حامی و ناصر ہو۔اس یقین کے ساتھ جاؤ گے تو انشاء اللہ تم ہر جگہ سر بلند ہو گے۔بشرطیکہ تم نے جو علم یہاں حاصل کیا ہے اس کو اپنی زندگیوں میں اپناؤ اور اس کو دنیا میں پھیلانے اور پہنچانے کی کوشش کرو، اللہ تعالیٰ تمہیں قدم قدم پر اپنی نصرت سے نوازے۔تمہارے لیے قدم قدم پر کامیابیوں اور کامرانیوں کے دروازے کھولے اور اللہ تعالیٰ ہم سب کو ہمیشہ اپنے دین پر قائم رہنے اور اس علم کی قدر پہچاننے کی توفیق عطا فرمائے۔آمین۔ان الفاظ کے ساتھ میں آپ سے رخصت ہوتا ہوں۔

وآخر دعوانا ان الحمدللہ رب العلمین۔

مضمون:۱۲

انتخابی مہم کے منکرات اور ہمارا طرز عمل

ملک میں نئے انتخابات کی آمد آمد ہے اور جو سیاسی سرگرمیاں انتخابات کا لازمہ سمجھی جاتی ہیں وہ دھیرے دھیرے زور پکڑ رہی ہیں۔ یہ مسئلہ تو اپنی جگہ ہے کہ ''جمہوریت'' کے نام سے جو نظام حکومت اس وقت رائج ہے اور حکمرانوں کے انتخاب کا جو طریقہ اس میں اختیار کیا گیا ہے، وہ کس حد تک اسلامی احکام کے مطابق اور ہمارے قومی اور ملی حالات کے لیے کتنا موزوں ہے؟ اس وقت یہ علمی اور نظریاتی مسئلہ چھیڑنا منظور نہیں، یہ متنازعہ سیاسی موضوع بھی اس وقت زیر بحث لانا مقصود نہیں ہے کہ جو انتخابات اس وقت منعقد ہو رہے ہیں ان کا کوئی جواز تھا یا نہیں؟ لیکن یہ ایک امر واقعہ ہے کہ انتخابات ہونے والے ہیں اور ہر متعلقہ سطح پر ان کی تیاریاں جاری ہیں۔ لہٰذا اس حقیقت واقعہ کو تسلیم کرتے ہوئے اسوقت دو مسئلوں کی طرف قارئین کو متوجہ کرنا پیش نظر ہے۔

پہلا مسئلہ یہ ہے کہ ہمارے ملک میں جب بھی انتخابات کی گہما گہمی شروع ہوتی ہے اور اس معرکے میں حصہ لینے والے انتخابی مہم چلاتے ہیں تو اس مہم کے دوران عموماً شریعت، اخلاق اور بسا اوقات قانون کی بھی کوئی حد سلامت نہیں رہتی اور جو لوگ ہر قیمت پر انتخاب میں کامیابی کو اپنی منزل مقصود بنا کر انتخابی مہم چلاتے ہیں، ان کے بارے میں۔ گستاخی معاف۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے کچھ لوگ آنکھوں پر پٹی باندھ کر ریس لگا رہے ہیں اور انہیں اس بات کی کوئی پرواہ نہیں کہ ہدف کی طرف دوڑتے ہوئے کون کون اور کیا کیا ان کے پاؤں تلے کچلا جا رہا ہے۔

اس صورت حال کا نتیجہ یہ ہے کہ انتخابات کا ہنگامہ ہمارے معاشرے میں بے شمار گناہوں اور بدعنوانیوں کا ایسا طوفان لے کر آتا ہے جس کی ظلمت پورے ماحول پر چھا جاتی ہے اور اس میں شریعت، اخلاق شرافت اور مروت کی بنیادوں پر اتنی متواتر ضربیں

لگتی ہیں کہ پورا ملک لرز کر رہ جاتا ہے۔ ان گناہوں اور بدعنوانیوں کا انتہائی افسوس ناک پہلو یہ ہے کہ دلوں سے ان گناہوں کے گناہ ہونے کا احساس مٹتا جارہا ہے اور اقتدار طلبی کی اس اندھی دوڑ میں سب کچھ شیر مادر بن کر رہ گیا ہے اور چونکہ معاشرے میں ان برائیوں کا چلن کسی روک ٹوک کے بغیر اتنا عام ہوگیا ہے کہ اب کوئی ان برائیوں کے خلاف بولتا بھی نہیں، اس لیے ایسے حضرات کو بھی ان کے برا یا گناہ ہونے کا خیال نہیں آتا، جن کی نیت جان بوجھ کر برائی کرنے کی نہیں ہوتی۔ لہٰذا آج کی محفل میں ایسی ہی چند برائیوں کا ذکر اس جذبے سے کیا جارہا ہے کہ جو اللہ کا بندہ ان سے بچ سکے بچ جائے اور دوسرے حضرات کے دل میں کم از کم ان کے گناہ اور برا ہونے کا احساس پید اہو جائے۔

۱۔ انتخابات کے تعلق سے جو گناہ اور منکرات ہمارے ماحول میں پھیلے ہوئے ہیں، ان سب کی بنیادی جڑ تو اقتدار کی ہوس اور کسی منصب تک پہنچنے کی حرص ہے۔ جس کا جواز تلاش کرنے کے لیے بعض اوقات ملک و ملت کی خیر خواہی کی معصوم تاویل کرلی جاتی ہے۔ حکومت و اقتدار کے بارے میں قرآن وسنت کی ہدایات یہ ہیں کہ وہ کوئی پھولوں کی سیج نہیں ہے جس کی طرف لپکنے میں ایک دوسرے سے آگے نکلنے کی کوشش کی جائے، بلکہ یہ دنیا و آخرت کی ذمہ داری کا وہ جوا ہے جسے گردن پر رکھنے سے پہلے انسان کو لرزنا ضرور چاہیے اور شدید مجبوری کی بغیر اپنے آپ کو اس آزمائش میں نہ ڈالنا چاہیے۔ یہی وجہ ہے کہ جب سیدنا فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ان کے صاحبزادے عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو خلافت کے لیے نامزد کرنے کو کہا گیا تو انہوں نے ایک جواب یہ بھی دیا کہ ذمہ داری کا یہ طوق خطاب کے خاندان میں بس ایک ہی شخص (یعنی خود حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ) کے گلے میں پڑ گیا تو کافی ہے، میں اپنے بیٹے کے گلے کو اس سے گرانبار کرنا نہیں چاہتا۔"

اگر کسی شخص کی دل میں واقعتاً اس گرانبار ذمہ داری کا کما حقہ، احساس ہو تو بے شک اس کا جائز ذرائع سے اقتدار تک پہنچنا ملک و ملت کی خیر خواہی کے جذبے سے ہوتا ہے جو اس کی ادا ادا سے جھلکتا ہے اور اس کے نتیجے میں کبھی وہ خرابیاں، بدعنوانیاں اور

گناہ وجود میں نہیں آتے جن کے زہریلے اثرات سے ہماری آج کی سیاسی فضا مسموم ہے۔

لیکن جب اقتدار کو ایک منفعت، ایک لذت اور ایک مادی مفاد سمجھ لیا جائے اور اسے حاصل کرنے کے لیے تن من دھن کی ساری طاقتیں لٹائی جانے لگیں تو یہ اقتدار کی وہ حرص ہے جس کے بطن سے خیر وفلاح برآمد نہیں ہوسکتی، اور اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ وہ گناہوں، برائیوں، خودغرضیوں اور بدعنوانیوں کو جنم دے کر معاشرے میں شر اور فساد پھیلائے۔

۲۔ اسی شر وفساد کا ایک حصہ یہ ہے کہ ہماری انتخابی مہمات میں ایک دوسرے پر الزام تراشی اور بہتان طرازی کو شیر مادر سمجھ لیا گیا ہے۔ اپنے مقابل کو چت کر کے اپنی فتح کا ہاتھ بلند کرنے کے لیے اس پر بلا تحقیق ہر قسم کا الزام عائد کرنا حلال وطیب قرار پا چکا ہے بلکہ یہ اس سیاسی جنگ کا لازمی حصہ ہے جس کے بغیر سیاسی فتح کو ناممکن سمجھا جاتا ہے۔

اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ کوئی شخص کتنا برا ہو، لیکن اس پر کوئی ایسا الزام عائد کرنا ہر گز جائز نہیں ہے جس کی سچائی کی مکمل تحقیق نہ ہوچکی ہو۔ لیکن انتخابی جلسوں کی شاید ہی کوئی تقریر اس قسم کے بلا تحقیق الزامات سے خالی ہوتی ہو جو ''بہتان'' کے گناہ کبیرہ میں داخل ہیں۔ پھر بعض اوقات اس ''بہتان طرازی'' کے لیے اتنی گھٹیا اور بازاری زبان استعمال کی جاتی ہے کہ وہ ''دشنام طرازی'' کا گناہ بھی سمیٹ لیتی ہے، ایک حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی مسلمان کی جان، مال اور آبرو کو کعبۃ اللہ سے بھی زیادہ مقدس قرار دیا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ مسلمان کی جان، مال یا آبرو، پر ناروا حملہ کرنا (معاذ اللہ) کعبے کو ڈھانے سے بھی زیادہ سنگین گناہ ہے لیکن انتخابی مہم کے جوش میں مدمقابل کا کعبہ آبرو گلی گلی میں ڈھایا جاتا ہے اور اخباروں کے صفحات سے لے کر انتخابی جلسوں اور کارنر میٹنگز تک کوئی جگہ ایسی نہیں ہے جو بہتان تراشی اور دشنام طرازی کی عفونت سے بدبودار نہ ہو۔

۳۔ پھر چونکہ انتخابات کا موقع ایسا ہوتا ہے کہ کسی امیدوار کے بارے میں حقائق

منظرِ عام پر لانے کی واقعی ضرورت بھی ہوتی ہے، تاکہ عوام کو دھوکے اور نقصان سے بچایا جاسکے، اس لیے کسی امیدوار کے حقیقی اوصاف بیان کرنے کی توجیہہ کی جاسکتی ہے، لیکن اس کے لیے اول تو یہ ضروری ہے کہ کوئی بات ضروری تحقیق کے بغیر ناگوار فریضہ صرف بقدرِ ضرورت ہی انجام دیا جائے، اسے محض مزے لینے اور مجلس آرائی کا ذریعہ نہ بنایا جائے ورنہ اگر وہ بہتان نہ ہو، تب بھی غیبت کے اس گناہ عظیم میں داخل ہے جسے قرآن کریم نے مردہ بھائی کا گوشت کھانے کے مترادف قرار دیا ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ایک مجلس میں کسی شخص نے حجاج بن یوسف کی برائیاں بیان کرنی شروع کر دیں۔ حجاج کا ظلم وستم لوگوں میں مشہور تھا، لیکن چونکہ اس مقام پر برائی کرنے کا کوئی صحیح مقصد یا فائدہ نہیں تھا، اس لیے حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ یہ غیبت ہے اور اگر حجاج نے بہت سے لوگوں پر ظلم کیا ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ اب ہر شخص کے لیے اس کی غیبت حلال ہوگئی ہے۔ یاد رکھو کہ اللہ تعالیٰ اگر حجاج کے بے گناہوں کے خون کا حساب لے گا تو دوسرے سے اس کی ناروا غیبت کا بھی حساب لے گا۔

۴۔ دوسروں کی برائی اور ان پر الزام تراشی کے علاوہ انتخاب میں کامیابی کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ منہ بھر بھر کر خود اپنی تعریف اور اپنی خدمات کا مبالغہ آمیز تذکرہ کیا جائے۔ خودنمائی، نام ونمود اور دکھاوے کو مذہب واخلاق کے ہر نظام میں گناہ یا کم از کم برا ضرور سمجھا گیا ہے، لیکن ہماری انتخابی سیاست کے مذہب میں یہ عمل کسی قید وشرط کا پابند نہیں رہا۔

۵۔ عوام کو ووٹ دینے پر مائل کرنے کے لیے یہ بھی لازمی سمجھ لیا گیا ہے کہ ان سے سوچے سمجھے بغیر خوشنما وعدے کیے جائیں۔ وعدہ کرتے وقت اس بات سے بحث نہیں ہوتی کہ ان کو پورا کرنے کا کیا طریقہ ہوگا؟ اور اقتدار حاصل ہونے کے بعد وہ کس طرح روبعمل لائے جاسکیں گے؟ مسئلہ صرف یہ ہے کہ وعدوں کے نیلام میں کس طرح دوسروں سے بڑھ چڑھ کر بولی لگائی جائے؟..... ''ہم برسرِ اقتدار آکر غریبوں کی قسمت بدل دیں گے''، ''ہم پسماندہ علاقوں کو پیرس

کا نمونہ بنا دیں گے"، "ہم ہر ضلع میں ایک ہائی کورٹ قائم کر دیں گے"، "ہم غربت اور جہالت کا خاتمہ کر دیں گے" ...... اس قسم کے بلند بانگ دعوے اخباری بیانات سے لے کر تقریروں تک ہر جگہ سنائی دیتے ہیں اور ان جھوٹے دعوں اور وعدوں کے ذریعے سادہ لوح عوام کو بے وقوف بنانے کی کوشش کی جاتی ہے۔

۶۔ جلسے جلوس اور اشتہار بھی انتخابی سرگرمیوں کا ایک لازمی حصہ ہیں اور اگر وہ اخلاق و شرافت کی حدود میں ہوں تو ناجائز بھی نہیں، لیکن جلسوں جلوسوں میں غنڈہ گردی روزمرہ کا معمول بن چکی ہے جس کے نزدیک سیاسی حریفوں کی جان، مال اور آبرو کوئی قیمت نہیں رکھتی۔ چنانچہ جس وقت جس کا داؤ چل جائے وہ دوسروں کو زک پہنچانے میں کسر نہیں چھوڑتا۔

۷۔ پھر بعض اوقات انتخابی جلسے جلوس ایسے عام اور مصروف راستوں پر منعقد کیے جاتے ہیں جن کی وجہ سے شہر کی آبادی کے لیے نقل و حرکت محال ہو جاتی ہے اور ٹریفک کا ایسا مسئلہ کھڑا ہو جاتا ہے جو بے گناہ شہریوں کو عذاب میں مبتلا کر دیتا ہے، نہ جانے کتنے ضعیف اور بیمار لوگ اس قسم کی بدنظمی کی وجہ سے اپنے علاج سے محروم رہ جاتے ہیں کتنے ضرورت مند اپنے روزگار تک نہیں پہنچ پاتے اور اس طرح عام گذرگاہوں کو بلاک کر کے نہ جانے کتنے انسانوں کو ناقابل برداشت تکلیف پہنچانے کا گناہ عظیم اس قسم کے جلسوں جلوسوں کے حصے میں آتا ہے۔

۸۔ دیواروں کو انتخابی نعروں سے سیاہ کرنا اور شخصی اور سرکاری عمارتوں پر اشتہارات چسپاں کرنا بھی انتخابی مہم کا جزء لاینفک ہے جس کے نتیجے میں شہر کی بیشتر عمارتیں متضاد نعروں اور اشتہارات سے داغ دار نظر آتی ہیں اور کسی اللہ کے بندے کو یہ خیال نہیں آتا کہ کسی دوسرے کی عمارت کو اس کی مرضی کے بغیر استعمال کر کے اس کا حلیہ بگاڑنا درحقیقت چوری اور غصب کے مترادف ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ کسی دوسرے کی ملکیت کو اس کی خوش دلی کے بغیر استعمال کرنا حلال نہیں، عمارتیں اور دیواریں کسی نہ کسی کی ملکیت ہوتی ہیں اور

ان کو اپنے اشتہار کے لیے استعمال کرنا مالک کی اجازت کے بغیر حرام ہے، چہ جائے کہ ان کو خراب اور بدنما بنانا، لیکن غربت اور جہالت کے خاتمے کے دعویدار بے تکان اس چوری اور غصب کا ارتکاب کرتے ہیں اور اگر کوئی شریف انسان اس عمل سے روکنے کی کوشش کرے تو اسے پتھروں اور فائرنگ کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

۹۔ ووٹوں کی خرید وفروخت اور اس غرض کے لیے لوگوں کو رشوت دینا اور جن لوگوں کے قبضے میں بہت سے ووٹ ہوں، ان کے ناجائز کام کرا دینا یا اس کا وعدہ کر لینا ایک مستقل جرم ہے جو خدا اور آخرت سے بے فکر امیدواروں میں بہ کثرت رائج ہے اور اس نے معاشرے کو اخلاقی تباہی کے کنارے لا کھڑا کیا ہے۔

۱۰۔ ظاہر ہے کہ ساری انتخابی مہم چلانے کے لیے ہر جماعت کو کروڑوں روپیہ درکار ہوتا ہے کروڑوں روپے کے اس سرمائے کے حصول کے لیے جو طریقے اختیار کیے جاتے ہیں، ان میں غیر ملکی طاقتوں سے گٹھ جوڑ اور ان کی دی ہوئی لائن پر کام کرنا ایک ایسی بیماری ہے جو ملک کو دیمک کی طرح چاٹ رہی ہے اور جو لوگ باہر سے سرمایہ حاصل نہیں کر پاتے، وہ اپنے ہی ملک کے بڑے بڑے دولت مند افراد سے اپنی جماعتوں کے لیے چندے وصول کرتے ہیں اور بسا اوقات یہ چندہ درحقیقت اس بات کی رشوت ہوتا ہے کہ برسر اقتدار آنے کے بعد چندہ دینے والوں کو خصوصی مراعات دی جائیں گی اور اگر وہ دینے سے انکار کریں تو انہیں طرح طرح سے تنگ کیا جائے گا۔ جو جماعت جتنی زیادہ طاقتور ہے اور اس کے اقتدار میں آنے کے جتنے زیادہ امکانات ہیں، اس کی چندے کی اپیل اتنی ہی زیادہ مؤثر ہے۔

یہ دس موٹے موٹے گناہ محض مثال کے طور پر ذکر کیے گئے ہیں، لیکن اگر آپ باریک بینی سے غور فرمائیں تو نظر آئے گا کہ ان میں سے ہر گناہ بذات خود بہت سے گناہوں کا مجموعہ ہے اور انتخابی مہم کے دوران اسی قسم کے نہ جانے کتنے گناہوں کا ارتکاب دھڑلے سے ہو رہا ہے۔

اب غور فرمایئے! کہ جن حکومتوں کی بنیاد میں جھوٹ، الزام تراشی، بہتان، غیبت، خودستائی، جھوٹے وعدوں، دوسروں کے ساتھ غنڈہ گردی مخلوق خدا کی ایذا رسانی، دوسروں کی املاک پر ناجائز تصرف جیسے عظیم گناہ داخل ہوں، ان سے ملک وملت کو سکھ چین کس طرح نصیب ہو؟ اور جس ماحول میں ان گناہوں کی ظلمت چھائی ہوئی ہو، وہاں سے خیر وفلاح کی روشنی نمودار ہونے کی کیا توقع رکھی جائے؟

لیکن ان گذارشات کا مقصد محض تنقید برائے تنقید نہیں، نہ اس کا منشا یہ ہے کہ لوگوں میں مایوسی پھیلائی جائے۔ بلکہ مقصد صرف یہ ہے کہ کم از کم ہم اپنی بیماریوں سے آگاہ ہوں اور ان میں سے جس کسی بیماری کا سد باب اپنی قدرت میں ہو، اس سے دریغ نہ کریں اور کم از کم عام مسلمان ان گناہوں سے محفوظ رہنے کا اہتمام کریں جن میں وہ بعض اوقات نادانستہ طور پر مبتلا ہو جاتے ہیں۔ یہ سمجھنا چاہیے کہ اس ہنگامہ خیز طوفان میں ایک تنہا شخص خود کسی برائی سے رک جائے تو اس سے معاشرے پر مجموعی طور سے کیا اثر پڑ جائے گا؟

یاد رکھئے! کہ معاشرے سے گندگی جس چھوٹی سے چھوٹی مقدار میں بھی کم ہو، غنیمت ہے اور معاشرہ درحقیقت افراد ہی کے مجموعے سے عبارت ہے، یہاں چراغ سے چراغ جلتا ہے، لہٰذا بعض اوقات کسی ایک شخص کا عزم وہمت بھی معاشرے کی تبدیلی میں فیصلہ کن کردار ادا کرسکتا ہے۔

ہر فرد ہے ملت کے مقدر کا ستارا

دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ موجودہ انتخابات میں ایک عام مسلمان کے لیے راہ عمل کیا ہے؟ کیا انتخابات میں اچھلنے والی اس گند کو دیکھتے ہوئے یہ بہتر ہے کہ انسان اس ہنگامے سے مکمل یکسوئی اختیار کرے اور اپنا ووٹ بھی نہ ڈالے؟...... ہمارے نزدیک اس سوال کا جواب نفی میں ہے، یہ درست ہے کہ سیاسی فضا بدعنوانیوں کے گرد وغبار سے اٹی ہوئی ہے، یہ بھی درست ہے کہ ملک کی سیاسی افق پر امید کی کوئی ایسی کرن نظر نہیں آرہی جسے دیکھ کر ایک عام مسلمان مطمئن ہو سکے، لیکن یہ بھی اپنی جگہ حقیقت ہے کہ جو کچھ اوپر عرض کیا گیا ہے وہ مجموعی سیاسی فضا کے اعتبار سے عرض کیا گیا ہے اور اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ دنیا اچھائی سے بالکل خالی ہوگئی ہے، ظاہر ہے کہ بعض افراد اس مجموعی صورت

حال سے مستثنیٰ بھی ضرور ہوں گے اور انہیں تلاش کرنے کی ضرورت ہے۔ دوسرے ایک مسلمان کا کام مایوس ہو کر بے عمل ہو جانا نہیں، بلکہ اپنی بساط اور اپنی مقدور کی حد تک اپنا فرض ادا کرنا ہے، اس فریضے کی ادائیگی کے بعد نتائج اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہیں۔

انتخابات کی فضاء میں پائی جانے والی مذکورہ بالا خرابیوں کے باوجود بہر صورت! یہ ایک ایسا موقع ہے، جس میں ہر ووٹر اتنا کر سکتا ہے کہ وہ اپنے ووٹ کا وزن اس شخص کے پلڑے میں ڈال دے جس کو وہ ملک وملت کے لیے نسبتاً بہتر سمجھتا ہو۔ چنانچہ اس موقع سے ہر ووٹر کو فائدہ اٹھانا چاہیے اور اپنا ووٹ دیانتداری کے ساتھ صحیح جگہ استعمال کر کے اپنا فریضہ ادا کر دینا چاہیے۔

ووٹ کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ اس موضوع پر ایک مضمون البلاغ کے اسی شمارے میں الگ شائع ہو رہا ہے، لیکن اس کا خلاصہ یہ ہے کہ ووٹ کی حیثیت شرعی اعتبار سے ایک شہادت اور گواہی کی ہے، غلط جگہ ووٹ دینے میں جھوٹی گواہی کا سخت گناہ ہے اور اگر کسی ووٹر کے حلقے میں کوئی واقعتاً اہل شخص موجود ہے، تو اس کو ووٹ نہ دینے میں گواہی چھپانے کا گناہ ہے، لہٰذا اگر کسی حلقے میں کوئی ایسا امیدوار موجود ہے جس کو ایک ووٹر پوری دیانت داری سے تمام امیدواروں میں سب سے بہتر سمجھتا ہے اور جس کی کامیابی میں ملک وملت کا فائدہ دیکھتا ہے تو اس کو ووٹ دینا شرعاً بھی ضروری ہے، تاکہ گواہی چھپانے کا گناہ نہ ہو اور اگر کوئی شخص بھی کلی طور پر تو اہل نہیں ہے، لیکن ایک شخص زیادہ برا ہے اور دوسرا کم برا، تب بھی بڑی برائی کو روکنے کے لیے چھوٹی برائی کو اختیار کر لینا شریعت کا ایک اصول ہے، چنانچہ ایسی صورت میں بڑی برائی کو روکنے کی ہر ممکن کوشش کرنی چاہیے، خواہ اس کے لیے ایسے شخص کو ووٹ دینا پڑے جو پوری طرح اہل نہیں، لیکن اس کی برائی بڑی برائی کے مقابلے میں کم ہے۔ ہاں! اگر کسی جگہ تمام امیدوار یکساں حیثیت کے حامل ہیں اور کسی کو کسی پر فوقیت دینا ممکن نہیں ہے تو ایسی صورت میں بے شک خاموشی بہتر ہے اور ایسے موقع پر یہ جائز اور درست ہے کہ کسی کو بھی ووٹ نہ دیا جائے۔

ان اصولوں کو مدنظر رکھتے ہوئے اپنے ووٹ کا فیصلہ کرنا ہر مسلمان کے لیے ضروری ہے اور اس فیصلے پر پہنچنے کے لیے ہر ممکن تحقیق، تفتیش اور ملک وملت کے مجموعی

حالات کو مدنظر رکھنا بھی ضروری ہے۔ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو وہ فیصلہ کرنے کی توفیق عطا فرمائے جس میں ملک وملت کے لیے دین ودنیا کی بہتری ہو۔ آمین۔

وما علینا الا البلاغ.

محمد تقی عثمانی۔

۲۵ ربیع الاول ۱۴۱۴ھ۔

مضمون: ۱۳

یہ ناچ گانا بند کیجیے

اس وقت روز نامہ جنگ لاہور کی ہفتہ ۱۰ر جنوری ۱۹۸۷ء کی اشاعت ہمارے پیش نظر ہے اوراس میں ایک انتہائی شرم ناک خبر پڑھ کر ذہن اس حالت سے دوچار ہے جس میں اسے رنج واذیت کے اظہار کے لیے الفاظ میسر نہیں آتے۔ دکھے ہوئے دل سے بے ساختہ یہ کلمات ابھر۔تے ہیں کہ یا اللہ! ہم کہاں پہنچ گئے ہیں؟اور صبح سے لے کر شام تک ''اسلام''، ''اسلام'' کی رٹ لگانے کے باوجود عملی اعتبار سے اخلاقی دیوالیہ پن کی کن کن پستیوں میں گرے ہوئے ہیں؟

خبر کی تلخیص کرنے سے اس کے پورے مضمرات کا شاید اندازہ نہیں ہو سکے گا،اس لیے ذیل میں یہ خبر ''جنگ'' ہی کے الفاظ میں من وعن پیش خدمت ہے:۔

بازار حسن میں ناچ گانا پھر شروع ہو گیا:

ناچ گانے والیاں بالکونیوں میں کھڑی نہیں ہوں گی، دروازوں پر پردے لٹکائیں گی، پولیس حکام کے ساتھ مذاکرات میں فیصلہ ہم نے آرٹ کونسلوں سے زیادہ فن کی خدمت کی ہے، بازار حسن کے نمائندوں کا مؤقف۔

لاہور: (رپورٹنگ ڈیسک، نمائندہ جنگ) گذشتہ رات ٹبی پولیس اور بازار حسن کی نمائندہ تنظیم کے عہدیداروں کے مابین مذاکرات کے نتیجے میں ٹبی کے علاقے میں ناچ گانے کا کاروبار مشروط طور پر شروع ہو گیا۔ مذاکرات میں ڈی ایس پی چودھری غلام دسول، ایس ایچ او ٹبی سید پرویز شاہ کے مطابق یہ تو درحقیقت انسان کی روحانی تسکین کا ایک ذریعہ ہے۔

روحانی تسکین کے لیے انسان جس مذہب کو بہتر سمجھے اختیار کر لے۔ کسی کو بت پرستی میں زیادہ مزہ آتا ہے اسی میں اس کو زیادہ سکون ملتا ہے وہ اس کو اختیار کر لے اور

اگر کسی کو توحید میں زیادہ سکون ملتا ہے تو وہ اس کو اختیار کرلے...... سوال حق و باطل کا نہیں کہ کون سا مذہب حق ہے اور کون سا باطل ہے بلکہ یہ ہے کہ کس مذہب میں اس شخص کو زیادہ روحانی سکون محسوس ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے جو شخص بھی جو مذہب اختیار کرلیتا ہے وہ قابل احترام ہے اور اس میں کسی دوسرے کو دخل اندازی کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ چونکہ ذاتی اور پرائیویٹ زندگی کا معاملہ ہے لہٰذا زندگی کے دوسرے شعبوں میں اس کے عمل دخل کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔

لادینی جمہوریت کا نظریہ:

یہیں سے یہ نظریہ وجود میں آیا جس کو آج کی اصطلاح میں سیکولرازم کہتے ہیں ...... اس نظریۂ زندگی کا خلاصہ یہ ہے کہ جہاں تک زندگی کے اجتماعی کام ہیں معیار اور سیاست وغیرہ یہ ہر مذہب سے آزاد ہیں اور انسانی عقل، تجربہ، مشاہدہ اور جمہوری اقدار جس طریقے کو لیں ہر معاشرے میں وہ طریقہ اختیار کرنا چاہیے...... مذہب کی ان کے اوپر کوئی بالادستی نہیں ہوتی اور جہاں تک ذاتی زندگی کا سوال ہے تو جو شخص جس مذہب میں سکون پائے وہ مذہب اختیار کرلے کسی کو یہ کہنے کا حق نہیں کہ تمہارا یہ مذہب باطل ہے...... ہر شخص اپنے مذہب پر عمل کرنے میں آزاد ہے اس وجہ سے نہیں کہ وہ حق ہے، بلکہ اس وجہ سے کہ اس میں اس کو راحت وسکون میسر آتا ہے...... ان الفاظ میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ مذہب کا تصور آج مغربی نظریات کے تحت یہ ہے کہ ''مذہب کی کوئی حقیقت نہیں'' بلکہ لطف وسکون کے حصول کا ایک ذریعہ ہے...... ایک شخص کو اگر اپنے دنیاوی مشاغل کے فرصت کے وقت بندروں کے تماشے کو دیکھ کر ذہنی سکون ملتا ہے تو اس کے لیے بندروں کا تماشہ اچھی چیز ہے اور جس طرح بندروں کے تماشے کا حقیقی زندگی سے کوئی تعلق نہیں اسی طرح اگر کسی کو مسجد میں جا کر نماز میں لطف آتا ہے اور سکون ملتا ہے تو اس کے لیے یہی طریقہ مناسب ہے لیکن اس کا حقیقی زندگی سے کوئی تعلق یعنی اس سے بحث نہیں کہ مسجد میں جا کر نماز پڑھنا فی نفسہ حق ہے؟ یا باطل؟ (العیاذ باللہ) یہ ہوا ہے جو اس وقت پوری مغربی دنیا کے اوپر چھایا ہوا ہے...... اور اسی کا دوسرا نام ہے سیکولر ڈیمو کریسی لادینی جمہوریت......

آخری نظریہ:

اوراب تو بغلیں بجائی جارہی ہیں کہ دنیا کے اندر ہر نظام فیل ہوگیا ہے، اب صرف آخری نظریہ جو کبھی فیل ہونے والا نہیں ہے وہ یہی سیکولر ڈیموکریسی ہے۔ اسی موضوع پر امریکہ سے ایک کتاب شائع کی گئی ہے جو ساری دنیا کے اندر بڑی دلچسپی کے ساتھ پڑھی جارہی ہے...... لاکھوں کی تعداد میں اس کے نسخے فروخت ہوچکے ہیں اور اس کو اس دور کی عظیم ترین کتاب کی حیثیت سے متعارف کرایا جارہا ہے یہ کتاب امریکی وزارت خارجہ کے ترجمان نے ایک تحقیقی مقالے کی شکل میں لکھی ہے جس کا نام ہے۔ "THE END OF THE HISTORY AND THE LAST MAN" یعنی تاریخ کا خاتمہ اور آخری آدمی......اس کا پورا ماحصل یہ ہے کہ سوویت یونین کے خاتمے پر ایک تاریخ کا خاتمہ ہوگیا ہے اور آخری انسان جو ہر لحاظ سے مکمل ہے وہ وجود میں آگیا ہے...... یعنی سیکولر ڈیموکریسی کا نظریہ ثابت ہوگیا ہے اور اب رہتی دنیا تک اس سے بہتر کوئی نظام یا نظریہ وجود میں نہیں آئے گا۔

ہم پر الزام ہے کہ اسلام تلوار کے زور سے پھیلا:

جب مغربی استعمار نے اسلامی ملکوں پر اپنا تسلط جمایا تو اس نے اپنی لادینی جمہوریت کا تصور بھی پھیلایا اور بزور شمشیر پھیلایا مسلمانوں پر یہ الزام تھا کہ انہوں نے اسلام تلوار کے زور پر پھیلایا، حالانکہ خود مغرب نے اپنا ڈیموکریسی کا نظام زبردستی اور بزور شمشیر پھیلایا ہے، اسی کی طرف اکبر مرحوم نے اپنے مشہور قطعے میں اشارہ کیا تھا کہ

اپنے عیبوں کی کیا آپ کو کچھ پرواہ ہے
غلط الزام بھی اوروں پہ لگا رکھا ہے
یہی فرماتے رہیں تیغ سے پھیلا اسلام
یہ نہ ارشاد ہوا توپ سے کیا پھیلا ہے

توپ وتفنگ کے بل بوتے پر انہوں نے پہلے سیاسی تسلط قائم کیا اس کے بعد رفتہ رفتہ سیاسی اور معاشی اداروں سے دین کا رابطہ توڑا......اور اس رابطے کو توڑنے کے لیے ایسا تعلیمی نظام وجود میں لائے جو ہندوستان میں لارڈ میکالے نے متعارف کرایا اور کھلم

کے ساتھ کمر بستہ رہتا ہے۔

جتنے مسلم ممالک میں دائیں بازو کی حکومتیں برسر اقتدار ہیں، ان سب میں صورت حال یہی ہے کہ نام کی حد تک وہ اسلام سے وابستگی کا اظہار کرتی رہتی ہیں، لیکن یہ وابستگی زبانی جمع خرچ، خوبصورت بیانات اور شاندار کانفرنسوں کی حد تک محدود ہے، پاکستان کے علاوہ مسلم ملکوں میں سے اس وقت مصر، اردن، ترکی، انڈونیشیا، مراکش، غرض دائیں بازو کے جس ملک کو دیکھئے، وہاں صورت حال یہی ہے کہ اسلام صرف کانفرنس ہالوں، اخباری بیانات اور علمی مقالات کی زینت ہے۔ لیکن جہاں تک ''نفاذ شریعت'' کے عملی کام کا تعلق ہے، وہ نہ صرف یہ کہ صفر ہے، بلکہ سرکاری مشینریوں کی ساری توانائی اس کی مخالف سمت میں خرچ ہو رہی ہے۔ دینی حلقے معتوب ہیں، ان پر عرصہ زندگی تنگ کیا جا رہا ہے۔ نفاذ شریعت کے لیے اٹھنے والی ہر آواز کو دبانے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگ رہا ہے۔ شراب نوشی فروغ پا رہی ہے۔ نائٹ کلب آباد ہیں، عریانی و فحاشی کا بازار گرم ہے، ٹیلیویژن اور وی سی آر کے ذریعے گھر گھر میں مغربی بداخلاقی کا ننگا ناچ جاری ہے اور جو کوئی ان برائیوں کے خلاف بولے، وہ یا تو گردن زدنی ہے، یا کم از کم ''رجعت پسند''، تنگ نظر، دقیانوسی، جنونی، پسماندہ اور بنیاد پرست کے طعنوں سے لہولہان ہے۔

دوسری طرف روس جب ایک عرصے تک اپنی مذہب دشمن پالیسیوں کی بناء پر دنیا بھر میں بدنام ہو گیا اور اس نے محسوس کیا کہ امریکا نے مسلم ممالک میں اس کے آگے مذہب کی دیوارِ سکندری کھڑی کر دی ہے تو اس نے بھی اپنی پالیسی میں تبدیلی کر کے بہت سے ملکوں میں نہ ہی امریکی ڈپلومیسی اختیار کر لی۔ اس کا نعرہ یہ تھا کہ مذہب تو درحقیقت اشتراکیت کا حریف نہیں، بلکہ اس کا حامی ہے اور خاص طور پر اسلام تو دنیا میں (معاذ اللہ) آیا ہی اس لیے تھا کہ اشتراکیت کا قیام عمل میں لائے، اس طرح اشتراکی بلاک نے اسلام کے صرف نعرے ہی کو نہیں، بلکہ اس کی معاشی تعلیمات کو مسخ اور تحریف کر کے استعمال کرنا شروع کر دیا، چنانچہ جو مسلم ممالک بائیں بازو سے تعلیمات رکھتے ہیں۔ مثلاً الجزائر اور لیبیا وغیرہ، وہاں بھی اب اسلام کا نام بڑے زور و شور سے لیا جاتا ہے۔ بلکہ اسلام کی صحیح نمائندگی کے بلند بانگ دعوے بھی کیے جاتے ہیں۔ لیکن جہاں تک حقیقی اسلام کا تعلق ہے، وہ وہاں بھی اتنا ہی مظلوم اور ستم ظریفیوں کا

شکار ہے جتنا دائیں بازو کے ممالک ہیں۔

اس لحاظ سے اگر اسلام سے عداوت اور اس کی راہ میں رکاوٹ بننے کے معاملے میں پہلے امریکہ اور روس کے درمیان کوئی فرق تھا بھی، تو اب وہ بھی ختم ہو چکا ہے اور حقیقی اسلام کے نفاذ کے معاملے میں دونوں کا طرز عمل ایک ہی جیسا ہے۔ اب اسلام کے نام سے دونوں میں سے کسی کو کد نہیں، بلکہ دونوں اسے اپنے اپنے مقصد کے لیے استعمال کر رہے ہیں، لیکن یہ بات دونوں کے ذہن میں واضح ہے کہ حقیقی اسلام ہم میں سے ہر ایک کی موت ہے اور اگر کہیں ''حقیقی اسلام'' آ گیا تو وہ ایک تیسری طاقت بن کر دونوں کا کام تمام کر دے گا۔

یہ حقیقت ہے کہ اسلام دشمنی کے معاملے میں امریکہ اور روس ایک ہیں (اور کچھ تعجب نہیں کہ انہوں نے اس سلسلے میں مصالحت کے ذریعے بندر بانٹ بھی کر رکھی ہو) ہم عرصہ دراز سے محسوس تو کرتے تھے اور جو حالات روزمرہ سامنے آتے رہتے ہیں، ان سے اس احساس کو تقویت بھی پہنچتی رہتی تھی، لیکن کچھ عرصہ پہلے امریکہ کی ایک نہایت ذمہ دار شخصیت نے اس حقیقت کو کھلے لفظوں میں بیان بھی کر دیا ہے۔ یہ ذمہ دار شخصیت سابق امریکی صدر رچرڈ نکسن ہیں، جو عرصہ دراز تک امریکہ کے صدر رہے ہیں اور ان کی سوچ کو بجا طور پر امریکہ کی مجموعی سوچ کا ترجمان کہا جا سکتا ہے۔

انہوں نے تقریباً ڈیڑھ سال پہلے امریکہ سے نکلنے والے ماہنامے ''فارن افیئرز'' میں امریکہ اور روس کے تعلقات کے موضوع پر ایک مضمون لکھا ہے۔ اس مضمون کا ایک اقتباس مجھے حال ہی میں پڑھنے کا اتفاق ہوا۔ اس مضمون میں وہ لکھتے ہیں:

> ''ہم (امریکی) لوگ جب سوویٹس (روسیوں) کو ان اقدامات کا ذمہ دار قرار دیتے ہیں جو وہ ہمارے مفادات کے خلاف کرتے ہیں وہاں ہمیں یہ بھی محسوس کرنا چاہیے کہ وہ دنیا میں پیدا ہونے والی تمام مشکلات کے ذمہ دار نہیں ہے۔ خام مال پیدا کرنے والی قوموں اور ان کو صرف کرنے والی قوموں کے درمیان پایا جانے والا آمدنی کا تفاوت، آب و ہوا کے اسباب کے تحت پڑنے والا قحط، مسلمان بنیاد پرستوں کی انقلابی تحریک اور دہشت گردی کی

تحریک جو لیبیا اور ایران سے ابھر رہی ہے...... یہ سارے مسائل ایسے ہیں کہ اگر بالفرض روس موجود نہ ہوتا تب بھی یہ مسائل موجود ہوتے۔ لیکن بجائے اس کے کہ ان مسائل کا استحصال کیا جائے، روس کو چاہیے کہ وہ ان مسائل سے نبرد آزما ہونے میں ریاست ہائے متحدہ امریکہ اور دوسری مغربی اقوام کے ساتھ شریک ہو جائے۔ روسیوں کو خاص طور پر مسلم بنیاد پرستی کے ابھار پر زیادہ تشویش ہونی چاہیے، صرف اس لیے کہ روس کی ایک تہائی آبادی مسلمان ہے، بلکہ اس لیے بھی کہ تیسری دنیا کے عوام کی حمایت کے معاملے میں اسلامی انقلاب اشتراکی انقلاب کا پورا حریف بننے کی صلاحیت رکھتا ہے۔"

یہ ہے اس "دائیں بازو" کے سربراہ اعلیٰ کا ذہن جسے روس کے مقابلے میں "اسلام سے قریب تر" سمجھا جاتا ہے۔ مسلم بنیاد پرستی کی اصطلاح امریکہ ہی سے چلی ہے اور اس کا مطلب ہے راسخ العقیدہ مسلمانوں کی تحریک نشاۃ ثانیہ۔ اس مسلم بنیاد پرستی کو امریکہ نے دنیا میں بدنام کرنے اور اس لفظ کو ایک گالی بنا دینے کی باقاعدہ مہم شروع کر رکھی ہے اور مذکورہ بالا اقتباس میں رچرڈ نکسن صاحب نے جس طرح اس لفظ کو قحط زدگی اور دہشت گردی کے ساتھ ملا کر ایک ہی سانس میں ذکر کیا ہے، اس سے اس شدید بغض اور نفرت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے جو ان لوگوں کے دل میں حقیقی اسلام کے خلاف موجزن ہے۔

قد بدت البغضاء من افواههم وما تخفی صدورهم اکبر

"ان لوگوں کے منہ سے بغض ظاہر ہو گیا ہے اور جو کچھ ان کے سینوں میں چھپا ہوا ہے وہ اس سے بھی زیادہ ہے۔"

اور بات صرف اتنی ہی نہیں ہے کہ یہ بغض اس اقتباس میں منظر عام پر آ گیا بلکہ ساتھ ہی نکسن صاحب اپنے سب سے بڑے حریف روس کو بھی باقاعدہ دعوت دے رہے ہیں کہ وہ اس فتنے کے خلاف جنگ میں امریکہ کے ساتھ شریک ہو جائے اور اسے

متنبہ فرمارہے ہیں کہ روس کے لیے مسلمانوں کا خطرہ زیادہ سنگین ہے، کیونکہ روس کی ایک تہائی آبادی مسلمان ہے اور ستم رسیدہ عوام کے لیے اسلام کے پاس ایک ایسا پرکشش نظام زندگی بھی موجود ہے جو کسی وقت اشتراکیت کو بھی مات دے سکتا ہے۔ نکسن صاحب کا یہ اقتباس پڑھ کر ہمیں اقبال کی مشہور نظم ''ابلیس کی مجلس شوریٰ'' یاد آ گئی، جس میں ابلیس نے اپنے چیلوں کے سامنے فیصلہ کن انداز میں کہا تھا کہ:

جانتا ہوں میں جو رنگ گردن ایام ہے
مزدکیت فتنہ فردا نہیں، اسلام ہے

بہرصورت! ہم سابق صدر امریکہ رچرڈ نکسن صاحب کے ممنون ہیں کہ انہوں نے اپنے اس مضمون کے ذریعے ہمارے احساس کی کھلے الفاظ میں تصدیق فرمادی کہ اسلام کی دشمنی میں امریکہ اور روس دونوں ایک ہیں اور ان میں سے کسی کو بھی کسی پر فوقیت نہیں دی جاسکتی۔

اس کے بعد ان سادہ لوح مسلمانوں کی آنکھیں کھل جانی چاہئیں جو امریکہ کو نسبتاً اسلام دوست سمجھتے ہیں جنہوں نے نفاذ اسلام کی تحریک کو ''دائیں بازو'' کی تحریک کے ساتھ وابستہ کر رکھا ہے اور جو دائیں بازو کے عنوان سے اپنی پہچان کرانے میں کوئی جھجک محسوس نہیں کرتے۔

محمد تقی عثمانی

۱۴/رجب ۱۴۰۷ھ

مضمون:۱۵

شریعت اور عوام کی خواہشات

۱۳؍ربیع الثانی ۱۴۰۸ھ مطابق ۵؍دسمبر ۱۹۸۷ء کے روزنامہ جنگ کے صفحہ اول میں جلی سرخیوں کے ساتھ یہ خبر شائع ہوئی ہے:

> ''مدینہ منورہ (نمائندہ خصوصی) وزیر اعظم محمد خان جونیجو نے مدینہ منورہ میں پاکستانیوں کے اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے کہا ہے کہ ملک میں وہی شریعت نافذ ہوگی جو سب کے لیے قابل قبول ہو۔''

کاش! کہ ہمارے ملک کے انتظامی سربراہ اس کے بجائے یہ فرماتے کہ:

> ''ملک میں وہ شریعت نافذ ہوگی جو اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے قابل قبول ہو۔''

لیکن در حقیقت یہ فقرہ اس بات کی غمازی کر رہا ہے کہ ذہن میں ''نفاذ شریعت'' کا نہ صرف یہ کہ تصور واضح نہیں ہے بلکہ وہ شریعت اور اس کے نفاذ کے بارے میں شدید غلط فہمیوں میں الجھا ہوا ہے۔ یہ غلط فہمیاں ایک ایسی ذہنیت کی پیداوار ہیں جس نے اس ملک میں چالیس سال سے نفاذ شریعت جیسے اہم مسئلے کو معرض التواء میں ڈالا ہوا ہے۔

اس ذہنیت کی پہلی خرابی تو یہ ہے کہ اس کے نزدیک ''شریعت'' کا نفاذ عوام کی مرضی کے تابع ہے۔ اگر عوام چاہیں گے تو وہ نافذ ہوگی، ورنہ نافذ نہیں ہوگی۔ اس طرز فکر کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ ہم نے ایک عرصے سے جمہوریت، جمہوری اقدار، جمہوری افکار اور جمہوری آزادیوں کا وظیفہ سمجھے بوجھے بغیر اتنی کثرت سے پڑھا ہے کہ جمہوریت بذات خود ''خیر مطلق'' بن کر رہ گئی ہے۔ وہی ہمارے فکر و عمل کا آخری ہدف بنی ہوئی ہے، اسی کے قیام اور بحالی کے لیے ہم نے تن من کی بازی لگا رکھی ہے، اسی کو ہم نے ایسا مرکز نجات قرار دے رکھا ہے کہ گویا ہماری اجتماعی فلاح و بہبود کا ہر کام اسی

''جمہوریت'' سے حاصل ہوگا اور جو بھلائی ''جمہوریت'' کے علاوہ کسی اور ذریعہ سے حاصل ہو، وہ بھلائی کہلانے کی مستحق ہی نہیں ہے۔

اسی ذہنیت کا ایک شاخسانہ یہ ہے کہ اس کے نزدیک اسلام بھی وہی معتبر ہے جو جمہوری طریقوں سے یا جمہوری روایات کے تحت آئے۔ اس کے بغیر (معاذ اللہ) اسلام کی کوئی بات بھی قابل قبول نہیں ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ جب تک یہ الٹا طرز فکر باقی رہے گا، ملک میں حقیقی اسلام کا نفاذ ہرگز نہیں ہو سکے گا۔ اس لیے کہ یہ طرز فکر اسلام اور شریعت کے بنیادی مفہوم ہی سے متضاد ہے۔ اسلام اللہ تعالیٰ کے آگے جھک جانے کا نام ہے اور اس کی شریعت کے واجب العمل ہونے کی وجہ یہ ہے کہ وہ اللہ کا حکم ہے اور ایک بندے کی حیثیت سے ہمارا فرض ہے کہ اسے مان کر اس پر عمل کریں۔ خواہ عوام اس سے خوش ہوں یا ناراض ہوں۔ اتباع شریعت کا مقصد مخلوق کو نہیں، خالق کو راضی کرنا ہے۔ لہٰذا اس کے نفاذ کے پیچھے قوت حاکمہ عوام کی مرضی نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ کی مرضی ہے۔ اسلام عوام کے پیچھے پیچھے چلنے اور ان کی خواہشات کی پیروی کے لیے نہیں، ان کی قیادت و رہنمائی کرنے اور انہیں نفسانی خواہشات کی غلامی سے نکالنے آیا ہے۔ قرآن کریم کا ارشاد ہے:

ولو اتبع الحق اھوآءھم لفسدت السموت والارض

''اگر حق ان لوگوں کی خواہشات کے تابع ہو جائے تو آسمان و زمین میں فساد پھیل جائے۔''

اسلام تو ایسے ماحول میں آیا تھا کہ اس کے اردگرد عوام کی اکثریت شروع میں اسے ناپسند کرتی تھی اگر عوام کی مرضی ہی فیصلہ کن ہوتی تو اسلام کو کبھی بھی نافذ نہیں ہونا چاہیے تھا۔ وہ تو ہمیشہ مخالفین کے نرغے میں پروان چڑھا ہے، اس نے لوگوں کے طعنے سہہ کر اور ملامتیں سن کر اپنی راہ بنائی ہے اور عوام کی خواہشات کے پیچھے چلنے کے بجائے ان کی اصلاح کو اپنی منزل مقصود قرار دیا ہے۔ لہٰذا اسلام کو عوام کی مرضی اور جمہوریت کے تابع قرار دینا درحقیقت اسلام کے بنیادی تصور ہی سے متضاد ہے۔

پھر یہ بھی عجیب ستم ظریفی ہے کہ عموماً سب کے لیے قابل قبول ہونے کے اس

نظریئے کی ساری زد بے چاری شریعت ہی پر پڑتی ہے۔ یہ خیال ہمارے جمہوریت پسند حکام اور دانشوروں کو بہت کم آتا ہے کہ جو قوانین ہم پر چالیس سال سے مسلط چلے آرہے ہیں وہ کتنے افراد کے لیے قابل قبول ہیں؟ وہ کونسے عوامل ہیں جنہوں نے ان قوانین کو سند منظوری عطا کی ہے؟ اور سب کے لیے قابل قبول کی یہ شرط ان قوانین پر کیوں لاگو نہیں ہوتی؟ وہاں تو حال یہ ہے کہ ایک بددینی اور غیر مسلم حاکم ہمارے سینوں پر بندوق رکھ کر یہ قوانین ہمارے سروں پر مسلط کر گیا اور ہم ہیں کہ انہیں چالیس سال سے اپنے اوپر نہ صرف لادے چلے آرہے ہیں بلکہ مسلمان عوام کی فریاد و فغان کے باوجود اس بات پر مصر ہیں کہ یہ قوانین غیر محدود مدت تک عوام پر مسلط رہیں گے، تا آنکہ ایسی ''شریعت'' وجود میں نہ آجائے جو سب کے لیے قابل قبول ہو۔

یہ ایک کھلی حقیقت ہے کہ اگر اسلام کو ٹھیک نافذ کیا جائے تو اس کے نتیجے میں بہت سے لوگوں کے ذاتی مفادات کو نقصان پہنچے گا، کسی کی آمدنی کم ہو جائے گی، کسی کے خرچ میں اضافہ ہوگا، کسی کی لیڈری جاتی رہے گی، کسی کے منصب پر حرف آئے گا، کسی کے بے مہار آزادی میں فرق پڑے کسی کے عیش و تنعم میں کمی ہوگی اور ایسے افراد جو ملکی اور ملی مسائل کو اسی قسم کے مفادات کے دائرے میں رہ کر سوچتے ہیں، وہ یقیناً ایسے احکام کے نفاذ کی مخالفت کریں گے یا کم از کم انہیں ناگوار سمجھیں گے جو ان کے ذاتی مفادات کے خلاف ہیں۔ اس کے علاوہ اسی ملک میں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جن کی تعد کم ہے لیکن اثر و رسوخ خاصا ہے اور وہ نظریاتی طور پر اسلامی قانون کے بجائے لادینی طرز زندگی کو پسند کرتے ہیں اور نفاذ اسلام کے ہر اقدام کی کسی نہ کسی حیلے بہانے سے مخالفت کرتے رہتے ہیں، ظاہر ہے کہ ایسے لوگ اسلام کے ٹھیک ٹھیک نافذ ہونے سے کیسے خوش ہو سکتے ہیں؟ لہٰذا سب خوش رہیں، کی پالیسی کے ساتھ شریعت کا نفاذ عملاً ممکن ہی نہیں ہے۔ اگر شریعت پر عمل کرنا ہے اور اللہ کے لیے کرنا ہے تو اس کے لیے کچھ حلقوں کی مخالفت مول لینی ہی پڑے گی، اگر ہم اس مخالفت کے لیے تیار نہیں ہیں تو نفاذ شریعت کے کام سے ہمیشہ کے لیے ہاتھ دھو لینے چاہئیں۔

تیسرے یہ ''سب کے لیے قابل قبول'' ہونے کی شرط تو ایسی ہے کہ اگر اس پر ٹھیک معنی میں عمل کیا جائے تو کسی جمہوری ملک میں کوئی سیکولر قانون بھی نافذ نہیں

ہوسکتا، کوئی بڑے سے بڑا جمہوری ملک بھی یہ دعویٰ نہیں کرسکتا کہ اس کے تمام قوانین سے اس کے تمام باشندے مکمل طور پر مطمئن اور خوش ہیں، کیونکہ سب کو پوری طرح خوش رکھنے کا کوئی طلسماتی نسخہ اس ڈھیٹ جمہوری حکومت کے پاس بھی نہیں ہے جسے عوام کی حکومت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ کیونکہ وہاں بھی زیادہ سے زیادہ یہی کہا جاسکتا ہے کہ اکثریت کی منظوری حاصل کرلی جائے اور وہ اکثریت بھی قانونی اکثریت ہوتی ہے جس کا حقیقی اکثریت ہونا ضروری نہیں ہے۔

اب یہ منطق کس قدر عجیب ہوگی کہ دنیا کی ہر بات کو نافذ کرنے کے لیے تو اکثریت کا اتفاق کافی ہے، لیکن شریعت کے نفاذ کے لیے سب کا اتفاق ضروری قرار دیا جائے، جس کا حصول کم از کم اسباب وظواہر کی اس دنیا میں عملاً ناممکن ہے۔

محترم وزیراعظم نے جو بات کہی ہے کہ ایسی شریعت نافذ ہوگی جو سب کے لیے قابل قبول ہو تو شاید اس سے اس بات کی طرف اشارہ مقصود ہو کہ ہمارے ملک میں مختلف فرقے یا مکاتب فکر پائے جاتے ہیں اور نفاذ شریعت کے لیے ان سب کا اتفاق ضروری ہے۔

لیکن اس سلسلے میں بھی ہماری گزارش یہی ہے کہ اگر اسی اتفاق کا مطلب یہ ہے کہ ہر ہر جزوی قانون پر تمام مکاتب فکر کا اتفاق ضروری ہے تو ایسا اتفاق بھی بحالات موجودہ ناممکن ہے۔ اگرچہ مسلمانوں کے فرقہ وارانہ اختلافات کا جو شور مچا ہوا ہے، کم از کم قانونی مسائل میں یہ اختلاف اتنے زیادہ اور اتنے سنگین نہیں ہیں، تاہم بہت سے جزوی قوانین ایسے ہیں جن میں مختلف مکاتب فکر کے نظریات آپس میں متضاد ہیں اور جزوی قوانین کی حد تک سب کا اتفاق حاصل نہیں ہوسکتا۔

کیا اس عدم اتفاق کا نتیجہ یہ ہونا چاہیے کہ شریعت کبھی نافذ نہ ہو اور انگریزی قانون بدستور مسلط رہیں؟ ظاہر ہے کہ اس سوال کا جواب نفی میں ہے اور اس مسئلے کا حل معقولیت کے ساتھ تلاش کیا جائے تو اس کے دو ہی راستے عقلاً ممکن ہیں۔ ایک یہ کہ کوئی بالاتر اتھارٹی ایسی ہو جو ان مکاتب فکر کے نظریات میں حق و باطل کا فیصلہ کرنے کی صلاحیت رکھتی ہو اور اس فیصلے کے مطابق جو نظریہ حق ہو، اسے قانون بنادیا جائے، لیکن اگر ایسی کوئی اتھارٹی موجود نہیں ہے تو پھر رفع نزاع کا کوئی راستہ اس کے سوا ممکن نہیں

ہے کہ بنیادی طور پر شریعت کی اس تعبیر کو اختیار کیا جائے جو ملک کے اکثریتی مکتب فکر کی تعبیر ہو۔ البتہ جو معاملات عبادات اور نکاح وطلاق اور وراثت سے متعلق ہیں، ان میں ہر مسلم مکتب فکر کے لیے الگ قانون سازی کی جائے۔

چنانچہ ۱۹۵۱ء میں ملک کے تمام مکاتب فکر کے سربرآوردہ علماء نے جمع ہوکر جو ۲۲ دستوری نکات مرتب کیے تھے، اس میں سب نے اس اصول پر اتفاق کیا تھا کہ ملک کا عام قانون ایک ہوگا، لیکن ہر مکتب فکر کے شخصی قوانین میں اسی مکتب فکر کی تشریح وتعبیر معتبر ہوگی اور یہی بات ۱۹۷۳ء کے دستور میں بھی طے کردی گئی ہے اور حقیقت یہ ہے کہ اس کے سوا اس مسئلے کا کوئی حقیقت پسندانہ، منصفانہ اور قابل عمل حل کوئی اور نہیں ہوسکتا۔

یہ حل ۱۹۵۱ء اور ۱۹۵۳ء میں علماء کے مشترک اجتماع میں بھی تجویز کیا گیا تھا اور اس کے بعد ۱۹۷۳ء کے دستور میں اسے باقاعدہ آئینی حیثیت بھی دے دی گئی۔ جس کے بعد فرقہ وارانہ اختلافات کا مسئلہ ہمیشہ کے لیے طے ہو جانا چاہیے اور اب ازسرنو اس مسئلے کو اٹھانا ایک طے شدہ بات کو بلاوجہ پیچیدہ بنانے کے مترادف ہے۔

آخر میں ہم محترم وزیراعظم کی خدمت میں یہ دردمندانہ گزارش کرنا چاہتے ہیں کہ پاکستان میں شریعت کا نفاذ اس ملک کی حیات اور بقاء کے لیے اتنا ہی ضروری ہے جتنا کسی جسم کے زندہ رہنے کے لیے اس میں روح کا وجود ضرور ہوتا ہے۔ یہ اس لیے بھی ضروری ہے کہ ہم سب مسلمان ہیں اور ہم پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ فرض عائد ہے کہ ہم اس کے احکام کو اس کی زمین پر نافذ کریں، اس لیے بھی ضروری ہے کہ پاکستان کے مقصد کا وجود ہی یہ تھا کہ اس خطے میں مسلمان اپنے دین کو عملاً نافذ کریں۔ اس لیے بھی ضروری ہے کہ موجودہ حکومت کی وجہ جواز اسلام کے نفاذ کے سوا کچھ اور نہیں اور وہ انہی وعدوں کے ساتھ برسراقتدار آئی ہے کہ وہ اپنے اقتدار کے زمانے میں نفاذ اسلام کا فریضہ انجام دے گی۔

لہٰذا موجودہ حکومت پر پچھلی تمام حکومتوں سے زیادہ یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ اپنا یہ فریضہ اخلاص اور تندہی کے ساتھ انجام دے۔ اقتدار نے کبھی کسی کا ساتھ نہیں دیا۔ یہ سایہ کسی بھی وقت ڈھل سکتا ہے۔ لیکن اقتدار کے سائے میں انجام دیئے ہوئے اچھے برے کام صرف تاریخ ہی میں محفوظ نہیں ہوئے، بلکہ اس جہاں میں بھی ریکارڈ

ہو جاتے ہیں جہاں ہر انسان کو اپنے ہر عمل کا حساب دینا ہے۔

خدا کرے کہ اس حقیقت عظمیٰ کے استحضار کے ساتھ ہم سب کے دل میں مخلوق کے بجائے اپنے خالق کو راضی کرنے اور اس کی خوشنودی حاصل کرنے کی فکر پیدا ہو جائے، تو ہمارے تمام مسائل حل ہو جائیں۔

اللهم ارنا الحق حقا وارزقنا اتباعه وارنا الباطل باطلا وارزقنا اجتنابه. آمین

محمد تقی عثمانی

۲۰ ربیع الثانی ۱۴۰۸ھ

مضمون:۱٦

معاملات کی صفائی اور تنازعات

ہمارے معاشرے میں آپس کے جھگڑوں اور تنازعات کا جو سیلاب اُمڈا ہوا ہے اس کا تھوڑا سا اندازہ عدالت میں دائر ہونے والے مقدمات سے ضرور ہوسکتا ہے لیکن یہ اندازہ یقیناً ناکافی اور حقیقت سے بہت کم ہوگا کیونکہ بے شمار تنازعات وہ ہیں جن کے عدالت تک پہنچنے کی نوبت ہی نہیں آتی۔ عدالت سے رجوع کرنے میں وقت اور پیسے کا جو بے تحاشا صرفہ ہوتا ہے اس کی وجہ سے بہت سے لوگ عدالت سے رجوع نہیں کر پاتے۔ اس کے بجائے فریقین میں سے ہر ایک اپنی اپنی بساط کی حد تک دوسرے کو زد پہنچانے کی کوشش کرتا رہتا ہے اور اس طرح عداوت کی آگ بھڑکتے بھڑکتے کئی کئی پشتوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہے۔

ان تنازعات کی تہہ میں اگر دیکھا جائے تو زر اور زمین کے معروف اسباب کارفرما نظر آتے ہیں۔ روپیہ پیسہ اور زمین جائیداد کا جھگڑا بڑے بڑے پرانے تعلقات کو دیکھتے ہی دیکھتے بھسم کر ڈالتا ہے اور اس کی وجہ سے بڑی بڑی مثالی دوستیاں آن کی آن میں دشمنیوں میں تبدیل ہو جاتی ہیں۔

اس صورت حال کے بہت سے اسباب ہیں۔ لیکن ایک بہت بڑا سبب معاملات کو صاف نہ رکھنا ہے۔ ہمارے دین کی ایک انتہائی زریں تعلیم یہ ہے کہ:

> ''آپس میں رہو بھائیوں کی طرح، لیکن لین دین کے معاملات اجنبیوں کی طرح کرو۔''

مطلب یہ ہے کہ روزمرہ کی زندگی میں ایک دوسرے کے ساتھ برتاؤ ایسا کرو جیسے ایک بھائی کو دوسرے کے ساتھ کرنا چاہیے۔ اس میں ایثار، مروت، رواداری، تحمل اور اپنائیت کا مظاہرہ کرو۔ لیکن جب روپے پیسے کے لین دین، جائیداد و معاملات اور شرکت و حصہ داری کا مسئلہ آجائے تو بہتر تعلقات کی حالت میں بھی انہیں اس طرح

انجام دو جیسے دو اجنبی شخص انہیں انجام دیتے ہیں۔ یعنی معاملے کی ہر بات صاف ہونی چاہیے۔ کوئی بات ابہام میں رہے اور نہ معاملے کی حقیقت میں کوئی اشتباہ باقی رہے۔

اگر محبت، اتفاق اور خوشگوار تعلقات کی حالت دین کی اس گرانقدر تعلیم پر عمل کرلیا جائے تو بعد میں پیدا ہونے والے بہت سے فتنوں اور جھگڑوں کا سد باب ہو جاتا ہے۔ لیکن ہمارے معاشرے میں اس اہم اصول کو جس طرح نظر انداز کیا جارہا ہے اس کے چند مظاہر یہ ہیں:

۱۔ بسا اوقات ایک کاروبار میں کئی بھائی یا باپ بیٹے مشترکہ طور پر ایک ساتھ کام کرتے ہیں اور کسی حساب و کتاب کے بغیر لوگ مشترکہ کاروبار سے اپنی اپنی ضرورت کے مطابق خرچ کرتے رہتے ہیں نہ یہ بات طے ہوتی ہے کہ کاروبار میں کس کی کیا حیثیت ہے؟ آیا وہ کاروبار میں تنخواہ پر کام کر رہے ہیں؟ یا کاروبار کے حصہ دار ہیں؟ تنخواہ ہے تو کتنی؟ اور حصہ ہے تو کس قدر؟ بس ہر شخص اپنی خواہش یا ضرورت کے مطابق کاروبار کی آمدنی استعمال کرتا رہتا ہے اور اگر کبھی کوئی شخص یہ تجویز پیش کرے کہ کاروبار میں حصے یا تنخواہ وغیرہ متعین کرلینی چاہیے تو اسے محبت اور اتفاق کے خلاف سمجھا جاتا ہے۔

لیکن یہ روزمرہ کا مشاہدہ ہے کہ اس طرح کے کاروبار کا انجام اکثر و بیشتر یہ ہوتا ہے کہ دل ہی دل میں ایک دوسرے کے خلاف رنجشیں پرورش پاتی رہتی ہیں۔ بالخصوص جب حصہ داروں کے یہاں شادیاں ہو جاتی ہیں تو ہر شخص یہ محسوس کرنے لگتا ہے کہ دوسرے نے کاروبار سے زیادہ فائدہ اٹھایا ہے اور مجھ پر ظلم ہوا ہے۔ اگرچہ ظاہری سطح پر باہم رورعایت کا وہی انداز باقی نظر آتا ہے۔ لیکن اندر ہی اندر رنجشوں کا لاوا پکتا رہتا ہے اور بالآخر جب یہ رنجشیں، بدگمانیوں سے مل کر پہاڑ بن جاتی ہیں تو یہ آتش فشاں پھٹ پڑتا ہے اور محبت و اتفاق کے سارے دعوے دھرے کے دھرے رہ جاتے ہیں۔ زبانی تو تکار سے لے کر لڑائی جھگڑے اور مقدمہ بازی تک کسی کام سے دریغ نہیں ہوتا، بھائی بھائی کی بول چال بند ہو جاتی ہے، ایک بھائی دوسرے کی صورت دیکھنے کا روادار نہیں رہتا، جس کے قابو میں کاروبار کا جتنا حصہ آتا ہے وہ اس پر قابض ہو کر عدل و انصاف کا بے دریغ خون کرتا ہے اور پھر اپنی نجی مجلسوں میں ایک دوسرے کے خلاف

بدزبانی اور بدگمانی کا وہ طوفان کھڑا ہوتا ہے کہ الامان! پھر چونکہ سالہا سال تک مشترک کاروبار کا نہ کوئی اصول طے شدہ تھا نہ کوئی حساب و کتاب رکھا گیا۔ اس لیے اگر اختلافات پیش آنے کی صورت میں افہام و تفہیم سے کام لینے کی کوشش کی بھی جاتی ہے تو معاملات کی ڈور الجھ کر اتنی پیچیدہ ہو چکی ہوتی ہے کہ منصفانہ تصفیہ کے لیے اس کا سرا پکڑنا مشکل ہو جاتا ہے۔ ہر شخص واقعات کو اپنے مفاد کی عینک سے دیکھتا ہے اور مصالحت کا کوئی ایسا فارمولا وضع کرنا بھی سخت دشوار ہو جاتا ہے جو تمام متعلقہ فریقوں کے لیے قابل قبول ہو۔ یہ سارا فساد اکثر و بیشتر اس وجہ سے پیدا ہوتا ہے کہ کاروبار کے آغاز میں یا اس میں مختلف افراد کی شمولیت کے وقت معاملے کو معاملے کی طرح طے نہیں کیا جاتا۔ اگر شروع ہی سے یہ بات واضح ہو کہ کس شخص کی کیا حیثیت ہے اور اس کے کیا حقوق و فرائض ہیں؟ اور یہ ساری باتیں تحریری شکل میں محفوظ ہوں تو بہت سے جھگڑوں اور بعد میں پیدا ہونے والی پیچیدگیوں کا شروع ہی میں سد باب ہو جائے۔

قرآن کریم میں جو آیت سب سے طویل آیت ہے اس میں اللہ تعالیٰ نے تمام مسلمانوں کو یہ ہدایت دی ہے کہ جب تم کوئی ادھار کا معاملہ کرو تو لکھ لیا کرو۔ جب معمولی رقم ادھار دینے پر یہ تاکید ہے تو کاروبار کے پیچیدہ معاملات کو تحریر میں لانے کی اہمیت کتنی زیادہ ہوگی؟

یہ حکم اسی لیے دیا گیا ہے تاکہ بعد میں تنازعات اور اختلافات پیدا نہ ہوں اور اگر ہوں تو انہیں حق و انصاف کے مطابق نمٹانا آسان ہو۔ لہٰذا اگر کسی کاروبار میں ایک سے زیادہ افراد کام کر رہے ہیں تو پہلے ہی قدم پر ان میں سے ہر شخص کی حیثیت کا تعین ضروری ہے۔ یہاں تک کہ اگر باپ کے کاروبار میں کوئی بیٹا شامل ہوا ہے تو اس کے بارے میں بھی پہلے ہی دن سے یہ طے ہونا ضروری ہے کہ وہ تنخواہ پر کام کرے گا یا کاروبار میں باقاعدہ حصہ دار ہوگا؟ یا محض اپنے باپ کی مدد کرے گا؟ پہلی صورت میں اس کی تنخواہ متعین ہونی چاہیے اور یہ صراحت بھی ضروری ہے کہ وہ کاروبار کی ملکیت میں حصہ دار نہیں ہے اور دوسری صورت میں اگر اسے کاروبار کی ملکیت میں حصہ دار بنانا ہے تو شرعاً اس کی پہلی شرط تو یہ ہے کہ اس کی طرف سے کاروبار میں کچھ سرمایہ ضرور شامل ہونا چاہیے (جس کی صورت یہ بھی ہو سکتی ہے کہ باپ اسے کچھ نقد رقم ہبہ کر دے اور وہ اس رقم

سے کاروبار کا ایک متعین حصہ خرید لے) دوسرے یہ بات تحریری طور پر ایک معاہدہ شرکت کی شکل میں محفوظ کر لینی چاہیے اور اس معاہدے میں یہ بھی صراحت ہونا ضروری ہے کہ نفع میں کتنا فیصد کس کا ہوگا؟ تا کہ بعد میں الجھن پیدا نہ ہو۔

اگر کسی ایک حصہ دار کو کاروبار میں کام زیادہ کرنا پڑتا ہو تو یہ بات بھی طے ہونی چاہیے کہ آیا وہ یہ زیادہ کام رضا کارانہ طور پر کرے گا یا اس زیادہ کام کا کوئی معاوضہ اسے دیا جائے گا۔ اگر کوئی معاوضہ دیا جائے گا تو وہ نفع کے فیصد حصے میں اضافہ کر کے دیا جائے یا متعین تنخواہ کی صورت میں؟ غرض ہر فریق کے حقوق و فرائض اتنے واضح ہونے ضروری ہیں کہ ان میں کوئی ابہام باقی نہ رہے۔

اگر بالفرض کسی کاروبار میں اب تک ان باتوں پر عمل نہیں کیا گیا تو جتنی جلد ہو سکے ان امور کو طے کر لینا ضروری ہے۔ اور اس معاملے میں کسی شرم، مروت اور طعن و تشنیع کو آڑ نہ آنے دینا چاہیے۔ معاملات کی اس صفائی کو محبت واخوت اور اتحاد و اتفاق کے خلاف سمجھنا بہت بڑا دھوکہ ہے بلکہ درحقیقت محبت اور اتفاق کی پائیداری ان امور پر منحصر ہے ورنہ آگے چل کر یہ سطحی محبت دلوں میں عداوت کو جنم دے سکتی ہے اور اسی لیے اسلام نے یہ تعلیم دی ہے کہ رہو بھائیوں کی طرح، لیکن معاملات اجنبیوں کی طرح کرو۔

۲۔ اسی طرح ہمارے معاشرے میں بالخصوص متوسط آمدنی والے طبقے میں اپنے ملکیتی مکان کا حصول ایک بڑا مسئلہ ہے اور عموماً کسی مکان کی تعمیر یا اس کی خریداری خاندان کے کئی افراد مل کر کرتے ہیں۔ اگر باپ نے کوئی مکان بنانا شروع کیا ہے تو بیٹے بھی اپنی اپنی بساط کے مطابق اس میں اپنی رقمیں لگاتے ہیں۔ لیکن عام طور سے ہوتا یہ ہے کہ یہ رقمیں کچھ سوچے سمجھے بغیر اور بسا اوقات کوئی حساب رکھے بغیر لگا دی جاتی ہیں۔ یعنی یہ بات طے نہیں ہوتی کہ بیٹا جو رقم مکان کی تعمیر میں دے رہا ہے، آیا یہ باپ کی خدمت میں ہدیہ ہے یا قرض ہے؟ یا وہ مکان کی ملکیت میں حصہ دار بننے کے لیے یہ رقم خرچ کر رہا ہے؟ پہلی صورت میں نہ وہ مکان کی ملکیت کا حصہ دار ہوگا نہ باپ سے یہ رقم کسی وقت واپس لینے کا حقدار ہوگا۔ دوسری صورت میں مکان تو تنہا باپ کی ملکیت ہوگا لیکن دی ہوئی رقم اس کے ذمے قرض سمجھی جائے گی۔ تیسری صورت میں اپنی

لگائی ہوئی رقم کے بقدر وہ مکان کی ملکیت میں بھی شریک ہوگا اور مکان کی قیمت بڑھنے کے ساتھ ساتھ اس کے حصے کی مالیت میں بھی اضافہ ہوگا۔ غرض ہر صورت کے تقاضے اور نتائج مختلف ہیں۔ لیکن چونکہ رقم لگاتے وقت ان تینوں میں سے کوئی صورت مقرر نہیں ہوتی، نہ رقموں کا پورا حساب رکھا جاتا ہے اس لیے آگے چل کر جب مکان کی قیمت بڑھتی ہے تو آپس میں اختلافات پیدا ہوجاتے ہیں اور خاص طور پر باپ کے انتقال کے بعد جب ترکے کی تقسیم کا مرحلہ آتا ہے تو یہ اختلاف ایک لاینحل مسئلے کی صورت اختیار کرلیتے ہیں۔ ان کی وجہ سے بھائیوں میں چھٹ چھٹاؤ کی نوبت آجاتی ہے اور لڑائی جھگڑوں سے خاندان کے خاندان متاثر ہوتے ہے۔

اگر اسلامی احکام پر عمل کرتے ہوئے تعمیر کے شروع ہی میں یہ ساری باتیں طے کرلی جائیں اور انہیں تحریری طور پر قلم بند کرلیا جائے تو اس خاندانی فساد کا راستہ بند ہوجائے۔

۳۔ جب خاندان کے کسی بڑے کا انتقال ہوتا ہے تو شریعت کا حکم یہ ہے کہ جلد از جلد اس کا ترکہ اس کے شرعی وارثوں کے درمیان تقسیم کیا جائے۔ لیکن ہمارے معاشرے میں شریعت کے اس حکم سے شدید غفلت برتی جاتی ہے۔ بعض اوقات تو جس کے جو ہاتھ لگتا ہے، لے اڑتا ہے اور حلال وحرام ہی کی پرواہ نہیں کی جاتی اور بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ کسی کے پیش نظر بددیانتی نہیں ہوتی۔ لیکن ناواقفیت یا لاپرواہی کی وجہ سے میراث تقسیم نہیں ہوتی اور اگر مرحوم نے کوئی کاروبار چھوڑا ہے تو اس پر وہی بیٹا کام کرتا رہتا ہے جو مرحوم کی زندگی میں کرتا تھا لیکن یہ طے نہیں کیا جاتا کہ اب کاروبار کی ملکیت کس تناسب سے ہوگی؟ شرعی ورثاء کے حصول کی ادائیگی کس طرح ہوگی؟ کام کرنے والے کو اس کی خدمات کا معاوضہ کس طرح ادا کیا جائے گا؟ ترکے میں کونسی چیز کس کے حصے میں آئے گی؟ بلکہ اگر کوئی شخص ترکے کی تقسیم کی طرف توجہ دلائے بھی تو اس کی تجویز کو ایک معیوب تجویز سمجھا جاتا ہے کہ ابھی مرنے والے کا کفن بھی میلا نہیں ہوا کہ لوگوں کو بٹوارے کی فکر پڑگئی ہے۔

حالانکہ یہ بٹوارہ شریعت کا حکم بھی ہے۔ معاملات کی صفائی کا تقاضا بھی اور اسے نظر انداز کرنے کا نتیجہ وہی ہوتا ہے کہ ایک عرصہ گزرنے کے بعد ورثاء کو اپنے اپنے حقوق کا خیال آتا ہے، رنجشیں پیدا ہوتی ہیں، ترکے کی اشیاء کی قیمتوں میں زمین و آسمان کا فرق پڑ جاتا ہے اور چونکہ کوئی بات پہلے سے طے شدہ نہیں ہوتی، اس لیے اب معاملات الجھ جاتے ہیں۔ ان کے مناسب تصفیہ میں سخت مشکلات پیدا ہو جاتی ہیں اور ان سب باتوں کا نتیجہ لڑائی جھگڑے کی صورت میں نمودار ہوتا ہے۔

اگر شریعت کے حکم کے مطابق وقت پر ترکے کی تقسیم عمل میں آ جائے اور باہمی رضامندی اور اتحاد و اتفاق کے ساتھ تمام ضروری باتیں طے پا جائیں تو آئندہ تنازعات پیدا ہونے کا امکان بہت کم رہ جاتا ہے اور باہمی محبت و اخوت کو فروغ ملتا ہے۔ یہ تو میں نے صرف تین سادہ سی مثالیں پیش کی ہیں ورنہ اگر معاشرے میں پھیلے ہوئے جھگڑوں کا تفصیل سے جائزہ لیا جائے تو نظر آئے گا کہ معاملات کو صاف نہ رکھنا ہمارے معاشرے کا ایک ایسا روگ بن چکا ہے جس نے فتنہ و فساد کی آگ بھڑکا رکھی ہے۔ معاملہ خواہ چھوٹا ہو یا بڑا...... صاف ستھرا ہونا چاہیے۔ اس کی شرائط واضح اور غیر مبہم ہونی چاہئیں اور اس سلسلے میں کوئی شرم و حیا اور لحاظ و مروت آڑے نہیں آنی چاہیے۔ جب ایک مرتبہ معاملے کی شرائط طے پا جائیں تو اس کے بعد باہمی برتاؤ میں جو شخص جس سے جتنا حسن سلوک کر سکے بہتر ہی بہتر ہے اور یہی مطلب ہے اس ارشاد کا کہ ''رہو بھائیوں کی طرح اور معاملات اجنبیوں کی طرح کرو۔''

مضمون: ۱۷

کھیل تفریح یا مقصد زندگی؟

پچھلے مہینے پاکستان اور ہندوستان میں کرکٹ کے بین الاقوامی مقابلے منعقد ہوئے۔ جن کا چرچا برصغیر میں تقریباً ڈیڑھ ماہ جاری رہا۔ اس عرصے میں ایک درجن سے زائد میچ کھیلے گئے اور ہر ہفتے میں کم از کم دو تین مقابلے منعقد ہوتے رہے۔ اس دوران کھیلوں کے یہ مقابلے ملک بھر کی اہم ترین دلچسپی کا موضوع بنے ہوئے تھے۔ گھر گھر اسی کا چرچا تھا اور جہاں چند آدمی جمع ہوئے، کھیل ہی کی بات چھڑ گئی۔ سربراہان مملکت سے لے کر مزدور اور ملازم تک اکثر افراد انہی کھیلوں کی تازہ ترین صورت حال معلوم کرنے، ٹیلی ویژن پر ان کا نظارہ کرنے اور ریڈیو پر تبصرہ سننے میں مشغول، بلکہ محو ہے، مختصر یہ کہ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ ان دنوں پوری قوم کا اہم ترین مسئلہ یہ مقابلے ہیں اور ان سے زیادہ اہمیت کسی موضوع کو حاصل نہیں ہے۔ گویا ہمارا ملک اپنے وجود و بقا سے لے کر ترقی و استحکام تک کے تمام مسائل سے بحسن وخوبی فارغ ہو چکا ہے اور اب اس قوم کے پاس کھیلنے اور کھیلوں کا نظارہ کرنے کے سوا کوئی کام باقی نہیں رہا۔

ابھی لوگوں کے دماغ سے اس ڈیڑھ ماہ کے کھیل کا خمار اترا نہیں تھا کہ آج کے اخبار میں یہ خبر شائع ہوئی ہے کہ:

> "انگلینڈ کی کرکٹ ٹیم پاکستان کے دورے کے دوران تین ٹیسٹ میچوں کی سیریز کے علاوہ تین ایک روزہ انٹرنیشنل میچوں کی سیریز بھی کھیلے گی۔ ٹیم کے دورے کا پروگرام مندرجہ ذیل ہے۔ ۱۴ر سے ۱۶ر نومبر سہ روزہ میچ راولپنڈی، ۱۸ر نومبر پہلا ایک روزہ انٹرنیشنل میچ لاہور، ۲۰ر نومبر دوسرا ایک روزہ انٹرنیشنل میچ کراچی، ۲۳ر نومبر تیسرا ایک روزہ انٹرنیشنل میچ پشاور، ۲۵ر سے ۳۰ر نومبر پہلا ٹیسٹ لاہور، ۲ر سے ۴ر دسمبر ساہیوال میں سہ روزہ میچ، ۷ر سے ۱۲ر دسمبر

دوسرا ٹیسٹ میچ فیصل آباد اور ۱۶ر سے ۲۱ر دسمبر تک کراچی میں تیسرا اور آخری ٹیسٹ میچ کھیلا جائے گا۔"

(جنگ کراچی: ۱۴ر نومبر ۱۹۸۷ء)

خلاصہ یہ ہے کہ ۱۴ر نومبر سے ۳۱ر دسمبر تک مزید ڈیڑھ مہینہ قوم پر، بالخصوص نوجوانوں پر کرکٹ کا بخار مسلط رہے گا اور کسی نے بتایا ہے کہ اس کے بعد جلد ہی پاکستانی ٹیم کسی غیر ملکی دورے پر روانہ ہوگی۔

ایسے ورزشی کھیل جن سے صحت وقوت برقرار رکھنے میں مدد ملتی ہے بذات خود کوئی ناجائز یا بری چیز نہیں ہیں۔ لیکن ہر چیز کی کوئی معقول حد ہوتی ہے۔ جس سے تجاوز کر کے مباحات ومباح نیک کام بھی ناجائز اور قابل نکیر و ملامت ہو جاتا ہے۔ اس وقت کھیلوں کی صورت حال یہ ہے کہ ہمارے یہاں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انہیں بذات خود ایک مقصد زندگی بنالیا گیا ہے اور ان کو غور وفکر، تحریر وتقریر اور جہد وعمل کا ایک ایسا موضوع قرار دے لیا گیا ہے جو زندگی کے بہت سے حقیقی مسائل سے کہیں زیادہ اہمیت اختیار کر چکا ہے۔

اس طرز عمل کے نتیجے میں پوری قوم کے اوقات جس بے دردی سے برباد ہو رہے ہیں، ان پر حسرت وافسوس کے اظہار کے لیے الفاظ ناکافی معلوم ہوتے ہیں۔ وقت کی قدر پہچاننا ایک ایسا مسئلہ ہے جس میں کبھی دو رائے نہیں ہوئیں، صرف اسلام ہی نہیں دنیا بھر کے مذاہب، بلکہ بے خدا فلسفے بھی ہمیشہ وقت کی قدر کا درس دیتے رہے ہیں، لیکن ان کھیلوں کے دوران ہمارے مجموعی طرز عمل سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہمارے نزدیک سب سے زیادہ فالتو اور بے مصرف چیز وقت ہے اور اس کا کوئی مصرف میچ دیکھنے اور اس پر تبصرہ کرنے اور سننے سے بہتر نہیں ہے۔

میچ کے دنوں میں بعض مقامات پر تو باقاعدہ سرکاری چھٹی کا اعلان کیا گیا، لیکن جہاں باقاعدہ چھٹی نہیں ہوئی، وہاں بھی عملاً چھٹی ہی کی سی کیفیت رہی، جب دفتروں اور تعلیم گاہوں میں ہمہ وقت نظریں ٹی وی پر اور کان ریڈیو پر مرکوز ہوں اور ذہن وتصور کھیل کے میدان میں پہنچا ہوا ہو تو دفتری کام اور تعلیم جیسی چیزوں میں وہ دلچسپی کہاں سے پیدا ہو جو انہیں سنجیدگی کے ساتھ انجام دینے کے لیے ضروری ہے؟ خاص طور پر وہ

نوجوان اور نوخیز بچے جن کا ذہن ابھی کھیل کود اور زندگی کے سنجیدہ معاملات کے درمیان تقابل کرنے کا اہل ہی نہیں ہے، جب ان کے دل ودماغ پر شب وروز گیند اور بلے ہی کی حکمرانی رہے گی تو وہ تعلیم جیسے خشک کام پر کیسے توجہ دے سکیں گے۔؟

پھر وہ بڑے حضرات جن کے ذہن پختہ ہو چکے ہیں اور جوان بچوں کے مربی کی حیثیت رکھتے ہیں، جب یہ بچے ان کو بھی اس حالت میں دیکھتے ہیں کہ انہوں نے اپنے تمام کام چھوڑ کر اپنی آنکھیں کرکٹ اسٹیڈیم پر مرکوز کر رکھی ہیں اور انکی گفتگو کا موضوع ہی کھیل ہی کھیل بنا ہوا ہے تو ان کے ذہن سے کھیل میں ہمہ تن محو ہو جانے کی برائی کا کوئی تصور ہی باقی نہیں رہتا اور وہ قلب وضمیر کے پورے اطمینان اور انشراح کے ساتھ تعلیم کو خیر باد کہہ کر کھیل کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں۔

اس پر مستزاد یہ ہے کہ حکومت اور عوام دونوں کی طرف سے کھیل کو مقصد حیات بنانے والوں کو جو پذیرائی ہوتی ہے اور کھیل کے قدر دانوں کی طرف سے ان پر جس طرح تحسین وآفرین اور دولت وشہرت نچھاور کی جاتی ہے وہ کبھی ملک کے کسی بڑے سے بڑے مفکر، کسی بڑے سے بڑے سائنس دان یا بڑے سے بڑے مصلح کے حصے میں بھی نہیں آئی۔ اچھے کھلاڑی کے ایک ایک ایکشن پر لاکھوں روپے کے انعامات مل رہے ہیں، کسی کھلاڑی کا "بابرکت" بلا لاکھوں روپے میں فروخت ہو رہا ہے، کسی کو کار انعام میں مل رہی ہے۔ سربراہان حکومت پورے پورے دن بیٹھ کر ان کے کارنامے دیکھ رہے ہیں اور اپنے ہاتھوں سے انہیں انعامات تقسیم کر رہے ہیں۔ غرض جب بچے یہ دیکھتے ہیں کہ کھیل کو مقصد زندگی بنانے والوں کی چاندی ہی چاندی ہے تو ان بے چاروں کا کیا قصور ہے۔ اگر وہ سمجھنے لگیں کہ تعلیم میں جی لگانے کی نصیحتیں ایک ڈھونگ سے زیادہ نہیں ہیں، ورنہ دنیا میں پیسہ اور نام پیدا کرنے کا بہترین راستہ تو کھیل میں جی لگانا ہے۔

یہ داستان تو وقت اور انسانی صلاحیتوں کے ضیاع کی تھی، اب اگر ان مقابلوں کے مالی پہلو پر نظر ڈالی جائے تو وہ بھی کچھ کم افسوسناک نہیں ہے۔ ایک ایک اسٹیڈیم کی تیاری پر جو خرچ آتا ہے اور ان کھیلوں کے انتظام وانصرام پر جو مصارف ہوتے ہیں، کیا وہ ایک ایسے ملک کے لیے قابل افسوس نہیں ہیں جس میں دن رات غربت اور افلاس اور

وسائل کی قلت کا رونا رویا جاتا ہے؟

آج دنیا کے بہت سے ملکوں میں کھیلوں کے فروغ کا ذوق پیدا ہو رہا ہے۔ لیکن کھیلوں کے لیے جس طرح تن من دھن کی بازی ہم نے لگا رکھی ہے اس کی نظیر دنیا میں بہت کم ہوگی۔ آخر اسی بیسویں صدی کی دنیا میں بہت سے ممالک ایسے بھی موجود ہیں جن کا نام کھیلوں کے سلسلے میں کبھی سننے میں نہیں آتا۔ بلکہ شاید اکثریت ایسے ہی ممالک کی ہے، وہ لوگ بھی اپنے بچوں کے لیے جسمانی ورزش اور تفریح طبع کا سامان کرتے ہی ہوں گے، لیکن کھیل کو موت وحیات کا مسئلہ بنائے بغیر بھی وہ نہ صرف بیسویں صدی میں زندہ ہیں، بلکہ ہم سے زیادہ ترقی کر رہے ہیں۔ ایک چین ہی کو دیکھ لیجیے کہ جسمانی ورزش کا جتنا ذوق اور اہتمام اس قوم میں پایا جاتا ہے کم از کم میں نے کسی اور قوم میں نہیں دیکھا۔ لیکن وہ ورزش، ورزش ہی کی حد تک ہے، اسے انہوں نے ایسا ملک گیر جنون بننے نہیں دیا جو بچے بچے کے سر پر سوار ہو کر اسے اپنے اصل فرائض سے غافل کر دے۔

ان گزارشات کا منشاء خدانخواستہ صرف طعن و تشنیع نہیں ہے بلکہ ہم انتہائی دلسوزی کے ساتھ حکومت اور عوام دونوں کو اس پہلو کی طرف متوجہ کرنا چاہتے ہیں کہ "میچ نوازی" کا یہ سلسلہ اب حد سے گذر گیا ہے اور اس کے نقصانات کو ہر وہ شخص محسوس کر سکتا ہے جس کے اندر معقولیت کی ادنیٰ رمق موجود ہو۔ خدا کے لیے سوچئے کہ اس طرح ہم اپنی قوم کو کس طرف لے جارہے ہیں؟ ہم ایک ایسی قوم کے افراد ہیں جو بے شمار مسائل کے گرداب میں پھنسی ہوئی ہے۔ جس کی ہر صبح ایک نیا مسئلہ لے کر نمودار ہوتی ہے، جس کے بچے صحیح تعلیم و تربیت سے محروم ہیں، جس کے محکموں میں حل طلب معاملات کے انبار لگے ہوئے ہیں، جس کے چاروں طرف دشمن منہ کھولے کھڑے ہیں، جسے اپنے دفاع کے لیے اس غیر ملکی امداد کی احتیاج ہے جو اس کی عزت اور آزادی کی قیمت پر مہیا ہوتی ہے۔ اس قوم کو ضرورت اس بات کی ہے کہ اس کا بچہ بچہ کھلاڑی بننے کے بجائے سپاہی اور جہد و عمل کا عادی بنے، لیکن ہم نے اس کھیل تماشوں کے ذریعے فضا ایسی پیدا کر دی ہے کہ نئی نسل کا آئیڈیل یا تو کوئی کھلاڑی ہے، یا کوئی اداکار یا گلوکار؟ خدا کے لیے سوچئے کہ:

کیا زمانے میں پنپنے کی یہی باتیں ہیں؟

مضمون: ۱۸

جرم اور سینہ زوری

دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو:

ہمارے ملک، بلکہ پورے عالم اسلام میں ایک خاصا موثر حلقہ وہ ہے جو اپنی سوچ، اپنے نظریات اور اچھے برے کے تمام تر پیمانے مغربی افکار سے بھیک مانگ کر حاصل کرتا ہے اور پھر انہی کی ترویج واشاعت کو اپنے ماڈرن اور فیشن ایبل ہونے کی علامت سمجھتا ہے اور اس پر فخر کرتا ہے۔

مغرب میں انسانی زندگی کے مختلف پہلوؤں کے بارے میں جو ٹیڑھے ترچھے خیالات پائے جاتے ہیں، انہی میں سے ایک خیال یہ بھی ہے کہ معاشرے کا امن و سکون غارت کرنے والے مجرموں کو قانون کے ذریعے جتنا زیادہ سے زیادہ تحفظ فراہم کیا جائے اور ان کی سزاؤں میں جتنی نرمی برتی جائے اتنا ہی وہ روشن خیالی کی علامت ہے اور ایسے مجرموں کے لیے جتنی سخت سزائیں مقرر کی جائیں اتنی ہی وہ دقیانوسیت اور وحشت وبربریت کی علامت ہے۔

یہ الٹا طرز فکر، جس کی رائے میں ایک طے شدہ مجرم، معصوم اور بے گناہ معاشرے کے مقابلے میں زیادہ قابل رحم ہے، مغرب کی نقالی کے شوق میں مسلمان ملکوں میں بھی رواج پا رہا ہے اور اسی ذہنیت کا مظاہرہ ہمارے ملک میں حدود آرڈیننس کے خلاف پروپیگنڈے کی صورت میں کچھ عرصے سے ہو رہا ہے۔ ''البلاغ'' کے سابق شمارے میں مولانا عبدالرحمٰن صاحب نے اس پروپیگنڈے کا پوری سنجیدگی کے ساتھ عالمانہ جائزہ لیا ہے جو قارئین کی نظر سے گذر چکا ہوگا۔

اسی دوران احقر کو پچھلے دنوں امریکہ اور کینیڈا کا سفر پیش آیا، وہاں ایک اخبار میں ایک دلچسپ، مگر عبرتناک خبر نظر سے گذری جو اس موضوع سے گہرا تعلق رکھتی ہے، میں اپنے ساتھ وہ اخبار اسی خیال سے لے آیا تھا کہ یہ خبر قارئین ''البلاغ'' کی ضیافت طبع

کے لیے پیش کروں گا، شاید وہ جرم وسزا کے باب میں مغرب کی نقالی چاہنے والوں کے لیے سرمہ بصیرت بن سکے۔

یہ اخبار ٹورنٹو (کینیڈا) سے شائع ہونے والا ''نیشنل انکوائرز'' ہے۔ جس کا یہ دعویٰ اس کے سرورق پر لکھا ہوا ہے کہ وہ امریکی براعظم کا سب سے کثیر الاشاعت ہفت روزہ ہے۔ اس کی ۱۷/۱۰/اکتوبر ۱۹۸۹ء کی اشاعت میں صفحہ ۵۰ پر ایک خبر شہ سرخیوں کے ساتھ شائع کی گئی ہے۔ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ کینیڈا کے علاقے برٹش کولمبیا میں ایک وحشتناک مجرم کلفرڈ اولسن کو قتل، زنا بالجبر اور غیر فطری عمل کے الزام میں گرفتار کیا گیا۔ یہ شخص نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کو روزگار دلانے کے بہانے اپنے ساتھ لے جاتا ان کو نشہ آور گولیاں دیتا، پھر ان کے ساتھ زبردستی جنسی عمل کرتا اور بالآخر انہیں قتل کر کے ان کی لاشیں دور دراز کے مقامات پر دفن کر دیتا تھا۔ جب اسے گرفتار کیا گیا تو اس نے گیارہ نوعمر بچوں اور بچیوں کے بارے میں یہ اعتراف کیا کہ اس نے ان سب کو ورغلا کر ان کے ساتھ زنا یا لواطت بالجبر کا ارتکاب کیا اور ان سب کو قتل کر کے انہیں مختلف علاقوں میں چھپا دیا اور قتل بھی اس بربریت کے ساتھ کیا کہ جب ایک بچے کی لاش برآمد ہوئی تو اس کے سر میں لوہے کی ایک میخ اس درندے نے ٹھونکی ہوئی تھی۔

لیکن دلچسپ اور عبرت انگیز بات یہ ہے کہ جب پولیس نے اس درندہ صفت مجرم سے یہ مطالبہ کیا کہ جن گیارہ بچوں کو اس نے اپنی بربریت کا نشانہ بنایا ہے، ان کی لاشوں کی نشاندہی کرے، تو اس نے کہا کہ میں نے ان گیارہ کے گیارہ بچوں کی لاشیں خود اپنے ہاتھوں سے مختلف جگہوں پر چھپائی ہیں اور مجھے وہ جگہیں معلوم ہیں، لیکن اگر آپ مجھ سے ان جگہوں کی نشاندہی کرانا چاہتے ہیں تو مجھے فی لاش دس ہزار ڈالر معاوضہ ادا کریں۔

چوری اور سینہ زوری کی ایسی تاریخی مثال کب کسی کے تصور میں آئی ہوگی؟ لیکن نظام قانون کی بے بسی کا اندازہ کیجیے کہ پولیس نے بالآخر اس کے مطالبے کے آگے ہتھیار ڈال دیئے اور خوشامد درآمد کے بعد جو زیادہ سے زیادہ رعایت اس مجرم نے پولیس کو دی وہ یہ تھی کہ اگر دس بچوں کی لاشوں کی برآمدگی کا معاوضہ یعنی ایک لاکھ ڈالر آپ مجھے دیں گے تو گیارہویں بچے کی لاش میں مفت میں برآمد کرا دوں گا۔

بالآخر پولیس نے اس ''رعایت'' کا فائدہ اٹھاتے ہوئے مجرم کو ایک لاکھ ڈالر معاوضہ ادا کیا اور اس کے بعد اس نے کینیڈا کے مختلف شہروں سے گیارہ بچوں کی لاشیں پولیس کے حوالہ کیں۔ ان گیارہ بچوں کی تصویریں بھی اخبار نے شائع کی ہیں اور ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ بچے بارہ سے اٹھارہ سال تک کی عمر کے ہوں گے۔

اس تفتیش اعتراف اور ایک لاکھ ڈالر کے نفع بخش سودے کے بعد جب مجرم پر مقدمہ چلایا گیا تو چونکہ کینیڈا میں سزائے موت کو ''وحشیانہ سزا'' قرار دے کر ختم کر دیا گیا ہے، اسی لیے عدالت اس مجرم کو جو زیادہ سے زیادہ سزا دے سکی وہ عمر قید تھی۔ البتہ عدالت نے جرم کی سنگینی کے اعتراف کے طور پر سزا دیتے وقت یہ ''سفارش'' ضرور کر دی کہ اس مجرم کو کبھی پیرول پر رہا نہ کیا جا سکے گا۔ اخبار نے ''سفارش'' کا لفظ استعمال کیا ہے۔ جس سے ظاہر یہ ہوتا ہے کہ شاید عدالت کو ایسا ''حکم'' دینے کا اختیار نہیں ہے۔ وہ صرف ''سفارش'' ہی کر سکتی تھی۔

ان گیارہ بچوں کے ستم رسیدہ ماں باپ کو جب یہ پتہ چلا کہ جس درندے نے ان کے کمسن بچوں کی جان لی اور ان کی عزت لوٹی، اسے ایک لاکھ ڈالر کا معاوضہ ادا کیا گیا ہے تو ان میں اضطراب اور اشتعال کی لہر دوڑ گئی اور انہوں نے مجرم پر ہرجانے کا مقدمہ دائر کیا جس میں یہ مطالبہ کیا گیا کہ کینیڈا کے ٹیکس دینے والوں کے ایک لاکھ ڈالر جو اس درندہ صفت مجرم کی جیب میں گئے ہیں، کم از کم وہ اس سے واپس لے کر مرنے والے بچوں کے ورثاء کو دلوائے جائیں، لیکن ان کو اس مقدمے میں شکست ہو گئی۔ اپیل کورٹ نے بھی ان کا مقدمہ خارج کر دیا اور سپریم کورٹ نے یہ کیس سننے سے انکار کر دیا۔

دوسری طرف مجرم اولسن نے ۲۴؍ جنوری کو ہائی کورٹ میں ایک درخواست دی ہے جس میں یہ مطالبہ کیا گیا ہے کہ اسے جیل میں بہتر رہائشی سہولیات مہیا کی جائیں۔ ہائی کورٹ نے یہ درخواست سماعت کے لیے منظور کر لی ہے۔ بلکہ اس درندے نے یہ درخواست بھی دی تھی کہ مسلسل قید کی وجہ سے مجھے اپنے پاگل ہونے کا خطرہ ہے، اس لیے مجھے رہائی دی جائے۔ لیکن عدالت نے یہ کرم کیا کہ یہ درخواست مسترد کر دی۔

جن لوگوں کے بچے اس وحشت ناک ظلم و ستم کا نشانہ بنے، انہوں نے اس صورت حال کے نتیجے میں ایک انجمن بنائی ہے جس کا نام ''نشانہ ہائے تشدد'' ہے۔ اس انجمن

نے پارلیمنٹ کے ارکان سے مطالبہ کیا ہے کہ کینیڈا میں سزائے موت کے قانون کو واپس لایا جائے۔ اس انجمن کے ایک نمائندے نے ایک اخبار کے نمائندے سے گفتگو کرتے ہوئے کہا:

> ''ہم نے ہار نہیں مانی، ہم نے ایک گروپ بنایا ہے اور ہم نے کینیڈا کی پارلیمنٹ کے ارکان سے مطالبہ کیا ہے کہ کینیڈا میں سزائے موت کو واپس لایا جائے۔ اولسن جیسے جنسی درندوں کو سیدھا جہنم میں بھیجنا چاہیے جہاں کے وہ واقعی مستحق ہیں۔''

اخبار کی رپورٹ کا یہ خلاصہ ہم نے بے کم وکاست عرض کر دیا ہے جو کسی طویل تبصرے کا محتاج نہیں۔ مجرموں کو دی جانے والی عبرتناک سزاؤں کو ''وحشیانہ'' اور ''غیر مہذب'' قرار دے کر اور مجرموں کے ساتھ قانونی پیار کا سلوک کر کے حالت اب یہاں تک پہنچ چکی ہے کہ مجرم کو ایک لاکھ ڈالر یعنی تقریباً پچاس لاکھ پاکستانی روپے کا معاوضہ ادا کیا گیا اور سینے پر اولاد کا زخم کھائے ہوئے ستم رسیدہ افراد کو ایک پیسہ ہرجانہ دینے کی گنجائش پیدا نہ ہوئی۔ مجرم کو جیل میں بہتر رہائشی سہولیات فراہم کرنے پر عدالتیں غور کر رہی ہیں، لیکن نشانہ ہائے ستم کی فریاد سننے کے لیے کوئی عدالت تیار نہیں۔

دوسری طرف ہمارے ملک کی فکر ہیں کہ انہیں ہمارے پورے نظام قانون میں سب سے بڑی خرابی اس ''حدود آرڈی ننس'' میں نظر آتی ہے جس کا سب سے بڑا قصور یہ ہے کہ اس نے اس قسم کے درندہ صفت مجرموں کے لیے وہ سزائیں تجویز کی ہیں جن کے وہ مستحق ہیں۔

اسلام نے قصاص و دیت اور حدود و تعزیرات کے ذریعے انسانی نفسیات کے ہر پہلو کا اس باریک بینی سے خیال رکھا ہے کہ اس میں ایک طرف مجرم کو کیفر کردار تک پہنچانے اور دوسروں کے لیے سامان عبرت بنانے کا پورا اہتمام موجود ہے اور دوسری طرف جو لوگ اس قسم کے جرائم کا نشانہ بنتے ہیں یا ان سے متاثر ہوتے ہیں، ان کی جذباتی تسکین اور مالی تلافی دونوں کا انتظام کیا گیا ہے اور ساتھ ہی اس بات کا خیال رکھا گیا ہے کہ اگر ایک مرتبہ کسی جرم کا ارتکاب ہو تو اس کے تمام تر نتائج وثمرات اسی ایک واقعے پر ختم ہو جائیں، نفرتوں اور عداوتوں کی آگ کو مزید بھڑک کر اور زیادہ جرائم کو ہوا

دینے کا موقع نہ ملے ورنہ ظاہر ہے کہ اگر مجرم کو کیفر کردار تک پہنچتا دیکھ کر متاثر افراد کا اشتعال ٹھنڈا نہیں ہوگا، بلکہ وہ یہ دیکھیں گے کہ ایسے گھناؤنے جرائم کے ذمہ دار نہ صرف آزادی سے دندناتے پھر رہے ہیں، بلکہ انہیں ان کے جرائم پر معاوضہ سے نوازا جاتا ہے تو ان کے سینے کی آگ کسی نہ کسی دن کوئی شگوفہ ضرور کھلا کر رہے گی۔

اسی لیے اسلام نے ایک طرف عبرتناک سزاؤں کا نظام قائم فرمایا ہے اور دوسری طرف ضرر رسیدہ افراد کے لیے دیت یا خون بہا کی شکل میں مالی تلافی کا بھی انتظام کیا ہے۔ لیکن چونکہ مغرب کے اسلام دشمن حلقوں کے منہ سے ایک مرتبہ یہ بات نکل گئی کہ ''اسلام کی سزائیں وحشیانہ اور غیر مہذب ہیں'' تو ہمارے وہ مغرب پرست حلقے جن کے دماغ سے لے کر دل تک کوئی چیز اپنی نہیں ہے اور جن کی سوچ سے لے کر جذبات تک ہر چیز مغرب سے مانگی ہوئی ہے، اسلام کی مقرر کردہ سزاؤں پر تنقید کرنے سے ہی نہیں، ان کے خلاف دریدہ دہنی سے بھی نہیں چوکتے۔ اقبال مرحوم نے ایسے ہی لوگوں سے خطاب کرتے ہوئے بڑی دردمندی سے کہا تھا:

عقل تو زنجیریٔ افکار غیر
در گلوئے تو نفس از تار غیر
بر زبانت گفتگو ہا مستعار
در دل تو آرزو ہا مستعار
قمریانت را نوا ہا خواستہ
سرو ہایت را قبا ہا خواستہ
آن نگاہش سر مازاغ البصر
سوے قوم خویش باز آید اگر
لست منی گویدت مولائے ما
وائے ما، اے وائے ما، اے وائے ما

مضمون: ۱۹

بعض شرعی احکام کی مصالحتیں

سوال وجواب

غیر مسلموں کی جانب سے چند اعتراضات کا جواب درکار ہے امید ہے کہ آپ جواب ارسال فرما کر عنداللہ ماجور ہوں گے۔

۱۔ اسلام میں کثیر الازدواجی Poly Gamy کی اجازت کیوں ہے اور Poly Yandry کیوں ممنوع ہے؟ اگر اولاد کی شناخت کا مسئلہ ہے تو یہ تو خون کے ایک سادہ سے ٹیسٹ سے حل ہو جاتا ہے۔ عورتیں چار شادی کا مطالبہ کریں تو کیا دلائل ہیں؟

۲۔ اسلام میں خنزیر کیوں حرام ہے؟ اس کی اخلاقی طبی وجوہ ارشاد فرمائیں اور یہ ثابت فرمایئے کہ اس کا گوشت کیوں مضر ہے؟

۳۔ اسلام سے پہلے شراب پی جاتی تھی یہ کیوں ممنوع نہ تھی؟

۴۔ اگر کوئی اپنی بیوی کو غصے، غلط فہمی یا شدید مجبوری کی حالت میں طلاق دے دے اور دوبارہ اس سے شادی کرنا چاہے تو مرد کی اس غلطی کی سزا اس بے چاری بے گناہ مظلومہ عورت کو حلالہ کی صورت میں کیوں دی جاتی ہے؟ کرے کوئی بھرے کوئی۔

۵۔ اسلام میں (معاذ اللہ) عورت کو کمتر مخلوق کیوں تصور کیا جاتا ہے؟ مثلاً جائیداد میں آدھا حصہ، آدھی گواہی، عقیقہ میں آدھی قربانی، طلاق کا حق نہ ہونا، اگر خلع لینا چاہے تو اپنے حق مہر سے دستبردار ہونا پڑے۔ وغیرہ وغیرہ۔

جواب:

آپ کے سوالات کے جواب سے پہلے دو اصولی باتیں عرض کرتا ہوں۔

غیر مسلموں سے گفتگو:

ا۔ غیر مسلموں سے جب کبھی اسلام کے بارے میں گفتگو کی نوبت آئے تو گفتگو ہمیشہ اصول اسلام پر ہونی چاہیے۔ جزوی احکام پر نہیں۔ کیونکہ تمام جزوی احکام دراصل اصولوں پر مبنی ہیں۔ جب تک انسان ان اصولوں کا قائل نہ ہو، جزوی احکام کی حکمتیں ٹھیک ٹھیک سمجھ میں نہیں آسکتیں اور ایک کے بعد دوسرے حکم پر اعتراض کا لامتناہی سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔

ہر حکم کی مصلحت سمجھ میں آنا ضروری نہیں:

۲۔ اللہ تعالیٰ کا کوئی حکم حکمتوں سے خالی نہیں ہے، لیکن ضروری نہیں ہے کہ ہر حکم کی مصلحت کلی طور پر انسان کی سمجھ میں آجائے۔ اگر ہر حکم کی مصلحت انسان کی سمجھ میں آجاتی تو اللہ تعالیٰ کو وحی کے ذریعے احکام عطا فرمانے کی ضرورت نہ تھی، صرف اتنا کہہ دیا جاتا کہ مصلحت اور حکمت کے مطابق عقل سے کام لے کر عمل کرو۔ شریعت کے احکام تو آتے ہی عموماً اس جگہ پر ہیں جہاں یہ اندیشہ ہوتا ہے کہ اگر اس معاملے کو صرف انسانی عقل کے حوالے کیا گیا تو وہاں وہ ٹھوکر کھائے گا۔ لہٰذا اگر کسی حکم کی پوری مصلحت سمجھ میں نہ آئے تو اس حکم سے انکار نہیں کیا جائے گا۔ دیکھیے حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام کو حکم دیا گیا کہ اپنے بیٹے کو ذبح کردو۔ بظاہر اس حکم میں کوئی مصلحت نہ تھی لیکن حضرت ابراہیم علیہ السلام نے مصلحت نہیں پوچھی فوراً عمل کرنے پر تیار ہو گئے۔ جب اللہ تعالیٰ کو حکیم مطلق اور اپنا پروردگار مان لیا تو اس کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ اس کے ہر حکم کو بجالایا جائے اور حکمت و مصلحت کا مطالبہ نہ کیا جائے۔

اگر آپ ایک ملازم رکھیں لیکن جب آپ اسے کسی کام کا حکم دیں تو وہ پہلے آپ سے اس کی مصلحت بتانے کا مطالبہ کرے تو کیا وہ ملازم وفادار سمجھا جائے گا یا برطرف کرنے کا مستحق ہوگا؟ جب ایک ملازم کا یہ حال ہے تو بندے کا معاملہ اپنے مالک کے ساتھ خود سوچ لیجیے۔

لہٰذا اصل تو یہ ہے کہ شرعی احکام کی مصلحتوں کے زیادہ درپے نہیں ہونا چاہیے۔ تاہم بہت سے شرعی احکام کی کچھ مصلحتیں انسان کو سمجھ میں آجاتی ہیں۔ حضرت مولانا

تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب ''احکام اسلام عقل کی نظر میں'' انہی مصلحتوں کو بیان کرنے کے لیے لکھی گئی ہے کبھی اس کا مطالعہ فرمالیں۔

اس تمہید کے بعد آپ کے سوالات کا مختصر جواب حاضر ہے۔

۱۔ مردوں کو چار شادیوں کی اجازت کیوں؟:

یہ ایک حیاتیاتی حقیقت ہے کہ اگر ایک مرد چار عورتوں کے پاس جائے تو چاروں کو حاملہ بنا سکتا ہے۔ لیکن ایک عورت چار مردوں کے پاس جائے تو وہ ایک ہی سے حاملہ ہوگی۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ فطرت کے لحاظ سے عورت یک زوجی کے لیے پیدا کی گئی ہے نہ کہ مرد۔ اس کے علاوہ مرد پر ایسا کوئی زمانہ معمولاً نہیں آتا جب وہ جنسی تعلق کے قابل نہ ہو۔ لیکن عورت پر حیض و نفاس اور حمل کے ایام میں ایسے دور باقاعدہ آتے ہیں جب وہ جنسی تعلق کے قابل نہیں ہوتی۔ لہٰذا مرد کو جنسی تسکین کے لیے زیادہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ عورت کو اس کی ضرورت نہیں۔

۲۔ خنزیر کیوں حرام ہے؟:

خنزیر کے طبی نقصانات سینکڑوں اطباء اور ڈاکٹروں نے بیان کیے ہیں اور اخلاقی نقصان یہ ہے کہ اس سے قوت بہیمیہ میں اضافہ ہوتا ہے، جس کا مشاہدہ آپ دن رات مغرب میں کرتے ہیں۔

۳۔ شراب ایک دم سے کیوں حرام نہیں ہوئی؟:

اسلام کے احکام بتدریج آئے ہیں ایک دم سے سارے احکام آجاتے تو عمل مشکل ہوتا اس لیے رفتہ رفتہ کر کے بری عادتیں چھڑالی گئیں۔

۴۔ ''حلالہ'' کیوں؟:

یہ خیال غلط ہے کہ ''حلالہ'' کوئی تدبیر ہے جس پر عورت کو مجبور کیا جارہا ہے۔ اصل یہ ہے کہ جس شخص نے اللہ کی مقرر کی ہوئی تمام حدود کو پامال کر کے تینوں طلاقیں دے

دیں، وہ اب اس لائق نہیں کہ ایک شریف عورت اس کے پاس رہے۔ لہٰذا حکم یہ ہے کہ اب اس سے نکاح نہ کرو کوئی اور شوہر تلاش کرو۔ ہاں اگر اس شوہر سے بھی نبھاؤ نہ ہو اور وہ از خود طلاق دے دے تو اس صورت میں امید ہے کہ پہلا شوہر کچھ سبق حاصل کر چکا ہوگا اس لیے اگر اب اس سے نکاح کرنے پر بیوی رضامند ہو تو اس کی اجازت دے دی گئی ہے اور یہ جو محض حیلہ کے طور پر حلالہ کیا جاتا ہے وہ شریعت کے منشاء کے خلاف ہے۔

۵۔ کیا عورت کمتر مخلوق ہے؟:

عورت ہرگز کمتر مخلوق نہیں۔ البتہ مرد کے مقابلے میں کمزور ضرور ہے۔ جیسا کہ مشاہدہ ہے۔ اس لیے کسب معاش کی ذمہ داری اس پر نہیں ڈالی گئی۔ اس کی کمزوری اور بعض دوسری نفسیات کے پیش نظر مرد کو اس کے کسب معاش کا ذمہ دار قرار دیا گیا ہے اور جب وہ کسب معاش کی ذمہ دار نہیں تو جائیداد میں بھی اس کا حصہ آدھا اور کسب معاش کے ذمہ دار کا حصہ پورا ہے۔ (اسلام کے سوا کسی مذہب میں تو آدھا حصہ بھی نہیں ہے۔)

یہ تمام موضوعات تفصیل طلب ہیں اور ایک خط میں ساری بات کو سمیٹنا ممکن نہیں ہے۔ اس لیے آپ ''مسلمان عورت'' از مولانا ابوالکلام آزاد کا مطالعہ فرمالیں۔

مضمون: ۲۰

موجودہ حالات میں ہمارا طرز عمل

''زمانہ بڑا خراب آگیا ہے'' ...... ''بے دینی کا سیلاب بڑھتا جارہا ہے'' ......''لوگوں کا دین و ایمان سے کوئی واسطہ نہیں رہا'' ...... ''مکر وفریب کا بازار گرم ہے'' ...... ''عریانی و بے حیائی کی انتہاء ہوچکی ہے۔''

اس قسم کے جملے ہیں جو ہم دن رات اپنی مجلسوں میں کہتے اور سنتے رہتے ہیں اور بلاشبہ یہ تمام باتیں سچی بھی ہیں۔ ہر سال کا موازنہ پچھلے سال سے کیجیے تو دینی اعتبار سے انحطاط نظر آتا ہے، لیکن افسوسناک بات یہ ہے کہ ہم اپنی مجلسوں میں ان باتوں کا تذکرہ اس لیے نہیں کرتے کہ ہمیں اس صورت حال پر کوئی تشویش ہے اور ہم اسے بدلنا چاہتے ہیں، بلکہ یہ تذکرہ محض برائے تذکرہ ہوکر رہ گیا ہے اور یہ بھی ایک فیشن سا بن چکا ہے کہ جب کوئی بات نکلے تو زمانے اور زمانے کے لوگوں پر دو چار فقرے چلتے کرکے ان کی حالت پر محض زبانی اظہار افسوس کردیا جائے۔ لیکن یہ صورت حال کیوں پیدا ہوئی ہے؟ اس کا علاج کیا ہے؟ اور اسے بدلنے کے لیے ہم کیا کرسکتے ہیں؟ یہ سوالات ہم میں سے اکثر لوگوں کی سوچ کے موضوع سے یکسر خارج ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہم لوگ زمانے کے بارے میں اس قسم کی باتیں پوری بے پروائی سے کہہ کر نہ صرف خاموش ہوجاتے ہیں بلکہ خود بھی انہی لوگوں کے پیچھے ہولیتے ہیں جنہیں مختلف صلواتیں سنا کر فارغ ہوئے ہیں۔

سوال یہ ہے کہ آپ کو اس صورت حال پر کوئی تشویش اور اسے بدلنے کی خواہش ہے یا نہیں؟ اگر کوئی تشویش نہیں ہے تو پھر خواہ مخواہ اس قسم کے جملے کہہ کر فضا کو مکدر کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے؟ اور اگر واقعتاً آپ کو ان حالات پر تشویش ہے اور آپ دل سے چاہتے ہیں کہ ان کا سدباب ہو تو پھر صرف دو چار جملے زبان سے کہہ کر فارغ ہوجانا کیسے درست ہوسکتا ہے؟ فرض کیجیے کہ ہماری آنکھوں کے سامنے ایک ہولناک

آگ بھڑک رہی ہو اور ہم یقین سے جانتے ہوں کہ اگر اس کی روک تھام نہ کی گئی تو یہ پورے خاندان اور پوری بستی کو اپنی لپیٹ میں لے لے گی تو کیا پھر بھی ہمارا طرز عمل یہی ہوگا کہ اطمینان سے بیٹھ کر صرف اظہار افسوس کرتے رہیں اور ہاتھ پاؤں ہلانے کی کوشش نہ کریں؟

اگر ذہن و دماغ عقل و ہوش سے بالکل ہی خالی نہیں ہیں تو ہم آگ کے بھڑکنے اور پھیلنے کا تذکرہ اس بے پروائی سے نہیں کر سکتے۔ ایسے موقع پر بے وقوف سے بے وقوف شخص بھی آگ کا مقصد لوگوں کو سنانے سے قبل فائر بریگیڈ کو فون کرے گا اور جب تک وہ نہ پہنچے خود آگ پر پانی یا مٹی ڈالے گا اور دوسروں کو بھی اس کام میں شریک ہونے کی دعوت دے گا اگر اس پر بھی قابو پانا ممکن نہ ہو تو ایسی چیزیں آس پاس سے ہٹائے گا جس کو آگ پکڑ سکتی ہو، پھر بھی آگ بڑھتی نظر آئے تو لوگوں کی جان بچانے کے لیے انہیں دوسری جگہ منتقل کرنے کی کوشش کرے گا اور کسی کو وہاں سے نہ ہٹا سکے تو اپنے بیوی بچوں اور گھر والوں کو وہاں سے اٹھا لے جائے گا اور اگر اتنی بھی مہلت نہ ہو تو کم از کم خود تو بھاگ ہی کھڑا ہوگا لیکن یہ بات کسی انسان سے ممکن نہیں ہے کہ آگ لگنے پر زبانی اظہار افسوس کر کے بدستور اپنے کام میں منہمک ہو جائے یا یہ سوچ کر کہ آگ بے شمار انسانوں کو نگل چکی ہے، خود بھی اس میں کود پڑے؟ یہ تو انسان کی فطرت ہے کہ آگ خواہ کتنی تیز رفتار ہو اور اسے یقین ہو کہ میں اس سے بچ کر نہیں جا سکتا، تب بھی جب تک اس کے دم میں دم ہے وہ اس کے آگے بھاگتا رہے گا تاوقتیکہ وہ خود ہی آ کر اسے دبوچ نہ لے۔

سوال یہ ہے کہ اگر واقعتاً ہمارے اردگرد بے دینی اور خدا کی نافرمانی کی آگ بھڑک رہی ہے اور ہم اپنے گھروں، اپنے خاندانوں اور اپنے بیوی بچوں پر اس کی آنچ محسوس کر رہے ہیں تو پھر اس آگ کا محض تذکرہ کر کے کیسے چپ ہو رہتے ہیں؟ بلکہ اس آگ پر کچھ مزید تیل چھڑکنے کی جرأت ہمیں کیسے ہو جاتی ہے؟

ہم اگر اپنے گریبانوں میں منہ ڈال کر دیکھیں تو ہمارا طرز عمل اس کے سوا اور کیا ہے کہ ہم اپنے زمانے اور زمانے کی ساری برائیوں کا تذکرہ تو اس انداز سے کرتے ہیں جیسے ہم ان تمام برائیوں سے معصوم اور محفوظ ہیں، لیکن اس تذکرے کے بعد جب عملی

زندگی میں پہنچتے ہیں تو صبح سے لے کر شام تک ہم خود ان تمام کاموں کا جان بوجھ کر ارتکاب کرتے چلے جاتے ہیں جن کی قباحتیں بیان کرنے میں ہم نے اپنے زور بیان کی ساری صلاحیتیں صرف کردی تھیں اور جب اس طرز عمل پر کوئی تنبیہ کرتا ہے تو ہمارا جواب یہ ہوتا ہے کہ ساری دنیا بے دینی کی آگ میں جل رہی ہے تو ہم اس سے کس طرح بچیں؟ لیکن کیا اس طرز فکر میں ہماری مثال بالکل اس شخص کی سی نہیں ہے جو آگ بھڑکتی دیکھ کر اس سے بھاگنے کے بجائے خود جان بوجھ کر اس میں کود جائے؟

سوال یہ ہے کہ کیا ہم نے بے دینی کی اس آگ کو بجھانے یا لوگوں کو اس سے بچانے کی کوئی ادنیٰ کوشش کی؟ اور لوگوں کو بھی چھوڑیئے، کیا کبھی اپنے گھر، بیوی بچوں، اپنے اہل خاندان اور اپنے دوست احباب ہی کو ایسی ہمدردی اور لگن سے ان کو دین پر عمل پیرا ہونے کی ترغیب دی جیسے ہمدردی اور لگن سے ان کو آگ سے بچایا جاتا ہے؟ کیا کبھی ان کو دینی فرائض کی اہمیت سے آگاہ کیا؟ کیا کبھی انہیں گناہوں کی حقیقت سمجھائی؟ کیا کبھی ان کی توجہ مرنے کے بعد والے حالات کی طرف مبذول کرائی؟ کیا ان میں نیکیوں کا شوق اور گناہوں سے نفرت پیدا کرنے کے لیے کوئی اقدام کیا؟

اور گھر والوں کا معاملہ بھی پھر بعد کا ہے کیا خود اپنے آپ کو بے دینی کی آگ سے محفوظ رکھنے کے لیے کچھ ہاتھ پاؤں ہلائے؟ اپنی کسی حد تک دینی فرائض کی ادائیگی اور گناہوں سے بچنے کوئی اہتمام کیا؟ اگر تمام احکام پر عمل کرنے میں مشقت معلوم ہوتی ہے تو اپنے عمل میں جو کم سے کم تبدیلی پیدا کی جاسکتی تھی، کیا اس پر کبھی عمل کیا؟ سینکڑوں گناہوں میں سے کوئی ایک گناہ خدا کے خوف سے چھوڑا؟ بیسیوں فرائض میں سے کسی ایک فریضے کی پابندی شروع کی؟

اگر ان تمام سوالات کا جواب نفی میں ہے تو اس کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہے کہ ہم خود اندر سے اس آگ کو بجھانا ہی نہیں چاہتے اور دنیا میں پھیلی ہوئی بے دینی کا شکوہ محض بہانہ ہی بہانہ ہے۔ پھر تو حقیقت یہ ہے کہ نہ زمانے کا کوئی قصور ہے، نہ دوسرے اہل زمانہ کا قصور، سارا قصور ہماری اس نفسانیت کا ہے جو خود بے دینی کی راہ اختیار کر کے اس کا سارا الزام زمانے کے سر ڈال دینا چاہتی ہے۔

لہٰذا اگر ہم واقعتاً بے دینی کی موجودہ فضا سے بے زار ہیں اور اس کا مداوا کرنا

چاہتے ہیں تو ہمارا طرزِ عمل بالکل ویسا ہی ہونا چاہیے جیسا ایک شریف انسان بھڑکی ہوئی آگ کو دیکھ کر اختیار کرتا ہے۔ ہمیں ان گناہوں سے بچنے کی توفیق مانگنی چاہیے۔

اگر اس تدبیر پر عمل کیا جاتا رہے تو ممکن نہیں ہے کہ رفتہ رفتہ انسان کے اعمال بد میں نمایاں کمی نہ آتی چلی جائے۔ مثلاً کوئی شخص بیک وقت سود خوری، رشوت خوری، مکر و فریب، جھوٹ، غیبت، بدنگاہی، بدزبانی اور اس طرح کے سو گناہوں میں مبتلا ہے اور وہ سارے گناہوں کو بیک وقت نہیں چھوڑ سکتا، لیکن کیا یہ بات اس کی قدرت میں نہیں ہے کہ وہ ان گناہوں میں سے کسی ایک آسان چیز کا انتخاب کر کے اسے چھوڑنے کا عزم کرلے اور باقی پر استغفار کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے حضور اُن سے نجات کی دعا کرتا رہے؟ اگر وہ دن بھر میں پچاس جگہوں پر جھوٹ بولتا ہے تو آئندہ کم از کم دس مقامات پر جھوٹ چھوڑ دے؟ اگر روزانہ پانچ سو روپے ناجائز طریقوں سے حاصل کرتا ہے تو ان میں سے جتنے کم سے کم آسانی سے چھوڑ سکتا ہو، کم از کم انہیں فوراً چھوڑ دے؟ اگر دن بھر میں کبھی ایک نماز نہیں پڑھتا تو پانچوں اوقات میں سے جو وقت آسان تر معلوم ہو، کم از کم اس میں نماز شروع کر دے؟ اور باقی کے لیے دعا و استغفار کرتا رہے؟

مطلب یہ ہے کہ جس طرح بھڑکی ہوئی آگ سے بھاگتے وقت انسان یہ نہیں دیکھتا کہ بھاگ کر میں کتنی دور جا سکوں گا؟ بلکہ وہ بے ساختہ بھاگ ہی پڑتا ہے اور اگر آگ اسے دبوچ ہی لے تو جب تک اس کے دم میں دم ہے وہ جسم کے جتنے زیادہ سے زیادہ حصے کو اس سے بچا سکتا ہے، بچاتا ہی رہتا ہے، اسی طرح دین کے معاملے میں بھی فکر یہ ہونی چاہیے کہ جس گناہ سے جس وقت بچ سکتا ہوں بچ جاؤں اور جس نیکی کی توفیق جس وقت مل رہی ہے، کر گزروں، اگر ہم اور آپ اس طرز پر عمل پیرا ہوں تو انشاء اللہ ایک نہ ایک دن اس آگ سے نجات مل کر رہے گی۔ لیکن ہاتھ پاؤں ہلائے بغیر اس آگ کو زبانی صلواتیں ہی سناتے رہیں تو پھر اس سے بچنے کا کوئی راستہ نہیں۔

یہ ہرگز نہ سوچئے کہ کروڑوں بدعمل انسانوں کے انبوہ میں کوئی ایک شخص سدھر گیا تو اس سے کیا فرق پڑے گا؟ یا ہزار گناہوں میں سے کسی ایک گناہ کی کمی واقع ہوگئی تو اس سے کیا فائدہ ہوگا؟ یاد رکھئے کہ اطاعت خداوندی ایک نور ہے اور نور کتنا ہی مدہم اور اس کے مقابلے میں تاریکی کتنی ہی گھٹا ٹوپ ہو، لیکن وہ بے فائدہ کبھی نہیں ہوتا، اگر آپ

ایک ظلمت کدے میں ایک دم سرچ لائٹ روشن نہیں کر سکتے تو ایک چھوٹا سا چراغ ضرور جلا سکتے ہیں اور بعید نہیں کہ اس چھوٹے سے چراغ کی روشنی میں آپ وہ سوئچ تلاش کر لیں جس سے سرچ لائٹ روشن ہوتی ہے۔ اس کے برعکس جو احمق سرچ لائٹ سے مایوس ہو کر چھوٹا سا دیا بھی نہ جلائے، اس کی قسمت میں ابدی تاریکیوں کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا۔

انبیاء علیہم السلام جب دنیا میں تشریف لاتے ہیں تو بالکل تنہا ہوتے ہیں اور ان کے چاروں طرف گمراہی کا اندھیرا چھایا ہوا ہوتا ہے، لیکن اسی اندھیرے میں وہ ہدایت کا چراغ جلاتے ہیں پھر چراغ سے چراغ جلتا ہے یہاں تک کہ رفتہ رفتہ تاریکیاں کافور ہو جاتی ہیں اور اجالا پھیل جاتا ہے۔

لہٰذا خدا کے لیے اپنی مجلسوں میں یہ مایوسی کے جملے بولنے چھوڑیے کہ ''بے دینی کا سیلاب ناقابل تسخیر ہو چکا ہے'' اس کے بجائے اس سیلاب کو روکنے اور اس سے بچنے کے لیے جو کچھ آپ کر سکتے ہیں کر گذریئے، کوئی بڑی خدمت اگر بن نہیں پڑتی تو جو چھوٹی سی نیکی آپ کے بس میں ہے اس سے دریغ نہ کیجیے اور باقی کے لیے کوشش اور دعا سے ہمت نہ ہاریئے، قوم اور ملک افراد ہی کے مجموعے کا نام ہے اور اگر ہر فرد اپنی جگہ یہ طرز عمل اختیار کر لے تو بہت سے چھوٹے چھوٹے چراغ مل کر سرچ لائٹ کی کمی یوں بھی ایک حد تک پوری کر دیتے ہیں اور پھر عادت اللہ یوں ہے کہ جس قوم کے افراد اپنے آپ کو مقدور بھر بدلنے کا عزم کر لیتے ہیں اللہ تعالیٰ کی حمایت و نصرت ان کے شامل حال ہو جاتی ہے اور اللہ تعالیٰ اس میں سدھار پیدا کر ہی دیتا ہے:

والذین جاھدوا فینا لنھدینھم سبلنا

''اور جو لوگ ہماری راہ میں کوشش کریں گے، ہم انہیں ضرور اپنے راستوں کی ہدایت دیں گے۔''

اللہ تبارک و تعالیٰ ہمیں مایوسی کے عذاب سے بچا کر اپنی حقیقی اصلاح کی طرف متوجہ فرمائے اور زمانے کے طوفانوں سے مرعوب ہونے کے بجائے ہمیں ان کے مقابلے کا حوصلہ اور اس کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین ثم آمین۔

وما علینا الا البلاغ

مضمون:۲۱

شعائرِ اسلام کا استہزاء

دو ناپاک مہمات

گزشتہ سے پیوستہ شمارے میں ہم نے اس اشتعال انگیز فلم کا تذکرہ کیا تھا جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نام سے بن رہی ہے۔ حال ہی میں قاہرہ سے کسی غیور مسلمان نے بیروت کے ہفت روزہ ''الحوادث'' کا ایک تراشہ ہمیں بھیجا ہے۔ جس سے اس فلم کے بارے میں مزید مصدقہ اطلاعات فراہم ہوئی ہیں۔ ہفت روزہ ''الحوادث'' بیروت کے ایک نامہ نگار الظوان فرانسیس نے حال ہی میں لیبیا کا دورہ کر کے اس فلم کی شوٹنگ کے مناظر بچشم خود دیکھے ہیں۔ اس میں کام کرنے والوں سے ملاقات کی ہے اور اس کے مختلف مناظر کی تصویریں ''الحوادث'' میں شائع کی ہیں۔

یہ فلم لیبیا کے شہر ''سبھا'' میں بن رہی ہے جو طرابلس سے ایک ہزار کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔ اس فلم پر اخراجات کا اندازہ ۱۵ ملین ڈالر (پندرہ کروڑ روپیہ سے زائد ہے) اس میں مختلف ملکوں کے چالیس ممتاز اداکار اور پانچ ہزار ضمنی کام کرنے والے اداکار حصہ لے رہے ہیں۔ سبھا شہر کے ہوٹل چونکہ اس مہم میں حصہ لینے والوں کے لیے ناکافی تھے اس لیے حکومت نے نئی عمارتوں کی ایک بڑی تعداد اس شیطانی فوج کی رہائش کے لیے مخصوص کر دی ہے جو اسلام اور اکابر اسلام کی عزت و ناموس کے خلاف تاریخ کی ایک منفرد سازش کے لیے جمع ہوئی۔ ہ ادر عمارتوں میں فلم کمپنی کے لیے بہت سے ہوٹل، کلب اور سینما ہال بنا دیئے گئے ہیں، تاکہ اس فوج کے سپاہی فارغ اوقات میں یہاں دادِ عیش دے سکیں، اس کے علاوہ سبھا کے ایک اسکول کو فلم کمپنی کے دفاتر میں تبدیل کر دیا گیا ہے۔ تصویر کشی کے لیے دنیا کے معروف ترین کیمرہ مین جیک ہلڈیارڈ کی خدمات حاصل کی گئی ہیں جو اپنی فنی مہارت سے عالمی انعامات حاصل کر چکا ہے۔ اداکاروں کے لیے ملبوسات تیار کرنے کا کام فیلپس ڈالٹن کے سپرد ہے جو اپنے

کام کے لیے مشہور ہے۔ جنگی مناظر کی منصوبہ بندی کے لیے انڈرو مارٹون کو دعوت دی گئی ہے۔ موریس جار موسیقی کا ہدایت کار ہے۔ ہر منظر کی شوٹنگ دو یا تین مرتبہ کی جاتی ہے کیونکہ یہ فلم بیک وقت عربی اور انگریزی دونوں میں بن رہی ہے اور ہر زبان میں شوٹنگ کے لیے الگ اداکار کام کر رہے ہیں۔ انگریزی کاپی کا ہیرو انتھونی کوئین اور ہیروئن ایرین بابائل ہے اور عربی کاپی میں عبداللہ غیث اور منیٰ واصف ان کی نیابت کر رہی ہیں اور لبنان، سوریا، مصر، فلسطین، اردن، لیبیا، مراکش وغیرہ کے معروف فلمی اداکار اس مہم میں شامل ہیں۔

اس فلم کے ہدایت کار مصطفیٰ عقاد نے پہلے یہ فلم مراکش میں بنانی شروع کی تھی مگر وہاں مسلمانوں کی طرف سے شدید احتجاج ہوا۔ جس کی بناء پر وہ اپنا پورا پروجیکٹ لیبیا لے آیا اور جگہ کی اس تبدیلی سے اس کو تقریباً دو ملین ڈالر کا خسارہ ہوا ہے۔ اب لیبیا کی حکومت نے اس کو نہ صرف تمام سہولیات بہم پہنچائی ہیں بلکہ جنگوں کی منظر کشی کے لیے اپنی فوج کے سپاہی پیش کر دیئے ہیں۔ چنانچہ جتنے لوگ عہد رسالت صلی اللہ علیہ وسلم کے مجاہدین اور صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کے مقدس لشکر کا رول ادا کر رہے ہیں وہ سب لیبیا کے سپاہی ہیں۔

فلم سازی کی اس مہم کو تقریباً دو سال کا عرصہ گزر چکا ہے اور اس دوران فلمی اداکاروں کے درمیان بہت سے انقلابی واقعات رونما ہو چکے ہیں۔ الحوادث کے نامہ نگار انطوان فرانسیس کا کہنا کہ اس دوران ایک عرب ایکٹریس (فوزیہ علوی) نے ایک انگریز ایکٹر (دمیاس توماس) سے شادی کر لی ہے جو فلم میں حضرت زید رضی اللہ عنہ کا کردار ادا کر رہا ہے۔ اس دوران بعض اداکاروں اور ان کی بیویوں میں طلاق کے واقعات بھی ہو چکے ہیں اور لیبیا کا ایک فوجی عرب سپاہی کا کردار ادا کرتے ہوئے ایک گھوڑے کی ٹکر سے ہلاک بھی ہو چکا ہے۔

انطوان فرانسیس نے اس فلم کے بعض مناظر کی تصویریں حاصل کر کے وہ بھی 'الحوادث'' مین شائع کی ہیں۔ ایک تصویر میں دکھایا گیا ہے کہ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ فتح مکہ کے موقع پر گھوڑے پر سوار مکہ مکرمہ میں داخل ہو رہے ہیں۔ ایک دوسری تصویر میں حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ گھوڑے پر سوار ہو رہے ہیں۔ تیسری تصویر حضرت

ھندہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی ہے۔ چوتھی تصویر میں حضرت جعفر طیار رضی اللہ تعالیٰ عنہ، اور انکے بعض رفیق صحابہ رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کو دکھایا گیا ہے جو ان کے ساتھ حبشہ کی ہجرت میں شریک تھے۔ پانچویں تصویر میں فتح مکہ کا ایک عام منظر ہے جس میں صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کے مقدس لشکر گھوڑوں اور اونٹوں پر سوار دکھائے گئے ہیں۔

اور یہ تو چند وہ تصویریں ہیں جو اتفاق سے "الحوادث" کے نامہ نگار کے ہاتھ لگ سکیں۔ فلم میں اور کتنے صحابہ رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین وصحابیات رضی اللہ تعالیٰ عنہن کو نشانہ ستم بنایا گیا ہے، اللہ ہی جانتا ہے۔ بلکہ روزنامہ جنگ کے ایک نامہ نگار نے لندن سے خبر دی ہے کہ اس میں سرور کونین حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا سایہ بھی دکھایا گیا ہے اور یہ بات تو انطوان فرانسیس نے بھی لکھی ہے کہ فلم کی شوٹنگ کے لیے سات لاکھ ڈالر کے خرچ سے ایک فرضی کعبہ تعمیر کیا گیا ہے جسے دیکھنے والوں کا بیان یہ ہے کہ اس میں اور اصل کعبہ میں سرمو کوئی فرق نہیں ہے۔

اس فلم کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار ہم گزشتہ سے پیوستہ شمارے میں کر چکے ہیں۔ لیکن اس مرتبہ دوبارہ اس موضوع پر لکھنے کی ضرورت اس لیے پیش آئی کہ یہ شرمناک، جگر سوز اور اشتعال انگیز فلم مسلسل تکمیل کے مراحل طے کر رہی ہے اور عالم اسلام کے احتجاج کے باوجود اس کی رفتار میں کوئی فرق نہیں آیا۔ پاکستان کی وزارت امور مذہبی کی طرف سے یہ اعلان کیا گیا ہے کہ یہ مسئلہ جدہ کی مسلم وزرائے خارجہ کانفرنس میں پیش کیا جائے گا۔ لیکن یہ کانفرنس منعقد ہو کر ختم ہوگئی اور اس مسئلے کا کوئی ذکر تک نہیں آیا۔ بلکہ مسلسل یہ اطلاعات مل رہی ہیں کہ یہ فلم سال رواں کے آخر تک نمائش کے لیے پیش کر دی جائے گی۔

اگر خدانخواستہ یہ سانحہ پیش آ گیا اور اس فلم کی نمائش کو مسلمانوں نے برداشت کر لیا تو اسلام، اکابر اسلام اور شعائر اسلام کی توہین کا یہ سلسلہ کسی حد پر رکنے والا نہیں ہے، یہ شرمناک فلم درحقیقت "فجر اسلام" نامی فلم کی علی الاعلان نمائش کا نتیجہ ہے اور اس تازہ فلم کو برداشت کر لینے کا نتیجہ اس سے زیادہ خطرناک اور لرزہ خیز ہوگا۔ لہٰذا اس فتنے کا فوری سدباب پورے عالم اسلام کے مسلمانوں کا دینی فریضہ اور ان کی ملی غیرت کا

ناگزیر مطالبہ ہے۔ خدا وہ دن ہمیں اپنی زندگی میں نہ دکھائے جب مسلمان اتنے بے غیرت ہو جائیں کہ ان کی آنکھوں کے سامنے صحابہ رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین و صحابیات رضی اللہ تعالیٰ عنہن کا مذاق اڑایا جائے، کافر و فاجر افراد صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کا روپ دھار کر تفریحی ناٹک رچائیں اور دنیا کی بدنام ترین فاحشہ عورتیں (معاذ اللہ) ان مقدس صحابیات رضی اللہ تعالیٰ عنہن اور امہات المومنین رضی اللہ تعالیٰ عنہن کی شکل میں پیش ہوں جن کے تقدس اور حیا و عفت و عصمت کے آگے فرشتے بھی سر جھکاتے ہیں۔

اس فتنے کے سدباب کے لیے ہماری تجاویز یہ ہیں:

١۔ حکومت پاکستان کے وزارت امور مذہبی اس فلم کے بارے میں ایک مرتبہ اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کرنے کے بعد خاموش ہے، اس نے یہ وعدہ بھی کیا تھا کہ اس معاملہ کو وزرائے خارجہ کی کانفرنس میں پیش کیا جائے گا۔ لیکن اب تک اس طرح کی کوئی کارروائی سامنے نہیں آسکی۔ ہم سب سے پہلے وزارت مذہبی امور سے مطالبہ کرتے ہیں کہ وہ اس معاملہ میں پوری اہمیت کے ساتھ دلچسپی لے اور حکومت لیبیا کو اس افسوسناک مہم سے باز رکھنے کے لیے اپنا تمام اثر و رسوخ استعمال کرے۔

٢۔ ہمیں ضلع مردان کی ایک دینی تنظیم نے خط لکھا ہے کہ اس نے حکومت لیبیا کے نام یہ پیغام بھیجا ہے کہ اس فلم کی تیاری سے مسلمانوں کے دل مجروح ہو رہے ہیں۔ اس کے جواب میں لیبیا کی وزارت خارجہ کے دفتر سے ایک خط اس کو موصول ہوا ہے۔ اس خط کی فوٹو اسٹیٹ کاپی بھی اس تنظیم نے ہمارے پاس بھیجی ہے۔ حکومت لیبیا کی طرف سے اس خط میں یہ کہا گیا ہے کہ اب تک ہمیں کسی نے اس فلم کی حرمت پر علمی اور شرعی دلائل مرتب کر کے نہیں بھیجے۔ ہم اب تک یہ سمجھتے رہے کہ اس کی تیاری میں کوئی حرج نہیں۔ اب اگر کوئی مسلمان ہمیں قرآن و سنت کے ایسے دلائل فراہم کر دے جو اس فلم کی تیاری کو قطعی طور پر ناجائز قرار دیتے ہوں یا اس کی حرمت کی طرف اشارہ کرتے ہوں تو ہم اس کو قبول کرنے میں تاخیر نہیں کریں گے۔

اگر چہ بدیہی امور پر دلائل قائم نہیں کیے جاتے اور فلم کی حرمت پر دلائل کا مطالبہ ایسا ہی ہے جیسے کوئی شخص یہ کہنے لگے کہ برانڈی کی حرمت قرآن وحدیث میں کس جگہ لکھی ہے؟ تاہم اس عظیم دینی مقصد کی خاطر حکومت لیبیا کا یہ مطالبہ بھی پورا کر دینا چاہیے۔ اگر اس کا یہ وعدہ درست ہے کہ دلائل واضح ہو جانے کے بعد ہم اس کو قبول کرنے میں تاخیر سے کام نہیں لیں گے اور دلائل پیش کرنے سے معاملہ نمٹ جائے گا تو ہم اس اعلان کا خیر مقدم کرتے ہیں...... اور اگر خدانخواستہ کوئی دوسری صورت ہے تب بھی حکومت لیبیا پر اتمام حجت کر دینا بہر حال ضروری ہے۔

لہٰذا ضرورت اس بات کی ہے کہ اہل علم کی طرف سے اس فلم کی حرمت کے دلائل مرتب کر کے حکومت لیبیا کے پاس بھیجے جائیں۔ اس سلسلے میں ایک یادداشت دارالعلوم کی طرف سے مرتب کر کے بھیجی جا رہی ہے۔ دوسرے اہل علم اور علمی و دینی اداروں کی طرف سے بھی ایسی یادداشتیں فوراً بھیجی جانی چاہئیں۔

اور سب سے زیادہ موثر اور بہتر طریقہ یہ ہوگا کہ ممتاز اہل علم کا ایک وفد صرف اسی مقصد کے لیے لیبیا کا سفر کرے اور وہاں کرنل معمر القذافی سے مل کر براہ راست انہیں امت مسلمہ کا مؤقف سمجھائے۔ کرنل قذافی نے اپنے بہت سے کارناموں کے ذریعہ خدمت اسلام کے جذبے کا مظاہرہ کیا ہے اور کوئی بعید نہیں ہے کہ اہل علم کا یہ وفد ان کا ذہن اس معاملے میں صاف کر سکے اور اگر بالفرض خدانخواستہ ایسا نہ ہو سکا تب بھی کم از کم اہل علم آخرت کی جواب دہی سے سبکدوش ہو سکیں گے۔

۳۔ اگر خدانخواستہ اس فلم کو روکنے کی تمام کوششیں ناکام ہو جائیں تو پھر عالم اسلام کو اس بات پر آمادہ کرنے کی ضرورت ہوگی کہ وہ اپنے اپنے ملکوں میں نہ صرف اس فلم کی درآمد ہونے سے روکیں بلکہ جس کمپنی نے یہ فلم بنائی ہے اس کی ہر فلم کا مکمل بائیکاٹ کریں۔

اگر خدانخواستہ امت مسلمہ نے اپنے فرائض میں کوتاہی کی تو یہ مسلمانوں کی بے غیرتی کا ایسا دلخراش سانحہ ہوگا جس کی نظیر ماضی کی تاریخ میں نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس بے غیرتی اور مداہنت سے محفوظ رکھے۔ آمین۔

شعائر اسلامی کا ایک اور مذاق:

ابھی اس اشتعال انگیز فلم کی خبروں سے دل و جگر زخمی تھے کہ اسلام اور شعائر اسلام کے ساتھ توہین آمیز استہزاء کی ایک اور دلخراش خبر موصول ہوئی ہے۔

ٹورنٹو (کینیڈا) کی ایک مسلمان تنظیم ''مسلم کمیونٹی آف ٹورنٹو'' نے ایک پمفلٹ ہمارے پاس بھیجا ہے، جس میں کینیڈا کے اخبارات کے عکسی تراشے بھی شامل ہیں۔ ان تراشوں سے پتہ چلتا ہے کہ کینیڈا میں Shriners کے نام سے نقالوں اور مسخروں کی ایک تنظیم نے اسلامی شعائر اور اکابر اسلام کا مضحکہ اڑانے کی ایک ناپاک مہم شروع کی ہے۔ یہ تنظیم سینکڑوں مسخروں، جوکروں اور میراثیوں پر مشتمل ایک ٹیم بنا کر عام سڑکوں پر پریڈ کرتی ہے۔ انہوں نے سب سے پہلے تو اپنے بینڈ ماسٹروں کو عربوں کے ڈھیلے ڈھالے لباس پہنچائے جو عقال اور مشلعے پر مشتمل ہیں، تاکہ یہ لوگ مسلمان ظاہر ہوں اور باقی مسخروں کو اونچی ترکی اور مصری ٹوپیاں پہنائی گئی ہیں۔ ان ٹوپیوں میں سے ہر ایک پر کوئی عربی نام یا لفظ نمایاں طریقے سے لکھا گیا ہے۔ جو اس مسخرے کا نام ہے جس نے وہ ٹوپی پہن رکھی ہے۔ اس طرح کسی ٹوپی پر مکہ، کسی پر مدینہ، کسی پر صلاح الدین ایوبی، کسی پر ابو بن ادھم، کسی پر جبرئیل علیہ السلام اور کسی پر سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا اسم گرامی تحریر ہے اور اخلاق و شرافت کے ایک دشمن نے تو اپنے جسم کے ناپاک ترین حصے پر ''خانہ کعبہ'' کا نام لکھ کر رذالت اور کمینگی میں بدترین جانوروں کو بھی مات کر دیا ہے اور پھر جوکروں اور بھانڈوں کی اس انسانیت سوز پریڈ کا مجموعی نام ''القرآن'' رکھا گیا ہے۔

اخبار ٹورنٹو اسٹار اور ٹورنٹو سن مورخہ ۱۴؍ جولائی اور سنڈے سن مورخہ ۲۹؍ جون کے شماروں میں اس ناپاک پریڈ کی بہت سی اشتعال انگیز تصویریں شائع ہوئی ہیں جس کا عکس مسلم کمیونٹی آف ٹورنٹو کے اس پمفلٹ میں بھی شائع کیا گیا ہے۔ انہی اخبارات سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام اور اکابر اسلام کی توہین کا یہ سلسلہ صرف ٹورنٹو ہی کی حد تک محدود نہیں، بلکہ واشنگٹن، لاس اینجلز، میامی اور شکاگو میں بھی جاری ہے اور یہ پوری اسلام دشمن تحریک تفریح طبع اور فنون لطیفہ کے نام پر چل رہی ہے۔ کینیڈا کے اخبارات اس تحریک سے نہ صرف مزے لے رہے ہیں اور اس کی تصاویر نمایاں طور پر شائع

کر رہے ہیں، بلکہ وہ خود بھی استہزاء کی اس مہم میں اپنی بساط کی حد تک شریک ہو گئے ہیں۔ چنانچہ اخبار ٹورنٹو نے ایک کارٹون شائع کیا ہے جس میں ایک مسخرہ منہ میں پائپ لگائے بیٹھا ہے اور اس نے پاؤں کوڑے کرکٹ کی ایک بالٹی میں ڈال رکھے ہیں جس پر چاند تارا بنا ہوا ہے جسے عام طور پر اور بالخصوص مغربی ممالک میں مسلمانوں کی علامت سمجھا جاتا ہے۔ نیز اسی اخبار نے واشنگٹن میں یو پی آئی کی ایک خبر تیل پیدا کرنے والے مسلم ممالک کے خلاف ۲/ جولائی کے شمارے میں شائع کی ہے۔

مضمون: ۲۲

اس عید کو یوم توبہ بنائیے

دنیا کی ہر قوم کا دستور ہے کہ وہ سال کے کچھ دن مخصوص کر کے انہیں اپنا قومی تہوار قرار دیتی اور ان میں اجتماعی طور پر خوشی مناتی ہے۔ لیکن اسلام کے سوا دوسرے تمام مذاہب چونکہ عموماً ظاہری رسموں اور ضابطوں میں جکڑے ہوئے ہیں اور ان پر توہم پرستی کی گہری چھاپ نمایاں ہے، اس لیے ایک طرف تو انہوں نے اپنے جشن مسرت کے لیے ایسے دنوں کا انتخاب کیا ہے جس کی پشت پر عموماً کچھ تاریخی واقعات ہیں جو ایک مرتبہ پیش آ کر ختم ہو گئے، یا پھر ان کے پس منظر میں شخصیت پرستی اور توہمات کا ایسا سلسلہ ہے جس کا جیتی جاگتی زندگی سے کوئی تعلق نہیں۔ دوسرے ان مذاہب میں عموماً تہواروں کی تعداد اتنی زیادہ ہے کہ انہوں نے مذہب کی بنیادی تعلیمات کی جگہ لے لی ہی۔ مذہب کی اصل تعلیمات پیچھے چلی گئی ہیں اور یہ رسمی مظاہرے آگے آ گئے ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ بیرونی دنیا میں یہ مذاہب اپنی تعلیمی خصوصیات کے بجائے انہی تہواروں سے پہچانے جاتے ہیں۔

تیسرے عموماً ان ملکوں میں خوشی منانے کے لیے کوئی اجتماعی پروگرام متعین کرنے کے بجائے انسان کو اتنا آزاد چھوڑ دیا گیا ہے کہ وہ کیف ونشاط میں بدمست ہو کر بسا اوقات بہیمیت کی حدود بھی عبور کر جاتا ہے اور ہر خوشی کا تہوار ان کے یہاں حیوانیت کا جنون لے کر نمودار ہوتا ہے اور انسانوں کی عزت وشرافت نفسانی خواہشات کے ہاتھ میں دے کر رخصت ہو جاتا ہے۔ عیسائیوں کی کرسمس، واقعات شاہد ہیں کہ ہر موقعہ پر خوشی کے چراغ چند بڑے گھرانوں میں اجالا کر کے دوسرے بہت سوں کے جھونپڑے پھونک ڈالتے ہیں۔ چنانچہ جرائم کے اعداد و شمار سے واضح ہوتا ہے کہ قتل وغارت گری، لوٹ مار، ٹریفک کے حادثات، اغواء، زنا بالجبر، شراب نوشی اور دوسری بہت سی برائیوں کے جتنے واقعات ان تہواروں کے موقع پر

ہوتے ہیں کسی اور دن نہیں ہوتے۔

اسلام نے انسانی فطرت کی رعایت کرتے ہوئے انسان کو خوشی کے دن تو عنایت فرمائے ہیں، لیکن ان کے اردگرد احکام و آداب کا ایک ایسا حصار بھی تعمیر کیا ہے جو انسان کو ان نتائج بد سے باز رکھ سکے، اول تو ایسے دن سال بھر میں صرف دو رکھے گئے ہیں، ایک عیدالفطر اور دوسرے عیدالاضحیٰ۔ تیسرے ان عیدوں کو کسی تاریخی واقعہ کے ساتھ وابستہ کرنے کے بجائے انہیں ایک ایسی اجتماعی عبادات کا صلہ قرار دیا ہے جو ہر سال انجام پاتی ہے۔ عیدالفطر کو رمضان کے مہینے کے فوراً بعد ایسے موقع پر رکھا ہے جب تمام مسلمان ایک مہینے کی ریاضت و عبادت سے فارغ ہوتے ہیں اور عیدالاضحیٰ ایسے وقت منائی جاتی ہے جب کہ مسلمان ایک دوسری عظیم الشان عبادت یعنی حج کی تکمیل کرتے ہیں۔

اس طرح یہ دونوں عیدیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان عبادتوں کا فوری انعام بھی ہیں اور بندوں کی طرف سے اس بات کا اظہار شکر و مسرت بھی کہ اللہ نے انہیں ان عبادتوں کی ادائیگی کی توفیق عطا فرمائی۔ یہی وجہ ہے کہ ان دونوں دنوں کا آغاز بھی اللہ تعالیٰ کے حضور سجدۂ شکر بجالا کر ہوتا ہے۔

مسرت کے ان ایام کو مذکورہ عبادتوں کے ساتھ وابستہ کرنے کا ایک نفسیاتی اثر یہ بھی ہوتا ہے کہ انسان کا نفس جو ہر خوشی کے موقع پر معصیت کی راہ پر چل پڑنے کا عادی ہے، طبعی طور پر بے لگام نہیں ہو پاتا۔ مسلمان عیدالفطر اس وقت مناتا ہے جب وہ پورے ایک ماہ تک نفس کو قابو میں رکھنے کا ایک طویل مجاہدہ کر چکتا ہے۔ اس مجاہدہ کے دوران اس نے روزے رکھ کر کھانے پینے کے جائز افعال سے بھی اجتناب کیا ہے، اس لیے عید کے موقع پر اسے یہ جائز اور حلال اشیاء بھی غیر معمولی تسکین بخشتی ہے اور معصیتوں کی طرف طبعی میلان میں کمی واقع ہو جاتی ہے۔ اسی طرح عیدالاضحیٰ

اما الأحبة فالبيداء دونهم

فليت دونك بيداً دونها بيدا

ان حالات میں تو ہمارے لیے یوں بھی عید کے فرائض و سنن کی ادائیگی سے زیادہ اظہار مسرت کا کوئی اور پروگرام موزوں نہیں۔

اس کے بجائے ہمارے جو بھائی آج عید کے روز بھی ہمارے پاس نہیں ہیں، ان کا ہم پر یہ حق ہے کہ ہم عید کے عظیم اجتماعات میں اللہ تعالیٰ کے حضور پورے اخلاص اور تضرع کے ساتھ اپنے ان گناہوں سے توبہ کریں جن کی بدولت شکست کی یہ روسیاہی ہمارا مقدر بنی ہے اور ہماری آنکھوں نے اپنی ذلت کا وہ نظارہ دیکھا ہے جو تاریخ میں پہلے کبھی نہیں دیکھا۔

اس عید کا ہم سے یہ مطالبہ ہے کہ ہم عیش و نشاط کی محفلیں آراستہ کرنے کے بجائے ٹوٹے ہوئے شرمسار دلوں اور پرنم نگاہوں کے ساتھ اپنے مالک کے حضور حاضر ہوں۔ اس کے سامنے توبہ کریں اور اجتماعی طور پر اپنے گناہوں کی معافی مانگ کر اس کی اطاعت کا عہد پھر سے تازہ کریں اور اس عزم کے ساتھ عید منائیں کہ آئندہ اپنے ان جرائم کا اعادہ نہیں ہونے دیں گے جو ہماری تباہی کا باعث ہوئے۔

بارالٰہا! ہمیں عید کے اس مطالبے کو سمجھنے اور اسے ٹھیک ٹھیک پورا کرنے کی توفیق عطا فرما اور ہمیں ان لوگوں میں سے نہ بنا جو مہلت کی گھڑیوں کو غلط سمجھتے ہیں اور پھر ہمیشہ اس کی سزا بھگتتے ہیں۔

آمین اللھم آمین!

محمد تقی عثمانی

۱۰/رمضان ۱۳۹۲ء

مضمون: ۲۳

اسلام اور آرٹ

روزنامہ جنگ کی رپورٹ کے مطابق چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر جنرل محمد ضیاء الحق صاحب نے نیشنل آرٹ گیلری میں تصاویر کی ایک نمائش کا افتتاح کرتے ہوئے کہا کہ:

''اسلام آرٹ کی قدر و منزلت کرنے سے نہیں روکتا، اگرچہ قرات کا جدید گیتوں اور گانوں سے موازنہ نہیں کیا جاسکتا، لیکن وہ بھی ایک آرٹ ہے۔ اسے سن کر یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ بجائے خود ایک آرٹ ہے۔ آرٹ کسی بھی قسم کا ہو، خواہ مصوری ہو، موسیقی ہی ہو یا مجسمہ سازی، اس کی تعریف و توصیف کرنا عین اسلامی ہے۔''

چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر نے یہ بھی کہا کہ:

''بعض اوقات عورتوں کے گھروں سے باہر آنے کے بارے میں شکوک و شبہات کا اظہار کیا جاتا ہے۔ لیکن اگر عورتوں کو جو ملک کی آبادی کا نصف حصہ ہیں گھروں کی چار دیواری میں مقید کر دیا گیا تو ہم پوری قوم کے تعاون سے نہیں، بلکہ نصف قوم کے تعاون سے کام کریں گے۔''

انہوں نے کہا کہ:

''گیت، موسیقی اور رقص پاکستان کی تہذیب و ثقافت اور تاریخ کا حصہ ہیں۔ سرکار کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں خواتین بہادری کے گیت گایا کرتی تھیں۔ کوئی وجہ نہیں کہ اب وہ اس سے ہچکچائیں۔'' (جنگ: مورخہ ۶، ۷ اپریل ۱۹۷۸ء)

''جنگ'' کی رپورٹنگ کے مطابق ہم نے محترم جنرل صاحب کی تقریر کا خلاصہ بعینہ اوپر کھل کر پیش کیا۔ ہمیں شبہ ہے کہ اس تقریر کی رپورٹنگ میں کوئی غلط فہمی ہوئی ہے،

کیونکہ جو باتیں اس میں بیان کی گئی ہیں ان کے بارے میں یہ یقین کرنا مشکل معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک ایسے سربراہ حکومت نے کہی ہوں گی جس نے آتے ہی ''چادر اور چار دیواری'' کے تحفظ کو اپنے اولین مقاصد میں شمار کیا تھا۔

لیکن اگر خدانخواستہ یہ رپورٹنگ درست ہے اور جنرل صاحب کا مفہوم واقعتاً وہی تھا جو اس میں بیان کیا گیا ہے تو ہمارے پاس حیرت وافسوس کے اظہار کے الفاظ نہیں ہیں، کیونکہ اس بیان سے ان لاکھوں مسلمانوں کی سخت دل شکنی ہوئی ہے جنہوں نے سالہا سال کی قربانیوں اور مایوسیوں کے بعد جنرل ضیاء صاحب کے اعلانات اور اقدامات میں امید کی ایک کرن دیکھی تھی۔

جہاں تک ''آرٹ'' کا تعلق ہے وہ ایک ایسا مبہم لفظ ہے جس کی کوئی جامع و مانع متفقہ تعریف آج تک نہیں کی گئی۔ اس کی ذیل میں جہاں بہت سی جائز اور مفید چیزیں شامل ہیں، وہاں عصر حاضر کے شاطروں نے اس لفظ کو طرح طرح کی بداخلاقیوں کو سند جواز فراہم کرنے کے لیے بھی استعمال کیا ہے۔ چنانچہ صرف مصوری اور موسیقی ہی کو نہیں بلکہ رقص اور برہنگی کو بھی ''آرٹ'' قرار دیا گیا ہے اور حد تو یہ ہے کہ عصمت فروشی کو ''آرٹ'' قرار دے کر اسے سند جواز فراہم کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

ان حالات میں اگر واقعتاً جنرل صاحب موصوف نے یہی بات ارشاد فرمائی ہے کہ ''آرٹ کسی بھی قسم کا ہو اس کی تعریف وتوصیف کرنا عین اسلامی ہے'' تو یقین رکھئے کہ دنیا کی کوئی بداخلاقی ایسی نہیں ہے جسے حرام قرار دینے والے اس کے آرٹ ہونے کا ڈھنڈورا پیٹ کر اسے حلال نہ کرلیں۔

ہم یہ سمجھتے ہیں اور انسانیت وشرافت کا ضمیر اس بات کی صداقت پر گواہی دے گا کہ عورت کو منظر عام پر رقص کروا کر اسے اپنے اعضاء اور ہیجان حرکات کی نمائش پر مجبور کرنا عورت کی اتنی بڑی تذلیل ہے کہ اس کے برابر اس کی کوئی تذلیل نہیں ہوسکتی، لیکن عورت کو بے وقوف بنا کر اس سے اپنے سفلی جذبات ٹھنڈے کرنے والوں نے عورت کی اس تذلیل کا نام ''آرٹ'' رکھ کر دنیا بھر میں اس کا اتنا پروپیگنڈہ کیا ہے کہ آج محترم جنرل صاحب جیسے نیک دل انسان نے بھی اس کو ''آرٹ'' میں شمار کر کے اسے پاکستان کی تہذیب وثقافت اور تاریخ کا لازمی جز بنادیا ہے۔

سوال یہ ہے کہ اگر پاکستان کی تہذیب و ثقافت اور تاریخ اسلام سے الگ کوئی چیز ہے اور اسلام کے احکام سے بے نیاز ہو کر بھی اس کا تقدس بحال رکھنا ضروری ہے تو پھر نائٹ کلب بھی دوبارہ کھل جانے چاہئیں۔ جن کو اس ارض پاک کے جیالے مسلمانوں نے اپنے خون کا نذرانہ دے کر بند کرایا ہے۔ کیونکہ ''آرٹ'' کے شیدائیوں کی نظر میں'' وہ بھی ایک آرٹ تھا اور اسے بھی پاکستانی تہذیب و ثقافت کا ایک جزو قرار دیا جانا چاہیے اور پھر اسی پر بس نہیں، طوائفوں کے وہ کوٹھے جن کو کسی زمانے میں برصغیر کی تہذیب و ثقافت کا جزو سمجھا جاتا تھا، آرٹ کی سرپرستی کے ذیل میں اس کا احیاء بھی ناگزیر ہونا چاہیے۔

ہمارا خیال ہے کہ محترم جنرل صاحب نے ''آرٹ'' کے بارے میں یہ باتیں ارشاد فرماتے وقت ان کے دور رس نتائج پر غور نہیں فرمایا، ورنہ وہ یہ باتیں ارشاد نہ فرماتے۔

مصوری، مجسمہ سازی اور موسیقی کی حرمت پر بھی اتنی احادیث موجود ہیں کہ ان سے ایک پوری کتاب تیار ہو سکتی ہے اور ان کو اسلامی نقطہ نظر سے قدر و منزلت کے لائق قرار دینا ایک ایسے سربراہ حکومت کے شایان شان نہیں ہے جس کی اسلام دوستی اور نیک دلی کو ملک بھر میں خراج تحسین پیش کیا گیا ہے اور جہاں تک عورتوں کو گھر میں مقید رکھنے کا تعلق ہے، اگر اس سے مراد پردے کے احکام ہیں تو ان احکام کے لیے قید و بند کے الفاظ بھی درحقیقت ان لوگوں نے مشہور کیے ہیں جنہوں نے عورت کو باقاعدہ ایک سازش کے تحت سڑکوں پر اس لیے دھکیلا ہے کہ ایک طرف وہ عورت کی معاشی کفالت سے آزاد ہو جائیں اور دوسری طرف قدم قدم پر عورت کے وجود سے اپنی ہوسناک نگاہوں کی تسکین کر سکیں۔ حیرت ہے کہ جنرل صاحب اس بلا جواز پروپیگنڈے سے کیسے متاثر ہو گئے۔

پھر ہمیں معلوم نہیں کہ جنرل صاحب نے یہ بات کونسی کتاب میں پڑھ لی ہے کہ عہد رسالت صلی اللہ علیہ وسلم میں خواتین بہادری کے گیت گایا کرتی تھیں؟ پچیس سال تو ہمیں دینی کتابیں پڑھتے پڑھاتے ہو گئے ہیں، لیکن ایسی کوئی روایت ہمیں کسی مستند کتاب میں نظر نہیں آئی کہ صحابیات رضی اللہ تعالیٰ عنہن اجنبی مردوں کے سامنے

بہادری کے گیت گایا کرتی ہوں۔

قرآن کریم کا ارشاد تو یہ ہے کہ:

وقرن فی بیوتکن ولا تبرجن تبرج الجاھلیة الاولی (سورہ احزاب:۳۳)

''اور (اے خواتین) تم اپنے گھروں میں قرار سے رہو اور جاہلیت اولیٰ کی طرح بناؤ سنگھار کر کے باہر نہ پھرو۔''

اور احادیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ ارشادات ملتے ہیں کہ:

المرأة عورة فاذا اخرجت استشرفها الشيطان.

(مشکوٰۃ از ترمذی)

''عورت خفیہ رہنے کی چیز ہے، جب وہ بے پردہ باہر نکلتی ہے تو شیطان اس کی تاک میں لگ جاتا ہے۔''

ایک اور جگہ ارشاد ہے:

لیکونن فی امتی اقوام یستحلون الحر والحریر والخمر والمعازف (بخاری۔ج:۲،صفحہ:۸۳۷)

''میری امت میں ایسے لوگ بھی آئیں گے جو زنا، ریشم، شراب اور آلات موسیقی کو حلال قرار دیں گے۔''

اور

امرت عجق المعازف والمزامیر

''مجھے باجوں اور مزامیر کے مٹانے کا حکم دیا گیا ہے۔''

اور

ان اشد الناس عذابا یوم القیامة المصورون

(بخاری مع فتح الباری ج ۱۰ صفحہ ۳۱۴)

''قیامت کے دن جن لوگوں پر سخت ترین عذاب ہوگا ان میں تصویریں بنانے والے بھی داخل ہوں گے۔''

اور:

ان الملائکۃ لاتدخل بیتا فیہ صورۃ

(بخاری مع فتح الباری ج ۱۰ صفحہ ۳۲۰)

''جس گھر میں تصویر ہو اس میں فرشتے داخل نہیں ہوتے۔''

قرآن و حدیث کے ان واضح ارشادات کی موجودگی میں جنرل صاحب کا ایک ہی سانس میں مصوری، مجسمہ، رقص و سرور اور بے پردگی کو نہ صرف جائز، بلکہ مستحسن اور قابل ہمت افزائی قرار دینا اتنی بڑی غلطی ہے جس کی کوئی توجیہ یا تاویل نہیں کی جاسکتی۔

مصوری، موسیقی اور مجسمہ سازی کے نام نہاد ''فنون لطیفہ'' اور عورتوں کی بے پردگی نے ایک عرصے سے ہمارے معاشرے کو لپیٹ میں لے رکھا ہے اور انہی چیزوں کی بناء پر ہماری زندگی میں بداخلاقیوں کا طوفان رفتہ رفتہ اپنی انتہاء کو پہنچ رہا ہے، ساتھ ہی ہمیں یا اسلامی شریعت کا نفاذ چاہنے والوں کو اس بات میں بھی شبہ نہیں ہے کہ یہ بگاڑ ایک دن میں ختم ہو جانے والا نہیں ہے، بلکہ اس کی اصلاح کے لیے حکمت و تدریج اور ذہنوں کی تعمیر کی ضرورت ہے۔ اس لیے اول تو اس قسم کی چیزوں کی کم از کم حوصلہ افزائی سے باز رہنے کی ضرورت ہے، اگر بالفرض اس پر بھی قدرت نہ ہو تو ضروری ہے کہ جس برائی کا مکمل انسداد فوری طور پر ممکن نہ ہو یا پالیسی کے خلاف ہو، اس کے بارے میں یہ بات ثابت کرنے کی کوشش بھی کی جائے کہ وہ اسلام کی نظر میں نہ صرف جائز، بلکہ پسندیدہ اور مستحسن بھی ہے؟ گناہ کو گناہ سمجھ کر کرنا اور اللہ تعالیٰ کے حضور شرمسار ہونا اس سے کہیں بہتر ہے کہ اس گناہ کو حلال، بلکہ قابل تعریف ثابت کرنے کے لیے قرآن و سنت میں تحریف کا دروازہ کھولا جائے۔

چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر جنرل محمد ضیاء الحق صاحب سالہا سال کے بعد پاکستان کے پہلے سربراہ ہیں جن کا پورے ملک میں انتہائی گرمجوشی سے خیر مقدم کیا گیا ہے اور اس گرم جوشی کی وجہ یہی ہے کہ ان کے بارے میں عوام یہ سمجھتے ہیں کہ وہ ایک نیک دل مسلمان ہیں اور ملک میں اسلام کا بول بالا کرنا چاہتے ہیں۔ ان حالات میں ان سے دردمندانہ درخواست ہے کہ وہ اپنے اس بیان پر نظر ثانی فرمائیں اور اگر اس میں رپورٹنگ کی غلطی ہے تو اس کی وضاحت فرمائیں۔

آخر میں محترم چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر صاحب سے گزارش ہے کہ ان کا منصب یہ نہیں ہے کہ وہ مختلف کاموں کے اسلامی یا غیر اسلامی ہونے کے فیصلے برسرِ عام دیں ہم ان کی خیر خواہی کے پیش نظر یہ عرض کرنے کی جرات کرنا ضروری سمجھتے ہیں کہ اگر یہ سلسلہ شروع ہوا تو اس سے بے شمار الجھنیں اور پیچیدگیاں پیدا ہو جائیں گی۔ امید ہے کہ ہماری یہ دردمندانہ گزارش ان کے لیے قابل قبول ہوگی۔

وما علینا الا البلاغ

محمد تقی عثمانی

۲۸ ربیع الثانی ۱۳۹۸ھ

مضمون: ۲۴

اسلامی معاشرے
میں جدت پسندی اور اس کی حدود

پچھلے مہینے ادارۂ تحقیقات اسلامی اسلام آباد نے اپنے جشن تاسیس کے موقع پر ایک محفل مذاکرہ کا اہتمام کیا تھا۔ جس میں احقر کو بھی مدعو کیا گیا اور ایک مقالہ پڑھنے کی فرمائش کی گئی تھی۔ اس محفل کے لیے احقر نے یہ مقالہ لکھا اور بھیج دیا۔ لیکن مذاکرے سے دو روز قبل ایک مکتوب کے ذریعہ یہ دعوت واپس لے لی گئی اور مقالہ بھی لوٹا دیا گیا۔ اب یہ قارئین البلاغ کی ضیافت طبع کے لیے حاضر ہے۔

''جدت پسندی'' بذات خود ایک مستحسن جذبہ ہے اور انسان کی ایک فطری خواہش ہے، اگر یہ جذبہ نہ ہوتا تو انسان پتھر کے زمانے سے ایٹم کے دور تک نہ پہنچتا، اونٹوں اور بیل گاڑیوں سے طیاروں اور خلائی جہازوں تک رسائی حاصل نہ کرتا، موم کی شمعوں اور مٹی کے چراغوں سے بجلی کے قمقموں اور سرچ لائٹوں تک ترقی نہ کرسکتا۔ انسان کی یہ رسائی مادی ترقیاں اور سائنٹفک فتوحات جنہوں نے ایک طرف چاند تاروں پر کمند ڈال رکھی ہیں تو دوسری طرف سمندر کی تہہ میں اپنے ڈول پہنچائے ہوئے ہیں، اگر دیکھا جائے تو انسان کے اسی جذبہ کی رہین منت ہیں کہ وہ ''جدت پسند'' اور خوب سے خوب تر کا حریص ہے۔

چنانچہ اسلام نے جو ایک فطری دین ہے۔ کسی ''جدت'' پر بحیثیت ''جدت'' کے کوئی پابندی عائد نہیں کی، بلکہ بسا اوقات اسے مستحسن قرار دیا ہے اور اس کی ہمت افزائی کی ہے۔

خاص طور سے صنعت وحرفت اور فنون جنگ وغیرہ کے بارے میں نئے نئے طریقوں کا استعمال آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے۔ غزوۂ احزاب کے موقع پر جب قبائل عرب نے اکٹھے ہو کر مدینہ منورہ پر حملہ آور ہونے کا پروگرام بنایا تو ان کے

دفاع کے لیے حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ نے ایک نئی تدبیر بتائی۔ جس پر عرب میں اس سے پہلے عمل نہیں ہوا تھا اور وہ تدبیر یہ تھی کہ شہر کی اطراف میں ایک گہری خندق کھودی جائے۔

چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس تدبیر کو پسند فرمایا کر اس پر عمل کیا اور خود بھی خندق کی کھدائی میں شریک رہے۔ (البدایہ والنہایہ ۴:۹۵)

انہی حضرت سلمان فارسی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے مشورے سے غزوۂ طائف کے موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دو نئے آلات حرب استعمال فرمائے جو بعض روایات کے مطابق حضرت سلمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے خود اپنے ہاتھ سے بنائے تھے۔ ان میں ایک منجنیق تھی، جسے اس زمانے کی توپ کہنا چاہیے اور دو دبالے تھے جنہیں اس دور کے ٹینک کہا جا سکتا ہے۔ (البدایہ والنہایہ ۴:۳۴۸)

پھر اسی پر بس نہیں، بلکہ حافظ ابن کثیر رحمتہ اللہ علیہ نے نقل کیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دو صحابیوں حضرت عروہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور حضرت غیلان بن سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو باقاعدہ شام کے شہر حبرش بھیجا، تاکہ وہ وہاں سے دبالے، منجنیق اور ضبور کی صنعت سیکھ کر آئیں۔ حبرش شام کا مشہور صنعتی شہر تھا اور ضبور، دبابے ہی کی طرح کا ایک آلہ تھا جسے اہل روم جنگوں میں استعمال کرتے تھے، چنانچہ یہ دونوں صحابی غزوۂ حنین اور غزوہ طائف میں اسی لیے شریک نہ ہو سکے کہ وہ ان دنوں شام میں یہ صنعت سیکھ رہے تھے۔

(طبقات ابن سعد ج ۲ ص ۲۲۱، تاریخ طبری ص ۱۶۶۹، البدایہ والنہایہ ج ۴ ص ۳۴۵)

حافظ ابن جریر رحمتہ اللہ علیہ نقل کرتے ہیں کہ زراعت کی ترقی کے لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل مدینہ کو زیادہ سے زیادہ کاشت کرنے کا حکم دیا اور پیداوار بڑھانے کے لیے یہ تدبیر بتائی کہ کھیتوں میں اونٹوں کی کھونپڑیاں استعمال کیا کریں۔

(کنز العمال۔ ج:۲، ص:۲۱۹۔ انواع الکسب)

ایک حدیث میں ہے کہ تجارت کی ترقی کے لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو مشورہ دیا کہ ''کپڑے کی تجارت کرو، کیونکہ کپڑے کا تاجر یہ چاہتا ہے کہ لوگ خوش حال اور فارغ البال رہیں۔ (کنز العمال۔ ج:۲، ص:۱۹۹۔ بیوع، انواع الکسب)

نیز آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے متعدد لوگوں کو تجارت کے لیے عمان اور مصر جانے پر آمادہ فرمایا۔ (کنزل العمال: ج ۲،ص ۱۹۷)

زراعت اور معدنیات سے فائدہ اٹھانے کے لیے آپ نے ارشاد فرمایا:

"اطلبوا الرزق فی خبایا الارض"

یعنی "زمین کی پوشیدہ نعمتوں میں رزق تلاش کرو۔"

(کنزالعمال۔ج:۲،ص:۱۹۷)

عرب کے لوگ بحری بیڑے سے نا آشنا تھے۔ لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مسرت کے ساتھ پیشن گوئی فرمائی کہ میری امت کے کچھ لوگ اللہ کی راہ میں جہاد کے لیے سمندری موجوں پر اس طرح سفر کریں گے جیسے تخت نشین بادشاہ۔

(صحیح بخاری کتاب الجہاد)

اور پھر مسلمانوں کی پہلی بحریہ کے بڑے فضائل بیان فرمائے۔ چنانچہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں پہلا بحری بیڑا تیار کیا اور اس سے مسلمان قبرص، روڈس، کریٹ اور صقلیہ تک پہنچ گئے۔ یہاں تک کہ پورا بحیرہ روم ان کے لیے مسخر ہو گیا۔ جس کی طرف اقبال مرحوم نے ان الفاظ میں اشارہ کیا ہے کہ ؎

تھا یہاں ہنگامہ ان صحرا نشینوں کا کبھی
بحر بازی گاہ تھا جن کے سفینوں کا کبھی

حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ۸ھ میں لخم اور جذام کے خلاف جنگ ذات السلاسل کے دوران پہلی بار بلیک آؤٹ کا طریقہ اختیار فرمایا اور اپنی فوج کو حکم دیا کہ لشکر گاہ میں تین روز تک رات کے وقت کسی طرح کی روشنی نہ کریں اور نہ آگ جلائیں۔ جب لشکر مدینہ طیبہ پہنچا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی اطلاع ہوئی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس عمل کی وجہ دریافت فرمائی۔ حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے جواب دیا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میرے لشکر کی تعداد دشمن کے مقابلہ میں کم تھی، اس لیے میں نے رات کو روشنی کرنے سے منع کیا کہ مبادا دشمن ان کی قلت تعداد کا اندازہ لگا کر شیر نہ ہو جائے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس جنگی تدبیر کو پسند فرما کر

اس پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا۔ (جمع الفوائد۔ ج:۲،ص:۲۷)

غرض یہ عہد رسالت صلی اللہ علیہ وسلم کی چند متفرق مثالیں تھیں جو سرسری طور سے یاد آ گئیں، مقصد یہ تھا کہ اسلام نے کسی جدید اقدام پر جدید ہونے کی حیثیت سے کوئی اعتراض نہیں کیا، بلکہ صحیح مقاصد کے لیے صحیح حدود میں رہ کر جدت پسندی کی ہمت افزائی کی ہے۔

لیکن یہ بھی اپنی جگہ حقیقت ہے کہ جس طرح جدت پسندی نے انسان کو مادی ترقی کے بام عروج تک پہنچایا ہے، اسے نئی نئی ایجادات عطا کی ہیں اور راحت و آسائش کے بہتر طریقے مہیا کیے ہیں، اسی طرح اس نے انسان کو بہت سے نفسانی امراض میں بھی مبتلا کیا ہے اور بہت سے تباہ کن نقصانات بھی پہنچائے ہیں۔ اسی جدت پسندی کی بدولت انسان کی تاریخ فرعونوں اور شدادوں سے بھری ہوئی ہے جنہیں طاقت و اقتدار کی کسی حد پر قرار نصیب نہیں ہوا، بلکہ وہ اقتدار کے شوق میں حکومت اور بادشاہی سے گذر کر خدائی کے دعویدار بن بیٹھے، اسی جدت پسندی نے ہٹلر اور مسولینی کو بھی جنم دیا جن کی ہوس ملک گیری ہر روز ایک نئے خطہ زمین کا اقتدار چاہتی تھی۔ اسی جدت پسندی نے آج پوری دنیا میں عریانی و فحاشی کا طوفان مچا رکھا ہے اور باہمی رضامندی سے زنا کو سند جواز دے رکھی ہے، بلکہ اب تو برطانیہ کے دارالعوام سے تالیوں کی گونج میں ہم جنس پرستی کے جواز کا بل بھی منظور کرا لیا گیا ہے۔ یہی جدت پسندی ہے جس کے سائے میں مغربی عورتیں اسقاط حمل کے جواز کا مطالبہ کرنے کے لیے برسرعام بینر اٹھائے پھر رہی ہیں اور یہی جدت پسندی ہے جسے بطور دلیل استعمال کر کے محرم عورتوں سے شادی رچانے کا مطالبہ کیا جا رہا ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ جدت پسندی ایک دو دھاری تلوار ہے جو انسانیت کو فائدہ پہنچانے کے کام بھی آ سکتی ہے اور اس کا کام تمام بھی کر سکتی ہے۔ لہٰذا ایک جدید چیز نہ محض نئی ہونے کی بناء پر قبول ہے اور نہ محض نئی ہونے کی بناء پر قابل تردید، یہاں تک تو بات صاف ہے لیکن آگے سب سے اہم سوال یہ ہے کہ وہ کیا معیار ہے جس کی بنیاد پر یہ فیصلہ کیا جا سکے کہ فلاں جدت مفید اور قابل قبول ہے اور فلاں مضر اور ناقابل قبول؟

اس معیار کے تعین کے لیے ایک صورت تو یہ ہے کہ یہ کام خالص عقل کے حوالے

کیا جائے۔ چنانچہ سیکولر معاشروں میں یہ فیصلہ عقل ہی کے پاس ہوتا ہے۔ لیکن اس میں دشواری یہ ہے کہ جن جن لوگوں نے ''جدت پسندی'' کے نام پر انسانیت سے اخلاق و شرافت کے سارے اوصاف لوٹ کر اسے حیوانیت اور درندگی کے راستے پر ڈالا وہ سب عقل ودانش کے دعویدار تھے اور ان میں سے کوئی بھی ایسا نہیں جس نے عقل خالص کو اپنا راہنما نہ بنایا ہو۔ وجہ یہ ہے کہ وحی الٰہی کی رہنمائی سے آزاد ہونے کے بعد ''عقل'' کی مثال ایک ایسے ہرجائی محبوب کی سی ہوتی ہے جسے متضاد قسم کے عناصر بیک وقت اپنا سمجھتے ہیں اور درحقیقت وہ کسی کا نہیں ہوتا۔ چنانچہ ایسی ''عقل'' میں ہر برے سے برے نظریئے اور برے سے برے عمل کی بھی شاندار اور خوبصورت توجیہات مل جاتی ہیں۔ مثلاً ہیروشیما اور ناگاساکی کا سن کر انسانیت کی پیشانی آج بھی عرق عرق ہو جاتی ہے، لیکن انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا جیسی علمی اور عالمی کتاب میں ان تباہ کاریوں کا ذکر بعد میں کیا گیا ہے جو ایٹم بم کی بدولت ہیروشیما اور ناگاساکی میں برپا ہوئیں، لیکن ایٹم بم کے تعارف میں یہ جملہ سب سے پہلے لکھا ہے کہ:

> "Former Prime Minister Winston Churchill estimated that by shortening the war, the atomic bomb had saved the lives of 100,000 U.S. soldiers & 250,000 British soldiers."
>
> ''سابق وزیراعظم ونسٹن چرچل نے اندازہ لگایا ہے کہ ایٹم بم نے جنگ کو مختصر کر کے دس لاکھ امریکی سپاہیوں اور ڈھائی لاکھ برطانوی سپاہیوں کی جانیں بچالی ہیں۔''
>
> (برٹانیکا: ج ۲، ص ۶۴۷، اے مطبوعہ ۱۹۵۰ء مقالہ: ایٹم بم)

اندازہ لگایئے کہ اس قسم کی منطق کی روشنی میں کونسا ظلم وستم اور کونسی سفاکی ایسی ہے جسے عقل کے خلاف کہا جاسکے؟

اس طرح کی عقلی توجیہات کی بہت سی مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں۔ یہاں میں شرم وحیا سے معذرت کے ساتھ ایک مثال اور پیش کروں گا جس کی روشنی میں عقل خالص کی

صحیح پوزیشن اچھی طرح واضح ہوسکتی ہے۔ تاریخ اسلام میں ایک فرقہ "باطنیہ" کے نام سے گذرا ہے۔ اس کا ایک مشہور لیڈر عبیداللہ القیر وانی اپنے ایک مکتوب میں لکھتا ہے:۔

"وما العجب من شیئ کالعجب من رجل یدعی العقل ثم یکون له اخت اوبنت حسناء، ولیست له زوجة فی حسنها فیحرمها علی نفسه وینکحها من اجنبی، ولو عقل الجاهل لعلم انه احق باخته وبنته من الاجنبی، وما وجه ذلک الا ان صاحبهم حرم علیهما الطیبات الخ"۔

(الفرق بین الفرق، لعبدالقاہر البغدادی۔ ص: ۲۹۷، طبع مصر)

"اس سے زیادہ تعجب کی بات اور کیا ہوسکتی ہے کہ ایک شخص عقل کا دعویدار ہونے کے باوجود ایسی حماقتیں کرتا ہے کہ اس کے پاس نہایت خوبصورت بہن یا بیٹی موجود ہوتی ہے اور خود اس کی بیوی اتنی حسین نہیں ہوتی، مگر وہ اس خوبصورت بہن یا بیٹی کو اپنے اوپر حرام قرار دے کر اسے کسی اجنبی سے بیاہ دیتا ہے۔ حالانکہ ان جاہلوں کو اگر عقل ہوتی تو وہ یہ سمجھتے کہ ایک اجنبی شخص کے مقابلے میں اپنی بہن اور بیٹی کے وہ خود زیادہ حقدار ہیں۔ اس بے عقلی کی وجہ دراصل صرف یہ ہے کہ ان کے آقا نے ان پر عمدہ چیزوں کو حرام کردیا ہے۔"

اس گھناؤنی عبارت کی شناعت وخباثت پر جتنی چاہے لعنت بھیجتے رہیے، لیکن دل پر ہاتھ رکھ کر سوچئے کہ جو عقل وحی الٰہی کی رہنمائی سے آزاد ہو، اس کے پاس اس دلیل کا کوئی خالص عقلی جواب ہے؟

حقیقت یہ ہے کہ ایک آزاد اور لبرل عقل کے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہیں ہے، چنانچہ صدیوں کے بعد عبیداللہ قیروانی کا یہ خواب شرمندۂ تعبیر ہورہا ہے اور بعض مغربی ممالک میں بہن سے شادی کرنے کی آوازیں اٹھنے لگی ہیں۔

خلاصہ یہ کہ "جدت پسندی" کی رو میں اگر اچھے برے کا فیصلہ خالص عقل پر چھوڑ

دیا جائے تو ایک طرف سے زندگی کی کوئی قدر صحیح سالم نہیں رہتی اور دوسری طرف چونکہ ہر شخص کی عقل دوسرے سے مختلف ہے۔ اس لیے انسان متضاد آراء اور نظریات کی ایسی بھول بھلیوں میں پھنس جاتا ہے جس سے نکلنے کا کوئی راستہ نظر نہیں آتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جو عقل وحی الٰہی کی رہنمائی سے آزاد ہو، انسان اسے آزاد عقل سمجھتا ہے۔ لیکن درحقیقت وہ اس کی بہیمی خواہشات اور نفسانی اغراض کی غلام بن جاتی ہے جو عقل کی غلامی کی بدترین شکل ہے اسی لیے قرآن کریم کی اصطلاح میں ایسی عقل کا نام ''ھویٰ'' (خواہش نفس) ہے اور اس کے بارے میں ارشاد فرمایا گیا ہے کہ:

ولو اتبع الحق اھوآءھم لفسدت السمٰوٰت والارض ومن فیھن

''اور اگر حق ان لوگوں کی خواہشات کا تابع ہو جائے تو آسمان و زمین اور اِن کی مخلوقات میں سخت بگاڑ پیدا ہو جائے۔''

فلسفہ قانون کی بحث میں فلاسفہ کے ایک گروہ کا تذکرہ آتا ہے۔ جن کے نظریہ اخلاق کو Non-Coonitivist Theory کہا جاتا ہے۔ مشہور ماہر قانون ڈاکٹر فرائڈمین نے اس نظریہ کا خلاصہ اپنی کتاب Legal Theory میں اس طرح بیان کیا ہے:

Reason is and ought only to be the slave of the passions and can never pretend to any other office than to serve and obey them. (P-36)

''عقل صرف انسانی جذبات و خواہشات کی غلام ہے اور اس کو انہی کا غلام ہونا بھی چاہیے۔ عقل کا اس کے سوا کوئی کام ہو ہی نہیں سکتا کہ وہ ان جذبات کی بندگی اور اس کی اطاعت کرے۔''

اس نظریہ سے حاصل ہونے والا نتیجہ ڈاکٹر فرائڈمین کے الفاظ میں یہ ہے:۔

Every thing else...... but also words like "good", "bad", "ought", "worthy"

are purely emotive, and there cannot be such a thing as elhical on moral science." (PP. 36,37)

''اس کے سوا ہر چیز یہاں تک کہ اچھے برے کے تصورات اور یہ الفاظ کہ فلاں کام ہونا چاہیے اور فلاں کام ہونے کے لائق ہے، کلی طور پر جذباتی باتیں ہیں اور دنیا میں علم اخلاق نام کی کوئی چیز موجود نہیں ہے۔''

یہ نظریہ فلسفہ قانون کی بنیاد بننے کے لیے خواہ کتنا غلط اور برا ہو، لیکن ایک سیکولر عقلیت کی بڑی سچی اور حقیقت پسندانہ تفسیر ہے، واقعہ یہی ہے کہ سیکولر عقل کی پیروی کا لازمی نتیجہ اس کے سوا ہو ہی نہیں سکا کہ دنیا میں اخلاق نام کی کسی چیز کا وجود باقی نہ رہے اور انسان کے قول وفعل پر اس کے نفسانی جذبات کے سوا کسی چیز کی حکمرانی قائم ہو۔ سیکولر عقلیت اور اخلاق درحقیقت جمع ہو ہی نہیں سکتے۔ کیونکہ ''جدت پسندی'' کی رو میں ایک مرحلہ ایسا آجاتا ہے جب انسان کا ضمیر ایک عمل کو برا سمجھتا ہے۔ لیکن وہ اسے اختیار کرنے پر اس لیے مجبور ہوتا ہے کہ ''جدت پسندی'' اور سیکولر عقلیت کے پاس اسے رد کرنے کی کوئی دلیل نہیں ہوتی۔ مغرب کے اہل فکر آج اسی عبرتناک بے بسی سے دوچار ہیں۔ ہم جنس پرستی کا جو قانون چند سال پہلے برطانوی پارلیمنٹ نے منظور کیا ہے، برطانیہ کے مفکرین کی ایک بڑی تعداد اسے اچھا نہیں سمجھتی، لیکن اسے تسلیم کرنے پر اس لیے مجبور تھی کہ خالص عقلی جدت پسندی کے مذہب میں جس جس برائی کا چلن عام ہوتا جائے اسے قانونی جواز عطا کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں رہتا۔ وولفیڈن کمیٹی جو اس مسئلہ پر غور کرنے کے لیے بیٹھی تھی اس کے یہ الفاظ کتنے عبرت خیز ہیں کہ:

"Unless a dolibenate attempt is made by society acting through the agency of the law to equate this fear of crime with that of sin there must remain a realm of private movality &

immonality which, in brief and crucle terms, not the law's bussiness."

(Leagal)

''جب تک قانون کے زیر اثر چلنے والی سوسائٹی کی طرف سے اس بات کی سوچی سمجھی کوشش نہیں کی جاتی کہ جرم کا خوف گناہ کے خوب کے برابر ہو جائے اس وقت تک پرائیویٹ اخلاق کے تصور کی حکمرانی برقرار رہے گی، جو مختصر مگر کھرے لفظوں میں قانون کے دائرہ کار سے باہر ہے۔''

حقیقت یہ ہے کہ اگر ''اچھے برے'' کا تمام تر فیصلہ ''خالص عقل'' کے حوالہ سے کیا جائے تو انسان کے پاس کوئی ایسا معیار باقی ہی نہیں رہتا جس کی بنیاد پر وہ کسی نئے رواج کو روک سکے، بلکہ ہر قیمتی اخلاقی قدر بھی ''جدت پسندی'' کے سیلاب میں بہہ جاتی ہے۔

آج مفکرین قانون کو اس بات پر سخت تشویش ہے کہ ''جدت پسندی'' کی عام روش کی موجودگی میں وہ کیا طریقہ اختیار کیا جائے جس سے کم از کم کچھ اعلیٰ انسانی اوصاف محفوظ اور ناقابل تغیر رہ سکیں۔ چنانچہ ایک امریکی جج جسٹس کارڈوزو لکھتے ہیں:

''آج قانون کی اہم ترین ضرورت یہ ہے کہ ایک ایسا فلسفہ قانون مرتب کیا جائے جو ثبات اور تغیر کے متضاد اور متحارب تقاضوں کے درمیان کوئی موافقت پیدا کر سکے۔'' (دی گروتھ آف دی لاء)

لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ کام کسی عقلی فلسفے کے بس کا نہیں ہے۔ یہ ساری خرابی پیدا ہی یہاں سے ہوئی ہے کہ وحی الٰہی کا کام عقل کے سر ڈال کر اس پر وہ بوجھ لاد دیا گیا ہے جس کی وہ متحمل نہیں۔ ظاہر ہے کہ کسی قانون کے بارے میں یہ کہنا کہ وہ دائمی اور ناقابل تغیر ہے کسی دلیل ہی کی بنیاد پر ہو سکتا ہے اور انسانی عقل ایسی کوئی دلیل پیش کرنے سے عاجز ہے۔ آج کچھ لوگ ایک قانون کو اپنی عقل کی بنیاد پر ناقابل تغیر قرار دیں گے کل دوسرے لوگوں کو اندازہ ہوگا تو وہ دائمی قانون بننے کے لائق نہ تھا، چنانچہ وہ پھر اس کے قابل تغیر ہونے کا اعلان کر دیں گے۔ لہٰذا اس مسئلے کا اگر کوئی حل ہے تو وہ سوائے اس

کے نہیں کہ انسان اپنی عقل کو نفسانی خواہشات کا غلام بنانے کے بجائے اس ذات کا غلام بنائے جس نے اسے اور پوری کائنات کو پیدا کیا ہے۔ وہ چونکہ دنیا میں واقع ہونے والے تمام تغیرات سے پوری طرح باخبر ہے اس لیے یہ بات اس کے سوا کوئی نہیں بتا سکتا کہ قانون کے کونسے اصول ناقابل تغیر ہیں۔ اصول قانون کے مشہور مصنف جارج پیٹن نے بالکل سچی بات لکھی ہے کہ:

What intenests should the ideal legal system protect? This is a a question of values, in which legal philosophy plays its part...... But, however much we desire the help of philosophy, it is difficult to obtain. No agred scale of values has even been reached, indeed, it is only in religion that we can find a besis, and the truths of religion must be accepted by faith on intuition & not purely as the resuluts of logical argument."

(Paton : Junisprudence P.121)

''ایک مثالی قانونی معاشرے کو کن مفادات کا تحفظ کرنا چاہیے؟ یہ ایک اقدار کا سوال ہے۔ جس میں فلسفہ قانون اپنا کردار ادا کرتا ہے..... لیکن اسی معاملے میں ہم فلسفے سے جتنی جتنی مدد مانگتے ہیں، اتنا ہی اس سے اس سوال کا جواب ملنا مشکل ہے، کیونکہ اقدار کا کوئی متفقہ پیمانہ اب تک دریافت نہیں ہوا، واقعہ یہ ہے کہ صرف مذہب ایسی چیز ہے جس میں ہمیں ایک بنیاد ملتی ہے اور مذہب کے حقائق کو بھی عقیدے کے ذریعے قبول کرنا چاہیے نہ کہ

خالص منطقی استدلال کے نتیجے کے طور پر۔"

خلاصہ یہ کہ زمانے کی جدتوں میں اچھے برے کا فیصلہ کرنے کے لیے سیکولر عقل ناکام ہو چکی ہے۔ لہٰذا اس مسئلے کے حل کے لیے اس کے سوا کوئی راستہ نہیں ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ اور اس کے قانون سے رہنمائی حاصل کرے۔ انسانیت کی نجات کی اس کے سوا کوئی سبیل نہیں، قرآن کریم ارشاد فرماتا ہے:

افمن کان علی بینة من ربه کمن زین له سوء عمله واتبعوا اهوآئهم (محمد:۱۴)

"تو جو لوگ اپنے پروردگار کے واضح راستہ پر ہوں کیا وہ ان لوگوں کی طرح ہو سکتے ہیں جن کی بدعملی ان کو بھی معلوم ہوتی ہو اور جو اپنی نفسانی خواہشات پر چلتے ہوں۔"

لہٰذا مسئلہ کا واحد حل یہی ہے کہ زمانے کے ہر نئے طور طریق اور ہر نئے رسم ورواج کو اس کی ظاہری چمک دمک کی بنیاد پر نہیں، بلکہ اس بنیاد پر جانچا جائے کہ وہ "پروردگار کے راستہ" کے مطابق ہے یا نہیں؟ اور اگر اس کے بارے میں اللہ اور اس کی شریعت کا کوئی حکم آ جائے تو اسے بے چوں چراں تسلیم کیا جائے۔ قرآن کریم کا ارشاد ہے:۔

وما کان لمؤمن ولا مؤمنة اذا قضی الله ورسوله امراً ان یکون لهم الخیرة من امرهم. (احزاب)

"کسی مومن مرد یا عورت کو یہ حق نہیں کہ جب اللہ تعالیٰ اور اس کا رسول کسی معاملے کا فیصلہ کر دے تو پھر اس معاملے میں اس کو اختیار باقی رہے۔"

اور:

فلا وربک لایؤمنون حتی یحکموک فیما شجر بینهم ثم لایجدوا فیٓ انفسهم حرجاً مما قضیت ویسلموا تسلیما

"پس اے نبی! نہیں، آپ کے پروردگار کی قسم یہ لوگ اس وقت تک مومن نہیں ہو سکتے جب تک آپ کو اپنے باہمی نزاعات میں

فیصل نہ بنائیں، پھر جو کچھ آپ فیصلہ کریں اس کے بارے میں اپنے دلوں میں کوئی تنگی محسوس نہ کریں اور اسے پوری طرح تسلیم کر لیں۔''

اللہ تعالیٰ نے جو احکام اپنی کتاب یا اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ عطا فرمائے ہیں وہ انہی مسائل سے متعلق ہیں کہ اگر ان کو عقل خالص کے حوالے کیا جاتا تو وہ انسان کو گمراہی کی طرف لے جاسکتی تھی اور چونکہ اللہ تعالیٰ ماضی و مستقبل کے تمام حالات سے باخبر ہے اس لیے صرف اسی کے احکام ہر دور میں واجب العمل ہو سکتے ہیں، چنانچہ ارشاد ہے:۔

یبین اللہ لکم ان تضلوا واللہ بکل شیئ علیم۔

(نساء)

''اللہ تمہارے لیے کھول کھول کر یہ باتیں اس لیے بیان کرتا ہے کہ کہیں تم گمراہ نہ ہو جاؤ اور اللہ ہر چیز کو جانتا ہے۔''

یہیں سے ''جدت پسندی'' کے بارے میں ایک اور بات واضح ہو جاتی ہے اور وہ یہ کہ وحی الٰہی اور نظام شریعت کی ضرورت چونکہ اس لیے پڑی ہے کہ نری عقل کے ذریعہ ان معاملات میں ہدایت تک پہنچنا مشکل تھا اس لیے ہدایت کے لیے احکام الٰہی کا جوں کا توں اتباع ضروری ہے اور یہ طرز عمل درست نہیں کہ زمانے کے کسی چلن کو پہلے اپنی عقل سے صحیح اور بہتر قرار دے لیا جائے اور اس کے بعد قرآن وسنت کو اپنے اس عقلی فیصلے پر فٹ کرنے کے لیے ان میں کھینچ تان اور دور دراز کے تاویلات کا طریقہ اختیار کیا جائے کیونکہ یہ طرز عمل احکام الٰہی کا اتباع نہیں کہلا سکتا، یہ اتباع کے بجائے ترمیم و تغیر ہے جس کا کسی انسان کو اختیار نہیں، کیونکہ اس سے احکام الٰہی کا مقصد نزول ہی تلپٹ ہو کر رہ جاتا ہے۔

اتباع یہ ہے کہ انسان ہر حال میں احکام الٰہی کو کامل اور مکمل یقین کر کے ترمیم کے بغیر انہیں قبول کرلے اور اگر روئے زمین کے تمام لوگ مل کر بھی چاہیں تو اسے احکام الٰہی سے اعراض پر آمادہ نہ کر سکیں۔ ارشاد ہے:

وتمت کلمت ربک صدقاً وعدلاً لامبدل

لکلمته وهو السمیع العلیم وان تطع اکثر من فی الارض یضلوک عن سبیل اللہ ان یتبعون الا الظن وان ھم الا یخرصون ان ربک ھو اعلم من یضل عن سبیلہ وھو اعلم بالمھتدین

(انعام:۱۱۵تا۱۱۷)

''اور آپ کے رب کا کلام سچائی اور انصاف کے لحاظ سے مکمل ہے، کوئی اس کے کلام کو بدلنے والا نہیں اور وہ خوب سننے والا جاننے والا ہے اور اگر آپ دنیا کے اکثر لوگوں کا کہا ماننے لگیں تو وہ آپ کو اللہ کے راستہ سے بھٹکا دیں گے، وہ تو محض گمان کا اتباع کرتے ہیں اور بالکل انکل پچیوں کی باتیں کرتے ہیں، بلاشبہ آپ کا رب ہی خوب جانتا ہے، ان کو بھی جو اس کی راہ سے بھٹکے ہوئے ہیں اور وہ خوب جانتا ہے ان کو بھی جو ہدایت یافتہ ہیں۔''

اور دوسری جگہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

قال الذین لایرجون لِقَآءَنَا ائت بقران غیر ھذا او بدلہ قل مایکون لی ان ابدلہ من تلقآء نفسی ان اتبع الا مایوحی الی۔ (یونس:۱۵)

''جو لوگ ہم سے ملاقات (یعنی آخرت) کا یقین نہیں رکھتے وہ کہتے ہیں کہ اس قرآن کے سوا کوئی اور قرآن لے آؤ یا اسی کو کچھ بدل دو، آپ کہہ دیجیے کہ مجھے یہ حق نہیں کہ میں اس کو بدلوں میں تو صرف اس وحی کا اتباع کرتا ہوں جو مجھ پر نازل کی جاتی ہے۔''

اس قسم کے اتباع میں بعض اوقات زمانے کی مخالفت بھی مول لینی پڑتی ہے اور اس کی وجہ سے مشکلات بھی پیش آسکتی ہیں۔ لیکن جو لوگ ان آزمائشوں کا مقابلہ کرتے ہیں انہیں اللہ کی طرف سے دنیا اور آخرت دونوں میں ہدایت نصیب ہوتی ہے۔ ارشاد ہے:

والذین جاھدوا فینا لنھدینھم سبلنا وان اللہ لمع

المحسنین۔ (العنکبوت:۶۹)

''اور جو لوگ ہماری راہ میں مشقتیں برداشت کرتے ہیں ہم ان کو اپنے راستوں کی ہدایت کریں گے اور بلاشبہ اللہ نیکو کاروں کے ساتھ ہے۔''

یہ طرزِ عمل درست نہیں کہ اگر کسی حکم الٰہی میں کوئی ظاہری فائدہ نظر آئے تو اسے قبول کر لیا جائے اور جہاں کچھ مشکلات اور آزمائشیں ہوں وہاں اعراض یا تاویل سازی کا طریقہ اختیار کیا جائے۔ اس طرزِ عمل میں قرآن کریم کے ارشاد کے مطابق دنیا ور آخرت دونوں کا خسارہ ہے:

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّعْبُدُ اللّٰهَ عَلٰى حَرْفٍ فَاِنْ اَصَابَهٗ خَيْرُ ِاطْمَاَنَّ بِهٖ وَاِنْ اَصَابَتْهُ فِتْنَةُ ِانْقَلَبَ عَلٰى وَجْهِهٖ خَسِرَ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ذٰلِكَ هُوَ الْخُسْرَانُ الْمُبِيْنُ ٥

(حج:۱۱)

''اور بعض لوگ وہ ہیں جو اللہ کی بندگی کنارے پر کھڑے ہو کر کرتے ہیں، پس اگر ان کو کوئی دنیوی نفع پہنچ گیا تو اس کی وجہ سے مطمئن ہو جاتے ہیں اور اگر کوئی آزمائش آ گئی تو منہ پھیر کر چل دیتے ہیں۔ ایسے لوگ دنیا اور آخرت دونوں کا خسارہ اٹھاتے ہیں ۔ یہی تو کھلا ہوا نقصان ہے۔''

غرض اسلامی نقطہ نظر سے اچھی اور بری جدتوں کو پرکھنے کا معیار یہ ہے کہ اللہ کی شریعت نے اس کے بارے میں کیا حکم فرمایا ہے؟ اگر وہ شریعت کے احکام کے مطابق ہے تو اسے قبول کیا جائے اور اگر شریعت کے احکام کے خلاف ہے تو شریعت میں تاویل وتحریف کا طریقہ اختیار کرنے کے بجائے اسے چھوڑ دیا جائے۔ خواہ وہ زمانے کے عام چلن کے خلاف ہو اور خواہ اس طرزِ عمل پر دوسرے لوگ کتنی ملامت اور کتنا استہزاء کرتے ہوں۔

ایک مسلمان کے پاس ان اوچھے اعتراضات کا جواب صرف یہ ہے کہ:

اللہ یستھزی بھم ویمدھم فی طغیانھم یعمھون ٥

''اللہ ان کا استہزاء کرتا ہے اور انہیں ان کی سرکشی میں ڈھیل دے دیتا ہے جس میں وہ سرگرداں پھرتے ہیں۔''

ہاں یہ طرز عمل زندگی کے ان معاملات کے لیے ہے جنہیں قرآن وسنت نے فرض، واجب مسنون مستحب یا حرام اور مکروہ قرار دیا ہے۔ چنانچہ احکام ہر دور میں ناقابل تغیر ہیں، البتہ جو چیزیں مباحات کے ذیل میں آتی ہیں ان میں انسان کو اختیار دیا گیا ہے کہ وہ وقت اور زمانے کی مصلحتوں کے لحاظ سے انہیں اختیار یا ترک کرنے کا فیصلہ کر سکتا ہے اور دیکھا جائے تو زندگی کے ایسے مسائل تعداد میں بہت کم ہیں جن کے بارے میں شریعت نے فرض وواجب، مسنون ومستحب یا حرام ومکروہ ہونے کی صراحت کی ہے اور جو ناقابل تغیر ہیں۔

اس کے برعکس زندگی کی بیشتر چیزیں ''مباحات'' میں داخل ہیں اور ان کے ترک و اختیار کے فیصلے ہر وقت بدلے جا سکتے ہیں۔

لہٰذا اسلام نے ''جدت پسندی'' کو جو میدان عطا کیا ہے وہ ایک وسیع میدان ہے جس میں وہ اپنی پوری جولانیاں دکھا سکتی ہے اور اس میں اپنی عقل سے کام لے کر علم و انکشاف اور سائنس اور ٹیکنالوجی کے بام عروج تک بھی پہنچ سکتا ہے اور ان معلومات کو انسانیت کے لیے زیادہ سے زیادہ مفید بھی بنا سکتا ہے۔

لہٰذا اس وقت عالم اسلام کا سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ وہ ''جدت پسندی'' کی ان حدود کو پہچانے اور اسلام نے ''جدت پسندی'' کا جو وسیع دائرہ انسان کو دیا ہے، اسے چھوڑ کر اس مختصر دائرے میں دخل اندازی نہ کرے جس کے احکام شریعت نے خود مقرر کر دیے ہیں اور ناقابل تغیر ہیں۔

اس کے برعکس عالم اسلام کا موجودہ طرز عمل یہ ہے کہ جس دائرے میں اسے جدید طرز فکر اختیار کرنا تھا، وہاں تو اس کی تگ ودو انتہائی سست اور محدود ہے۔

اس کے برعکس جو احکام الٰہی ناقابل تغیر تھے، مسلمانوں نے اپنی جدت پسندی کا رخ ان کی طرف کر رکھا ہے اور اسی کا نتیجہ ہے کہ عصر حاضر نے جو اچھائیاں انسانیت کو دی ہیں ان سے تو ہم محروم ہیں اور جو برائیاں اس نے پیدا کی ہیں وہ سب تیز رفتاری سے ہمارے معاشرے میں سرائیت کر رہی ہے۔

اللہ تعالیٰ ہمیں توفیق عطا فرمائے کہ ہم عصر حاضر میں اپنی ذمہ داریوں سے سلامت فکر کے ساتھ عہدہ برآ ہو سکیں۔

واخر دعوانا ان الحمد لله رب العالمین

محمد تقی عثمانی

۲۱؍ربیع الثانی ۱۳۹۶ھ

مضمون: ۲۵

علماء کے لیے لمحۂ فکریہ!

یوں تو ہر زمانے کے لوگ ہمیشہ اپنے حال کو ماضی سے بدتر قرار دیتے آئے ہیں اور ایسا بہت کم ہوا ہے کہ لوگوں نے اپنے زمانے کو دینی اور اخلاقی معیار کے لحاظ سے ماضی سے بہتر قرار دیا ہو۔ بحیثیت مجموعی یہ ایک حقیقت بھی ہے کہ عہد رسالت صلی اللہ علیہ وسلم اور عہد صحابہ رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کے بعد ہر آنے والا دور پہلے کے مقابلہ میں کچھ پستیاں ہی لے کر آیا ہے۔ لیکن جس دور میں ہم گذر رہے ہیں، اس میں دینی اور اخلاقی زوال کی رفتار اتنی تیز اور ماضی سے ان کے فاصلے اتنے زیادہ ہیں کہ شاید تاریخ میں پہلے کبھی ایسا نہ ہوا ہو۔

حدیث میں ہے کہ قیامت سے پہلے ایک زمانہ ایسا آئے گا کہ اس کے سال مہینوں اور مہینے ہفتوں کی رفتار سے گزریں گے۔ آج ہماری نگاہیں اس نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشین گوئی کو حرف بہ حرف پورا ہوتے دیکھ رہی ہیں۔ ایسا معاشرہ زوال کی طرف اس تیزی سے جارہا ہے کہ سالوں کی مسافت مہینوں اور ہفتوں میں طے ہوجاتی ہے، جس انقلاب کے لیے پہلے صدیاں درکار تھیں اب وہ دیکھتے ہی دیکھتے رونما ہوجاتا ہے اور آج کے ماحول کا صرف دس پندرہ سال پہلے کے حالات سے موازنہ کیجیے تو زندگی کے ہر شعبہ میں کایا ہی پلٹی نظر آتی ہے۔

یہ تیز رفتار دینی و اخلاقی زوال سالہا سال سے ہمارے مقالوں، تقریروں، مذاکروں اور نشستوں کا موضوع بنا ہوا ہے۔ بے شمار جماعتیں، انجمنیں اور تنظیمیں اس پر بند باندھنے کا مقصد لے کر اٹھ رہی ہیں۔ لیکن ان ساری کاوشوں کے باوجود نہ صرف یہ کہ زوال میں کمی نہیں آئی بلکہ اس کی رفتار ہر لحظہ بڑھ رہی ہے۔ کسی بھی دیندار گھرانے کے باپ اور بیٹوں کے حالات کا موازنہ کر کے دیکھئے، اندازہ ہوجائے گا کہ صرف ایک

نسل کے فرق سے زندگی میں عظیم انقلاب پیدا ہو چکا ہے۔

کرنے کو اس صورت حال کے بہت سے اسباب بیان کیے جا سکتے ہیں اور کیے جاتے رہے ہیں۔ لیکن نظر میں اس کا سیدھا سادھا سبب یہ ہے کہ دین کی دعوت یا مفقود ہو چکی ہے یا غلط طریقہ کار کی وجہ سے بے اثر ہے۔ پچھلے کچھ سالوں میں اپنے نظام تعلیم کو اسلامی بنیادوں پر استوار کرنے کی کوئی سنجیدہ کوشش ہمارے یہاں نہیں ہوئی۔ جو نئی نسل کو اسلام سے نظری اور عملی طور پر قریب کر سکتی، اس لیے اس نسل کو اسلام سے روشناس کرانے کا مقصد صرف ایک دعوت و تبلیغ کے موثر نظام ہی کے ذریعہ حاصل کیا جا سکتا ہے، لیکن افسوس یہ ہے کہ ہم نے اس اہم فیصلے کی طرف بھی کوئی توجہ نہیں دی اور اس سمت میں جو تھوڑا بہت کام ہوا وہ محدود، مختصر اور ناکافی تھا، دعوت حق کے ضمن میں زبردست خلا نے باطل کے محرکات کے لیے راستہ پوری طرح ہموار کر دیا اور نئی نسل اسلام سے بالکلیہ بے بہرہ ہو کر رہ گئی۔

اس دوران کئی ادارے اور کئی جماعتیں دعوت و تبلیغ ہی کے مقصد سے سرگرم عمل ہوئیں اور ان میں سے بعض نے بلاشبہ اپنے اپنے حلقوں میں گرانقدر خدمات انجام دیں، لیکن اب وہ بھی روبہ زوال معلوم ہوتی ہیں اور ان کا حلقہ اثر روز بروز سکڑتا دکھائی دیتا ہے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ عام قومی زوال کا اثر خود ہمارے علماء دینی درس گاہوں، تبلیغی جماعتوں اور تعلیمی اداروں تک جا پہنچا ہے۔ اب تک دعوت و تبلیغ کا جتنا کام بھی ہوا وہ کچھ ایسی دلکش شخصیتوں کی وجہ سے ہوا جو عمومی اعتبار سے ہمارا بہترین سرمایہ تھیں، لیکن اب یہ شخصیتیں اٹھتی جا رہی ہیں اور ہر اٹھنے والا اپنے پیچھے اتنا زبردست خلا چھوڑ جاتا ہے کہ اس کے پر ہونے کا دور دور امکان نظر نہیں آتا۔ افراد کی تیاری بند ہو چکی ہے۔ درسگاہیں بانجھ ہوتی جا رہی ہیں اور دعوت دینے کا صحیح جذبہ اور سلیقہ رکھنے والے مفقود ہو رہے ہیں۔

ان حالات میں نئی تبلیغی جماعتیں بنانے سے ہماری اصل ضرورت یہ ہے کہ دعوت دین کے موجودہ مراکز اپنے اپنے حالات کا حقیقت پسندانہ جائزہ لے کر ان اسباب کا کھوج لگائیں جن کی وجہ سے ان کا کام محدود سے محدود تر ہوتا جا رہا ہے۔ ہماری نظر میں

یہ وقت نئی جماعتیں بنانے کا نہیں، اس لیے کہ بحالت موجودہ ہر نئی جماعت کا قیام افتراق کا ایک نیا دروازہ کھول دیتا ہے۔ اس کے بجائے اس وقت جتنے دینی مدارس، جتنی موثر شخصیتیں اور جتنی تبلیغی جماعتیں دین کی کوئی خدمت انجام دے رہی ہیں، ان میں سے ہر ایک کو یہ سوچنا چاہیے کہ اس کا کام اس ہمہ گیر زوال سے کس حد تک متاثر ہوا ہے اور اسے کس طرح مزید مؤثر اور زیادہ تیز رفتار بنایا جا سکتا ہے؟

ہمارا تعلق چونکہ دینی درسگاہوں سے ہے اس لیے ہم آج اس تغیر کی نشاندہی کرنا چاہتے ہیں جو ان درسگاہوں کے نظام میں واقع ہوا ہے اور جس کی وجہ سے علم و دین کے میدان میں موثر شخصیتوں کی تیاری تقریباً بند ہوگئی ہے۔

علوم دینی کی تدریس درحقیقت دعوت دین کا ایک اہم شعبہ ہے اور اسی کے ذریعہ ایسی شخصیات ابھر سکتی ہیں جنہیں صحیح معنی میں دین کا داعی کہا جا سکے۔ اس لیے ایک مدت تک علماء کا یہ خیال رہا ہے کہ تعلیم دین پر اجرت کا لین دین جائز نہیں، لیکن جب متاخرین نے یہ دیکھا کہ دین کی تدریس و تعلیم ایسا کام ہے کہ اسے خاطر خواہ طریقے سے انجام دینے کے لیے پورا وقت وقف کرنا ضروری ہے اس لیے جب تک ایسے طبقے کا معاش بھی اسی تعلیم و تدریس کے ساتھ وابستہ نہ کیا جائے گا، اسلامی علوم کی کما حقہ حفاظت ممکن نہیں تو آخر زمانے کے علماء نے یہ فتویٰ دے دیا کہ جو شخص اپنے تمام اوقات اس کام میں صرف کرتا ہو اور اسے اس کی وجہ سے دوسرے مسائل معاش سے استفادہ کا موقع نہ ملتا ہو وہ اپنے اوقات کا معاوضہ لے سکتا ہے۔

اس کے نتیجے میں منظم دینی درسگاہیں وجود میں آئیں اور ملت کے ایک بڑے طبقے نے تحصیل معاش کی طرف سے بے فکر ہو کر اپنی ساری توانائیاں اس کام میں صرف کردیں۔ لیکن یہ بات اس راہ کا ہر مسافر جانتا تھا کہ اس راستے میں معاش ایک ضرورت ہے، مقصد نہیں۔ اس کا اصل مقصد دین کی خدمت، افراد کی تعلیم و تربیت اور اسلامی تعلیمات کی نشر و اشاعت ہی تھی۔ فکر و عمل کی ساری توانائیاں اسی کے لیے وقف تھیں، دل میں اسی مقصد کی لگن اور اسی کا جذبہ جاری و ساری تھا اور دنیا کی کوئی مزید لالچ اسے اپنے اصل مقصد سے دور نہیں کر سکتی تھی۔

جن لوگوں نے اس طرح دینی مدارس قائم کیے یا ان میں تدریس کی خدمات انجام

دیں ان کے نزدیک تنخواہ، معاشی ترقی اور دینوی منافع کے مسائل بالکل ثانوی حیثیت رکھتے تھے، ان کی اصل وجہ اس طرف تھی کہ وہ سراپا تبلیغ و دعوت بن کر اپنے ہر قول و فعل سے اپنے زیر تربیت افراد کو مثالی مسلمان بنائیں۔ انہیں علم صحیح کی دولت سے مالا مال کریں، ان کے اعمال و اخلاق سنواریں، ان میں ایک داعی دین کی روح پھونکیں اور ان کے سینوں میں اللہ کے لیے جینے اور مرنے کا جذبہ بے تاب کوٹ کوٹ کر بھر دیں۔

یہ درسگاہیں درحقیقت صرف کتابی تعلیم گاہیں نہیں تھیں بلکہ عملی اور اخلاقی تربیت کی خانقاہیں بھی تھیں۔ دارالعلوم دیوبند کو اللہ نے جو غیر معمولی امتیاز بخشا اس کی اصل وجہ یہی ہے کہ وہ ایک رسمی درسگاہ نہیں تھی جس میں طلباء کو پڑھایا جاتا ہو۔ اس کے بجائے وہ ایک ایسی تربیت گاہ تھی جس میں مسلمان داعی تیار کیے جاتے تھے۔ عملے کا ہر فرد اسی مقصد کی لگن سے سرشار تھا اور اسی لگن نے ایسی شخصیتیں پیدا کر دیں جنہوں نے برصغیر کی تاریخ کا رخ موڑ کر رکھ دیا۔

لیکن رفتہ رفتہ ان درسگاہوں سے اصل مقصد کی وہ لگن کم ہوتی چلی گئی۔ ترجیحات کی ترتیب الٹ گئی اور جذبہ کمزور پڑ گیا۔ استاد اور شاگرد کے درمیان ایک خشک، کھردرا اور رسمی تعلق باقی رہ گیا۔ اعمال و اخلاق کی ترتیب کی فہرست سے خارج ہو گئی، یہاں تک کہ تعلیم و تعلم محض ایک رسم بن کر رہ گیا۔ جس کے اصل مقاصد سے استاد اور شاگرد دونوں غافل ہیں۔

چند گرانقدر مستثنیات کو چھوڑ کر اس وقت ہماری کیفیت یہ ہے کہ دین کی تعلیم و تدریس ہمارے نزدیک دوسرے پیشوں کی طرح ایک پیشہ بن چکی ہے جس کا اصل مقصد حصول معاش ہے اور ثانوی مقصد خدمت خلق ہے۔ ایک معین وقت میں درسگاہ پہنچتا ہے اور گھنٹے بھر کی ڈیوٹی ادا کر کے چلا آتا ہے۔ طلباء کس حال میں ہیں ان کی قابلیت کیوں کمزور ہو رہی ہے؟ ان کے اخلاق کیوں خراب ہو رہے ہیں؟ ان کی اصلاح کی کیا صورت ہے؟ یہ ایسے سوالات ہیں جن پر سوچنا استاد کے فرائض سے غافل ہو چکا ہے۔

جب استاد کو طلبہ کی تعلیمی استعداد ہی کی کوئی فکر نہیں ہے تو وہ ان کے اعمال و اخلاق کی طرف توجہ کیوں دے گا؟ رہا انہیں دعوت دین کی تربیت دینا اور ان میں دین کے

لیے قربانی کا جذبہ ابھارنا، سو یہ تو بہت دور کی چیز ہے۔اس پہلو پر تو سوچنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

ان حالات میں جو لوگ ہمارے ہاتھوں قوم کے رہنما بننے کے لیے تیار ہوں گے، اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ ان میں دینی راہنمائی کی کتنی صلاحیت ہوگی؟ وہ کیسی دعوت اور کیسی تبلیغ کرسکیں گے؟ اوران کی دعوت و تبلیغ کس حد تک موثر ہوسکے گی؟

اسلام کبھی رسمی جماعتوں اور انجمنوں سے نہیں پھیلا، وہ زیادہ تر افراد کے کردار و عمل سے پھیلا ہے۔اگر ہمارے یہاں افراد تیار نہیں ہورہے، اگر ہماری درسگاہیں بانجھ ہورہی ہیں اوران میں شخصیتوں کی تعمیر کا کام بند ہو چکا ہے تو آپ ہزار جماعتیں بنالیجیے. لاکھ کتابیں لکھ ڈالیے، آپ کی دعوت و تبلیغ کبھی موثر نہیں ہوسکتی۔اس لیے اس وقت کی سب سے اہم ضرورت یہ ہے کہ ہم اپنے تعلیم و تربیت کے نظام پر نظر ثانی کر کے اس کے جسم مردہ میں نئی روح پھونکنے کی کوشش کریں۔

آج کل دینی مدارس کے نصاب میں ترمیم کی صدائیں بلند ہوتی رہتی ہیں اور کوئی شک نہیں کہ بحالت دور نصاب بھی ضروری ترمیم و اضاف کا متقاضی ہو چکا ہے۔لیکن ہماری نظر میں اس سے کہیں زیادہ ضرورت اس بات کی ہے کہ دینی مدارس کے ماحول میں اس جذبے کے دوبارہ پیدا کیا جائے جس کے تحت یہ درسگاہیں قائم ہوئی تھیں اور جو اب مرور ایام سے سرد پڑ چکا ہے۔ بنیادی ضرورت اس کی ہے کہ ہم میں اپنے مقصد زندگی پر مر مٹنے والی لگن پیدا ہو، ہم تعلیم و تدریس کے فرائض پیشے کے طور پر نہیں، زندگی کے عزیز ترین مشن کے طور پر انجام دیں اور اپنے فکر و عمل کی تمام طاقتیں اس کام میں صرف کریں کہ زیر تعلیم و تربیت افرد صحیح اور سچا مسلمان، عالم دین اور داعی و مبلغ بن سکیں، اگر یہ نہیں ہوتا تو بہتر سے بہتر نصاب بھی حالات میں خوشگوار تبدیلی نہیں لاسکتا۔حقیقت یہ ہے کہ جو جماعت اپنے آپ کو علم دین کے لیے وقف کرے، ان کا نہ صرف پڑھنا پڑھانا یا سمجھنا سمجھانا جائز ہی نہیں بلکہ قرآنی ارشاد کے مطابق اس کی پوری زندگی کے صرف یہی مقصد ہیں یہی ان درسگاہوں کا مکمل نصاب ہے جس کو قرآن کریم نے دو لفظوں میں بیان فرمایا۔

لیتفقھوا فی الدین ولینذروا قومھم

جس کا حاصل دو چیزیں ہیں۔اول دین کی سمجھ بوجھ پیدا کرنا جس میں صرف کتابوں کا سمجھ لینا کافی نہیں، بلکہ اس کے مقتضیٰ پر عمل اور اپنے اعمال واخلاق میں دینی رنگ بھرنا بھی شامل ہے۔

حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ نے **تفقہ فی الدین** کی یہی تفسیر بیان فرمائی ہے۔دوسرے قوم کو مشفقانہ انداز میں دعوت تبلیغ کے ذریعہ ان کو علم صحیح اور عمل مستقیم کی ہدایت دینا اور اس کے اعمال واخلاق کی اصلاح کرنا۔

مگر افسوس ہے کہ عرصہ دراز سے ہماری درسگاہیں ان قرآنی مقاصد کو بھلا بیٹھی ہیں۔اسی کا نتیجہ ہے جو کچھ ہم دیکھ رہے ہیں۔

درسگاہوں کی فضا میں یہ تجدیدی انقلاب لانے کے لیے طریق کار کیا ہو؟ ہمارا یہ منصب نہیں ہے کہ اس سلسلے میں لگی بندھی تجاویز پیش کرسکیں۔ یہ کام اکابر ملت اور ارباب فکر کا ہے۔ہاں اتنا ہم ضرور سمجھتے ہیں کہ اس کام کے لیے اصل چیز لگے بندھے ضابطوں سے زیادہ مدارس کے ذمہ داروں کی توجہ اور لگن ہے۔اگر دینی درسگاہوں کے ارباب بست وکشاد اپنے اپنے حالات کا جائزہ لیں اور اندازہ لگائیں کہ ہم اپنے اصل مقاصد سے کتنی دور نکل آئے ہیں تو مقصد کی طرف لوٹنے کا جذبہ طریق کار خود بخود سکھائے گا۔

ان گذارشات سے ہمارا منشا صرف اتنا ہے کہ ہمیں بلا تاخیر اس صورت حال پر سنجیدگی کے ساتھ سوچنا چاہے۔اللہ کے فضل وکرم سے ابھی تک ہم میں کچھ ایسی برگزیدہ ہستیاں موجود ہیں جنہوں نے دین کے لیے اخلاص وایثار کے ماحول میں آنکھ کھولی اور جن کی پاکیزہ زندگیاں مجسم تبلیغ ودعوت ثابت ہوئیں اور ہم سمجھتے ہیں کہ انہی کے جذب دروں نے ابھی تک بہت سے طوفانوں کو روک رکھا ہے،ضرورت اس بات کی ہے کہ ان ہستیوں کی موجودگی میں اس موضوع پر پوری اہمیت کے ساتھ غور کیا جائے اور ان حضرات کی راہنمائی سے فائدہ اٹھا کر اپنے تعلیم وتربیت کے نظام کو صحیح خطوط پر رواں کردیا جائے جو آنے والے خطرات کا سدباب کرسکیں۔

اس غرض کے لیے ہم ایک ایسا مختصر سا سوالنامہ اکابر ملت اور ارباب فکر کی خدمت میں بھیج رہے ہیں تاکہ وہ اس معاملے میں ملت کی رہنمائی فرماسکیں۔سوالات یہ ہیں:۔

۱۔ یہ ایک عام تاثر ہے کہ ہماری موجودہ دینی درسگاہوں سے موثر علمی و دینی شخصیتوں کی آمد بند ہو رہی ہے۔ جناب کی نظر میں اس کے کیا اسباب ہیں؟

۲۔ موجودہ دینی مدارس کو دوبارہ مردم خیز اور امت کے لیے زیادہ نفع بخش بنانے کے لیے کون سے اقدامات آپ کی نظر میں ضروری ہیں۔

۳۔ محسوس یہ ہوتا ہے کہ ہماری دینی درسگاہوں میں تعلیم وتعلم کا اصل مقصد نگاہوں سے اوجھل ہوتا جا رہا ہے۔ براہ کرم نشاندہی فرمائیں کہ آپ کی نظر میں یہ مقصد کیا ہے؟ اور اہل مدارس میں اس کا ایسا استحضار کیونکر پیدا کیا جا سکتا ہے جو ان کے فکر وعمل پر اثر انداز ہو سکے؟

یہ سوالنامہ ہم اکابر ملت کی خدمت میں بھیج رہے ہیں، ان کے جو جوابات موصول ہوں گے انشاء اللہ انہیں البلاغ میں شائع کیا جائے گا، اس کے علاوہ دوسرے قارئین سے بھی درخواست ہے کہ وہ ان سوالات پر غور فرمائیں اور اگر کوئی مفید بات ذہن میں آئے تو اسے تحریر کر کے ہم تک پہنچا دیں۔ البلاغ ایسی تمام تجاویز کا خیر مقدم کرے گا۔ خدا کرے کہ اس طرح ہم کسی مفید نتیجے تک پہنچ سکیں۔

بات ہم نے شروع کر دی ہے، اسے آگے بڑھائیے، اسے اپنی سوچ بچار، گفتگو اور تبادلہ خیال کا موضوع بنائیے، یہاں تک کہ یہ زندگی کی اولین تڑپ کی صورت اختیار کر لے۔

وما علینا الا البلاغ

محمد تقی عثمانی

۱۲ر جمادی الثانیہ ۱۳۹۱ھ

مضمون:۲۶

مایوسی کیوں؟

یہ جھوٹا پروپیگنڈہ تو عرصہ سے کیا ہی جارہا ہے کہ اسلام اس دور میں اجتماعی سطح پر روبہ عمل نہیں آسکتا، لیکن اب یہ خیال بھی لوگوں کے دل میں پیدا ہونے لگا ہے کہ انفرادی زندگی میں بھی دین پر عمل کرنا بہت مشکل ہوگیا ہے اور موجودہ ماحول میں دین پر قائم رہنا جوئے شیر لانے سے کم نہیں۔ لیکن ہمارے نزدیک یہ خیال بھی ایک شدید دھوکے سے کم نہیں ہے۔ اس میں شک نہیں ہے کہ ہم ایک ایسے زمانہ میں پیدا ہوئے ہیں جس میں چاروں طرف سے ہم پر فتنوں کی بارشیں برس رہی ہیں، سیاست، معیشت سے لے کر انفرادی زندگی اور گھریلو ماحول تک ہر جگہ فساد برپا ہے، مسلمان جہاں کہیں آباد ہیں، یا غیروں کے جوروستم کا شکار ہیں یا آپس کی پھوٹ میں مبتلا ہیں، باطل کی قوتیں ہر جگہ انہیں للکار رہی ہیں اور وہ ان کے خوف ورعب سے دبتے اور پستے چلے جا رہے ہیں، اسلام...... جوان تمام مصائب کا واحد علاج تھا...... عملی زندگی سے خارج ہو چکا ہے، دلوں میں یہ خیال جاگزیں ہو چکا ہے کہ اگر کوئی شخص اسلامی احکام پر ٹھیک ٹھیک عمل کرنا بھی چاہے تو گردوپیش کا فساد اس کے لیے ہر قدم پر رکاوٹ بنے گا بازار رشوت، سود، قمار اور سٹہ سے بھرے ہوئے ہیں، جھوٹ اور دھوکہ بازی کوئی عیب نہیں رہی، عریانی اور فحاشی کا یہ عالم ہے کہ نگاہوں کو جائے پناہ اور تصور کو راہ فرار نہیں ملتی، قتل و غارت گری کا بازار گرم ہے اور بات بات پر دوسرے کی جان لینا روزمرہ کا معمول ہو چکا ہے، حلال کمائی کے راستے رفتہ رفتہ کم ہوتے چلے جارہے ہیں اور حرام اور ناجائز آمدنیوں کو شیر مادر سمجھ لیا گیا ہے، اولاد ماں باپ سے باغی ہورہی ہے۔ اگلے وقتوں کے کچھ لوگ دین کے احکام پر پوری طرح عمل پیرا ہونا چاہتے بھی ہیں تو نئی نسل پر قابو پانے کا راستہ سمجھ میں نہیں آتا، قدم قدم پر شروفساد کے محرکات ہیں جو اس جوان خون کو گمراہی اور بے راہ روی پر آمادہ کررہے ہیں، نشرواشاعت کے تمام ذرائع اور تفریح وثقافت کے

نام پر بداخلاقی کے تمام طریقے اس کے دل سے کھرچ کھرچ کر خدا کا خوف اور آخرت کی فکر مٹا رہے ہیں اور اب اللہ رسول کا نام تک اس کے لیے اجنبی ہوتا جا رہا ہے۔ یہی نسل رفتہ رفتہ آگے بڑھ کر ملک وقوم کی باگ ڈور سنبھال رہی ہے، یہ نوجوان نسل آج بھی اپنے ان بزرگوں کو کم از کم بے وقوف ضرور سمجھتی ہے جن کے فکر وعمل کی فہرست میں خدا، رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور آخرت نام کی کوئی چیز ہوا کرتی تھی۔ کل جب ملت کی کشتی کا کھیون ہار اس کے سوا کوئی نہیں ہوگا تو اس وقت یہ کیا کیا گل کھلائے گی؟ آج کا اس کا تصور بھی شاید ہمارے لیے مشکل ہو۔

یہ سب کیا ہو رہا ہے؟ کیوں ہو رہا ہے؟ ایسے حالات میں ہمیں کیا کرنا چاہیے؟ گمراہی کا یہ بڑھتا ہوا سیلاب آخر کیونکر رکے گا؟ اسے کون اور کس طرح روک سکتا ہے؟ یہ سوالات ہیں جنہوں نے آج ہر مسلمان کو پریشان کیا ہوا ہے اور اب یہ پریشانی بھی رفتہ رفتہ مایوسی میں تبدیل ہونے لگی ہے۔

سوال یہ ہے کہ کیا ان حالات کا تقاضا واقعتا یہی ہے کہ ہم اپنے مستقبل سے بالکل مایوس ہو کر بیٹھ جائیں؟ اور سوچ کر ہاتھ پاؤں ہلانا بھی چھوڑ دیں کہ اس دور میں دین پر عمل ممکن نہیں رہا؟ اگر آپ ذرا بھی غور فرمائیں گے تو ان تمام سوالات کا جواب نفی میں ملے گا۔ واقعہ یہ ہے کہ گردو پیش کے حالات خواہ کتنے ہی بد سے بدتر ہو جائیں، ناامیدی کی کوئی وجہ نہیں ہے، جس دین پر ہمارا ایمان ہے، اس میں مایوسی کو صرف کفر کی خاصیت قرار دیا گیا ہے، جو شخص اللہ کے وجود، اس کی قدرت کاملہ اور اس کی ذات وصفات پر ایمان رکھتا ہو، اس کے لیے ممکن ہی نہیں ہے کہ تاریک سے تاریک ماحول اسے بددل یا مایوس کر سکے۔ سوچنے کی بات یہ ہے کہ جس وقت اللہ تعالیٰ نے ہمارے لیے دین اسلام کو پسند کر کے ہمیں زندگی گزارنے کے لیے کچھ مخصوص احکام دیئے تھے، کیا (معاذ اللہ) اس وقت باری تعالیٰ کو یہ علم نہیں تھا کہ ایک زمانہ ایسا آنے والا ہے جس میں ماحول کا بگاڑ ان احکام پر عمل کرنے کے راستے میں رکاوٹ بنے گا؟ ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے لیے جو احکام دیئے ہیں وہ اس علم کے ساتھ ہی دیئے ہیں کہ آئندہ کیا کیا حالات پیش آنے والے ہیں؟ اور ان حالات میں ان احکام کی تعمیل کس طرح اور کیونکر ہو سکے گی؟ اس لیے یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ کسی بھی دور میں ان احکام پر عمل کرنا ممکن نہ

رہے اور اللہ کا پسند کیا ہوا یہ دین (معاذ اللہ) نا قابل عمل ہو کر رہ جائے۔

سرکار دو عالم محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم جہالت اور گمراہی کے جس گھٹا ٹوپ اندھیرے میں مبعوث ہوئے وہ بھی انسان سے پوشیدہ نہیں۔ اس دور میں دین پر عمل پیرا ہونا آج سے ہزار گنا زیادہ مشکل تھا۔ آج اگر ہم نماز روزے کی عبادت ادا کرنا چاہیں تو روئے زمین پر کوئی متنفس ہمیں روکنے والا نہیں ہے، لیکن اس دور میں خدائے واحد کا نام لینا بھی جرم تھا۔ آج ہم اللہ کے حضور سجدہ ریز ہو کر اس کی بندگی کریں تو کسی کی مجال نہیں کہ وہ اس عمل میں رکاوٹ ڈال سکے۔ لیکن اس دور میں اللہ کا محبوب ترین پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے گھر میں بھی سجدۂ توحید بجالاتا تھا تو اس کی پشت پر نجاستوں کے انبار رکھ دیئے جاتے تھے اور محض پتھروں کی خدائی سے انکار کے جرم میں پوری دنیا اس کی جان کی دشمن اور خون کی پیاسی ہو جاتی تھی۔ اس پر وسائل معاش کے دروازے بند کر کے عرصہ زندگی تنگ کر دیا جاتا تھا لیکن سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے جانثار صحابہ رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین نے اس دور میں بھی دین کی ایک ایک بات پر اس طرح عمل کر کے دکھا دیا کہ دنیا ان کا کچھ نہ بگاڑ سکی۔

آج دنیا کے حالات خواہ کتنے ہی خراب کیوں نہ ہو جائیں، اسلام پر عمل کرنے کی مشکلات ان مشکلات کا ہزارواں حصہ بھی نہیں ہیں جو عہد رسالت صلی اللہ علیہ وسلم اور عہد صحابہ رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین میں اس خدائی دین کے پرستاروں کو پیش آئی تھیں، اگر اسلام اس دور میں قابل عمل تھا تو آج قابل عمل کیوں نہیں؟

حقیقت یہ ہے کہ آج ہمارے دلوں میں بددلی اور ناامیدی کے جو شیطانی وسوسے پیدا ہوئے ہیں، ان کی اصل وجہ یہ نہیں ہے کہ واقعتاً آج کی دنیا میں اسلام نا قابل عمل ہو گیا ہے یا آج اس دین کی پیروی تاریخ کے ہر زمانے سے زیادہ مشکل ہو گئی ہے۔ درحقیقت اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ ہم خود صدق دل اور خلوص نیت کے ساتھ اس پر عمل کرنا چاہتے ہی نہیں۔ ماحول کی خرابی اور دنیا کے طول و عرض میں پھیلا ہوا فساد اپنی جگہ، لیکن اسلام نے ایسے حالات کے لیے بھی کچھ خاص ہدایات دی ہیں، ہم ان ہدایات کی طرف متوجہ ہونے کے بجائے خرابی ماحول کا ہوا ذہن میں سوار کر کے بیٹھ گئے ہیں اور اس سے آگے ہاتھ پاؤں ہلانے کے لیے بھی تیار نہیں ہیں۔ حالانکہ اگر ہم عزم و ہمت

کے ساتھ چند قدم آگے جائیں تو منزل تک پہنچنے کا وعدہ خود قرآن نے کیا ہے۔

سڑک کے دونوں جانب اگر درختوں کی قطاریں ہوں تو افق پر راستہ بند نظر آتا ہے، جو شخص اس راستے کو بند سمجھ کر بیٹھا رہے وہ کبھی منزل کا آرام حاصل نہیں کر سکتا۔ منزل اسی کو ملتی ہے جو عزم کی مشعل لے کر چل کھڑا ہو۔ آگے چل کر ہی اسے اندازہ ہوتا ہے کہ درحقیقت یہ راستہ بند نہیں تھا بلکہ نگاہ فریب دے رہی تھی۔

ماحول کی جس خرابی سے آج ہم دوچار ہیں، اس میں اسلام کی سب سے پہلی ہدایت یہ ہے کہ اللہ کے ساتھ اپنے تعلق کو مستحکم کرو، آج ہماری پریشانیوں اور بے چینیوں کی اصل جڑ یہ ہے کہ ہم نفس اور مادہ کے غلام ہو کر رہ گئے ہیں۔ ہماری نگاہ ہر وقت مادی منافع اور نفسانی لذتوں کے سراب پر مرکوز رہتی ہیں اور اللہ کی ذات وصفات پر جو یقین اور اس کی قدرت کاملہ کا جو استحضار ایک مسلمان کی سب سے بڑی دولت تھی اسے ہم کھو چکے ہیں۔

لیکن اس کھوئی ہوئی دولت کو واپس لانے کا بھی آج سے بہتر کوئی موقعہ نہیں ہے۔ اس لیے کہ بیسویں صدی نے مادہ پرستی اور خدا بیزاری کی تباہ کاریاں آج پوری طرح الم نشرح کردی ہیں۔ جو لوگ مادی منافع اور نفسانی لذتوں ہی کو اپنا سب کچھ سمجھتے ہیں، ذرا ان کی اندرونی زندگی میں جھانک کر دیکھئے، وہ راحت وآرام کے سارے وسائل اپنے پاس رکھنے کے باوجود سکون قلب کی دولت سے کتنے محروم ہیں؟ دنیا جہاں کے ساری مادی منافع اور ساری نفسانی لذتوں کے حصول کے باوجود انہیں اطمینان خاطر میسر نہیں، اس لیے کہ انہوں نے اپنے گرد و پیش میں جو دنیا بنائی ہے وہ سکون قلب انہیں دے ہی نہیں سکتی۔ وہ ایک خاص ڈھب کی زندگی جس کی بنیاد ہی خدا بیزاری پر اٹھی ہے اور جسے مادے کے پار کوئی چیز نظر نہیں آتی، وہ چاہے دنیا کے سارے خزانے لا کر قدموں پر ڈھیر کر سکتی ہو، لیکن روح کو قرار بخشنا اس کے بس کی بات نہیں، یہ خدا ناآشنا زندگی کا لازمی خاصہ ہے کہ اس کے شیدائی ایک انجانی سی بے قراری کا شکار رہتے ہیں۔ ان بے چین اور بے قرار لوگوں کا ایک کرب انگیز پہلو یہ بھی ہے کہ انہیں یہ بھی نہیں معلوم ہوتا کہ وہ بے قرار کیوں ہیں؟ وہ ہمہ وقت اپنے دل میں ایک نامعلوم اضطراب اور پراسرار کسک محسوس کرتے ہیں۔ لیکن یہ اضطراب کیوں ہے؟ کس لیے ہے؟ وہ نہیں جانتے!

آج کی دنیا چونکہ اس بے قرار اور سکون نا آشنا زندگی کا اچھی طرح تجربہ کر چکی ہے اس لیے اس کے واسطے اسلام کی دی ہوئی اس روحانی سکون کی زندگی کی طرف لوٹنا زیادہ آسان ہے۔ نفس اور مادہ کے گرداب سے نکلنے کے بعد جب بھی کوئی شخص اللہ سے اپنا رابطہ استوار کرنے کی کوشش کرے گا اسے پہلے ہی قدم پر اندازہ ہو جائے گا کہ اس کی زندگی میں وہ کیا کمی تھی جس نے اس کے لیے آرام و راحت کے سارے وسائل کو بے کیف اور بے اثر بنایا ہوا تھا؟

انسان اس کائنات کا خالق و مالک نہیں، وہ کسی کی مخلوق ہے، اس کا مقصد زندگی ہی یہ ہے کہ کسی کی بندگی کرے، اس لیے اس کی فطرت یہ چاہتی ہے کہ وہ کسی لافانی ہستی کے آگے سرنگوں ہو، اس کی عظمتوں پر اپنے عجز و نیاز کی پونجی نچھاور کرے، مصائب میں اس کے نام کا سہارا لے، اسے مدد کے لیے پکارے اور زندگی کے مشکل ترین لمحات میں اس کی توفیق سے رہنمائی حاصل کرے، آج کی مادہ پرست زندگی اسے خواہ دنیا کی ساری نعمتیں عطا کر سکتی ہو لیکن اس کی فطری خواہش کی تسکین نہیں کر سکتی، انسان کی یہ فطرت بعض اوقات نفسانی خواہشات کے انبار میں دب تو جاتی ہے لیکن مٹتی نہیں اور یہی وہ چھپی ہوئی فطری خواہش ہے جو اسے کیف و نشاط کے سارے وسائل مل جانے کے باوجود آرام نہیں لینے دیتی اور بسا اوقات اس کی زندگی کو اجیرن بنا کر چھوڑتی ہے:

یوں زندگی گذار رہا ہوں ترے بغیر
جیسے کوئی گناہ کیے جا رہا ہوں میں

بات ذرا لمبی ہو گئی، کہنا یہ تھا کہ آج ہماری مشکلات کا سب سے کامیاب اور بنیادی علاج صرف یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہمارا تعلق مضبوط ہو اور یہ ایک ایسا علاج ہے جسے ہر دور میں ہر وقت کسی رکاوٹ کے بغیر اختیار کیا جا سکتا ہے۔ اسلام کی تعلیمات میں ''عبادات'' کا شعبہ اسی مقصد کے لیے رکھا گیا ہے کہ اگر ان پر ٹھیک ٹھیک عمل کر لیا جائے تو عبادات کے یہ طریقے اللہ کے ساتھ انسان کے رشتے کو مضبوط اور مستحکم بناتے ہیں۔ اسلام میں انسان کی کامیاب زندگی کا راز ہی چونکہ یہ ہے کہ اللہ کے ساتھ اس کا تعلق استوار ہو اس لیے عبادتوں کو تمام احکام پر مقدم رکھا گیا ہے اور سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کا تقریباً ایک تہائی حصہ انہی کی تعلیم و تربیت اور تاکید و ترغیب پر مشتمل ہے۔

آج دنیا کے حالات کیسے ہی خراب سہی، لیکن اسلامی احکام کا یہ حصہ ایسا ہے کہ معمولی عزم و ہمت اور ارادہ کے بعد اس پر عمل چنداں دشوار نہیں ہے۔ جہاں ان عبادتوں کی ادائیگی میں فی الواقع کوئی دشواری پیدا ہوتی ہے وہاں اللہ تعالیٰ نے خود ایسی آسانیاں پیدا کردی ہیں جن کے بعد دشواری کے شکوے کا حق باقی نہیں رہتا۔

اگر ہم اللہ کی فرض کی ہوئی ان عبادتوں کو ٹھیک انجام دے لیں تو ان کا لازمی خاصہ یہ ہے کہ وہ اللہ کی قدرت کاملہ پر مکمل ایمان و یقین پیدا کرتی ہیں اور جب کسی کو ایمان ویقین کی یہ دولت حاصل ہو جائے تو پھر اس کے لیے کوئی مشکل مشکل نہیں رہتی، پھر وہ سخت سے سخت حالات میں بھی مایوس نہیں ہوتا، اس لیے کہ یہ حقیقت ہر آن ان کے سامنے رہتی ہے کہ ماحول کی ساری تاریکیاں اللہ کے قبضہ قدرت میں ہیں۔ میں ان کو مٹانے سے عاجز سہی، لیکن وہ قادر مطلق اگر چاہے تو ایک لمحہ میں اس سارے ماحول کو بدل کرر کھ دے۔ اس لیے اگر اسے کوئی مشکل پیش آتی ہے تو وہ تھک کر بیٹھ جانے کے بجائے اس کا مقابلہ کرتا ہے اور اس پر قابو پانے کی کوئی صورت نظر نہ آئے تو اس کے پاس ایک ایسا راستہ ہے جو ایک مومن کے سوا دنیا کے کسی مصیبت زدہ کو میسر نہیں ہے۔ وہ اپنی سی کوشش پوری طرح صرف کرنے کے بعد اللہ ہی کی طرف رجوع کرتا ہے۔ اس کے سامنے اپنی عاجزی کا اظہار کرتا ہے، دعائیں کرتا ہے اور اس یقین کے ساتھ کرتا ہے کہ وہ ضرور قبول ہوں گی اور واقعات و مشاہدات گواہ ہیں کہ مشکلات پر قابو پانے کا اس سے بہتر اور اس سے زیادہ موثر و کامیاب راستہ کوئی دوسرا نہیں۔

کھلی ہوئی بات ہے کہ ہمارا واسطہ (معاذ اللہ) کسی ایسی ظالم و جابر ذات سے نہیں ہے جو مخلوق کی مشکلات سے بے خبر رہ کر محض حکم جاری کرنا جانتی ہو۔ پھر آخر ماحول کی تاریکیوں سے مایوسی پیدا کرنے کا کیا مطلب ہے؟ یہ سارا ماحول ہم سے الگ کوئی چیز نہیں، یہ ہمارے جیسے جیتے جاگتے انسانوں ہی سے عبارت ہے۔ اگر ہم میں سے ہر فرد اپنے اپنے طور پر اپنے حالات بدلنے کا عزم کرلے تو دیکھتے ہی دیکھتے یہ پورا بدل سکتا ہے

نومید ہم مباش کہ رندان بادہ نوش
ناگہ بیک خروش بہ منزل رسیدہ اند

آیئے آخر میں ہم اپنے بزرگوں سے سنی ہوئی ایک بہترین تدبیر کا اعادہ کریں جو حالات کی اصلاح کے لیے تمام دوسری تدبیروں سے زیادہ کارگر ہے۔ فرض کیجیے کہ آپ اپنے ماحول کے ہاتھوں اپنے آپ کو بالکل مجبور پاتے ہیں، عیش پرستی، عافیت کوشی اور تن آسانی نے عزم و ہمت کے ہتھیاروں کو کند کر رکھا ہے اور آپ کسی تدبیر سے اپنے آپ پر قابو نہیں پا سکتے، لیکن ایک کام ایسا ہے جو آپ ہر وقت، ہر جگہ، ہر ماحول میں بلا تکلف انجام دے سکتے ہیں۔ اپ اپنے شب و روز کے چوبیس گھنٹوں میں سے تھوڑا سا وقت، پانچ منٹ، دس منٹ اس کام کے لیے نکالیے اور تنہائی میں بیٹھ کر اللہ تعالیٰ سے صرف یہ دعا کیجیے کہ یا اللہ! میں اپنے ماحول کی ہاتھوں مجبور ہو چکا ہوں، اپنی اصلاح کی ہر تدبیر ناکام ہو چکی ہے، عزم و ہمت ناکارہ ہو چکے ہیں، میں اپنے اندر اتنی طاقت نہیں پاتا کہ تن تنہا ماحول کی ان تاریکیوں کا مقابلہ کر سکوں تو اپنے فضل و کرم سے میری مدد فرما۔ میرے عزم و ہمت کو بیدار فرما، مجھے اپنے دین کے احکام پر عمل پیرا ہونے کی طاقت اور توفیق فرما......!

اگر کوئی شخص روزانہ پابندی کے ساتھ خلوص دل اور صدق نیت سے یہ کام کر لیا کرے تو تجربہ یہ ہے کہ اس عمل سے مشکلات کی ساری گرہیں ایک ایک کر کے کھلتی چلی جاتی ہیں، دل میں نیا عزم، نئی ہمت، نئے ولولے اور نئے حوصلے پیدا ہوتے ہیں اور بالآخر یہ مختصر سا عمل ایک نہایت خوشگوار دینی انقلاب کی تمہید بن جاتا ہے:

طے شود جادۂ صد سالہ بہ آہے گاہے

ہمارا ایمان ایک ایسے دین پر ہے جس میں تمام کامیابیوں کا مدار ایک قادر مطلق ذات ہے جس کی مشیت کے بغیر دنیا کا ایک ذرہ ادھر سے ادھر نہیں ہل سکتا، پھر آخر ہمارے لیے خرابی حالات کو دیکھ دیکھ کر مایوس ہونے کا کیا جواز ہے؟ ہم دور دور سے مشکلات کا شکوہ کرنے کے بجائے اس ذات کی طرف کیوں نہ رجوع کریں جس کے ہاتھ میں ان سارے حالات کی باگ ڈور ہے؟

اللہ تعالیٰ مایوسی سے ہم سب کی حفاظت فرمائے اور فہم سلیم کے ساتھ دین پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین ثم آمین۔ **وما علینا الاالبلاغ.**

پچھلے مہینے ملک کے معروف عالم دین جناب محمد علی جالندھری رحمۃ اللہ علیہ کی

وفات ہوگئی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

مرحوم برصغیر کے مشہور و معروف علماء میں سے تھے اور قادیان کی خانہ ساز نبوت کے خلاف شمشیر برہنہ۔ اپنی آخری عمر میں وہ تحفظ ختم نبوت کے سلسلے میں گرانقدر خدمات انجام دے رہے تھے۔ موصوف کی وفات پر ادارہ البلاغ اپنے گہرے رنج وغم کا اظہار کرتا ہے، قارئین سے بھی درخواست ہے کہ وہ مرحوم کی بلندی درجات کے لیے دعا فرمائیں۔ اللہ تعالیٰ انہیں اپنے جوار رحمت میں جگہ عطا فرمائے اور پسماندگان کو صبر جمیل کی توفیق بخشے۔ آمین۔

محمد تقی عثمانی

۱۴ ربیع الاول ۱۳۹۱ھ

مضمون: ۲۷

کلمہ گو کا صحیح مطلب

مغربی افکار کے تسلط سے جو نظریاتی غلط فہمیاں مسلمانوں میں پھیلی ہیں ان میں سے ایک بڑی دوراثر غلط فہمی یہ ہے کہ جو شخص ایک مرتبہ کلمہ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ پڑھ لے اور اپنے مسلمان ہونے کا اقرار کر لے وہ ہمیشہ کے لیے مسلمان ہو جاتا ہے اور پھر دنیا کا کوئی بدتر سے بدتر عقیدہ بھی اسے کافر نہیں بنا سکتا۔

بظاہر نظریہ ایک معصوم اور بے ضرر قاعدہ معلوم ہوتا ہے۔ لیکن اس کی حقیقت پر غور کیا جائے تو یہ اتنا خطرناک اور سنگین اصول ہے جسے تسلیم کرنے کے بعد اسلام کے بنیادی عقائد کی حفاظت ناممکن ہو جاتی ہے۔ کیونکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی شخص کلمہ طیبہ پڑھنے کے بعد نبوت کا جھوٹا دعویٰ کرے، قرآن کریم کو اللہ کی کتاب ماننے سے انکار کرے، اپنے آپ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی افضل بتائے، عقیدہ آخرت کو افسانہ قرار دے، نماز روزے، حج اور زکوٰۃ جیسے ارکان اسلام سے انکار کرے، سود، شراب، زنا اور قمار کو جائز کہے اور توحید و رسالت کے سوا اسلام کی ہر تعلیم کو جھٹلائے تب بھی وہ مسلمان ہی رہے گا اور کوئی شخص اسے کافر قرار نہیں دے سکتا۔

غور فرمایئے کہ اگر ہر کلمہ گو کو مسلمان قرار دینے کا اصول تسلیم کر لیا جائے تو اس کی زد کہاں کہاں پڑتی ہے اور اس کے ذریعہ کس طرح اسلام کا نام لے کر اسلام کی ایک ایک تعلیم کا مذاق اڑایا جا سکتا ہے؟ درحقیقت یہ اصول دشمنان اسلام نے گھڑا ہی اس لیے تھا کہ اس کی آڑ لے کر اسلام کو موم کی ناک بنا دیا جائے۔ ہر برے سے برے نظریہ کے لیے اس کے چوپٹ کھول دیئے جائیں اور اسے رفتہ رفتہ ایسا مذہب بنا دیا جائے جو ہمیشہ کے لیے کافروں کا دریوزہ گر بن سکے۔ جس میں دشمنان اسلام کی خواہشات کے مطابق ہر باطل سے باطل عقیدے کو پھلنے پھولنے کے مواقع میسر ہوں۔

سوال یہ ہے کہ کلمہ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ (معاذ اللہ) کوئی منتر ہے جسے پڑھ کر

انسان ہر عقیدے اور عمل کے لیے آزاد ہے اور اس کا کوئی نظریہ اسے اسلام سے خارج نہیں کر سکتا؟ کیا کوئی شخص جسے اسلام کے مستحکم اور با اصول دین ہونے کا دعویٰ ہو اسلام کے بارے میں اس بے سروپا بات کو تسلیم کر سکتا ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ کلمہ طیبہ کوئی جادو یا طلسم نہیں ہے بلکہ یہ ایک عہد نامہ ہے جو انسان اپنے پروردگار سے کرتا ہے۔ جب کوئی شخص اللہ تعالیٰ کو معبود واحد ماننے کا اقرار کرتا ہے تو یہ معاہدہ کرتا ہے کہ میں اللہ تعالیٰ کے تمام احکام کو بہ دل و جان تسلیم کروں گا اور اس کے سوا کسی اور کو واجب الاطاعت نہیں سمجھوں گا۔ اسی طرح جب وہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ کا پیغمبر ماننے کا اعلان کرتا ہے تو وہ یہ عہد کرتا ہے کہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی لائی ہوئی تمام تعلیمات پر ایمان رکھوں گا۔ لہٰذا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی جو تعلیمات ہم تک تواتر اور قطعیت کے ساتھ پہنچتی ہیں اس پر ایمان رکھنا کلمہ طیبہ پر ایمان کا لازمی تقاضا ہے اور اگر کوئی شخص زبان سے کلمہ پڑھنے کے بعد اسلام کی قطعی اور اسلام کے کسی ایک جزء میں سے کسی ایک کا انکار بھی کر دے تو در حقیقت وہ کلمہ طیبہ پر ایمان نہیں رکھتا۔ اسی حقیقت کی طرف سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ایک ارشاد میں ارشاد فرمایا ہے:

عن ابی هریره رضی الله عنه عن رسول الله صلی الله علیه وسلم قال امرت ان اقاتل الناس حتی یشهدوا ان لا اله الا الله ویؤمنوا بی وبما جئت به

(صحیح مسلم۔ ص: ۳۷، ج: ۱۔ طبع کراچی)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں لوگوں سے جہاد کرتا رہوں یہاں تک کہ وہ اس بات کی گواہی دیں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور مجھ پر اور جو کچھ میں لے کر آیا ہوں اس سب پر ایمان لائیں۔

لہٰذا مسلمان ہونے کے لیے صرف کلمہ طیبہ پڑھ لینا کافی نہیں بلکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی لائی ہوئی ان تمام باتوں پر ایمان رکھنا ضروری ہے جو ہم تک تواتر اور قطعیت کے ساتھ پہنچتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب مسیلمہ کذاب نے نبوت کا دعویٰ کیا تو

خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے اور اس کے متبعین کے ساتھ کافروں کا سا معاملہ کیا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد تمام صحابہ کرام نے اسے متفقہ طور پر کافر قرار دے کر اس کے ساتھ باقاعدہ جہاد کیا، حالانکہ وہ بھی ظاہری اعتبار سے مسلمان تھا، اس کے یہاں باقاعدہ اذان اور نماز ہوتی تھی اور اذان میں **اشهد ان لا اله الا الله** اور **اشهد ان محمدارسول الله** کے کلمات بار بار دہرائے جاتے تھے۔

یہیں سے اس حدیث کی حقیقت بھی واضح ہو جاتی ہے جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ:

من صلى صلواتنا واستقبل قبلتنا واكل ذبيحتنا فذالك المسلم الذى له ذمة الله ورسوله فلا تخفروا الله فى ذمته (صحیح بخاری)

جو شخص ہماری جیسی نماز پڑھے اور ہمارے قبلہ کی طرف رخ کرے اور ہمارا ذبیحہ کھائے تو وہ مسلمان ہے جس کا تحفظ اللہ اور اس کے رسول کی ذمہ داری ہے۔ پس تم اللہ کی اس ذمہ داری کی بے حرمتی نہ کرو۔

جس شخص کو بھی بات سمجھنے کا سلیقہ ہو وہ اس حدیث کے اسلوب و انداز سے سمجھ سکتا ہے کہ یہاں مسلمان کی کوئی انہونی تعریف نہیں کی جا رہی بلکہ مسلمان کی ظاہری علامتیں بیان کی جا رہی ہیں اور مطلب یہ ہے کہ جو شخص ان ظاہری علامتوں کے لحاظ سے مسلمان معلوم ہوتا ہو، اس پر خوامخواہ بدگمانی کر کے اس کے ساتھ کافروں کا سا برتاؤ کرنا درست نہیں لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ جو شخص کھلم کھلا اپنی کفریات کا اعلان کرتا پھرے اسے بھی محض اس لیے کافر نہیں کہا جائے کہ وہ مسلمانوں کا ذبیحہ کھاتا ہے۔

جب کسی منحرف فرقے پر کفر کا فتویٰ لگایا جاتا ہے تو ایک اور شدید مغالطہ پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے اور وہی مغالطہ آج بھی پیدا کیا جا رہا ہے، کہا جاتا ہے کہ مسلمانوں کے مختلف مکاتب فکر کے علماء ہمیشہ ایک دوسرے پر کفر کے فتوے دیتے آئے ہیں۔ لہٰذا اب ان کے فتووں کا کوئی اعتبار نہیں رہا۔

ہم اس افسوسناک حقیقت کا اعتراف کرتے ہیں کہ واقعتاً بعض مسلمانوں کی

طرف سے اس معاملہ میں شدید بے احتیاطیاں ہوئی ہیں اور انہوں نے دوسرے فرقوں کی تردید کے جوش میں ان اصولوں کو مدنظر نہیں رکھا جو فروعی اختلافات کو اپنی حدود میں رکھنے کے لیے ضروری ہیں۔ چنانچہ بعض حلقوں کی طرف سے کفر کے فتووں کا نہایت غلط استعمال ہوا ہے۔ لیکن یہ بات عقل وخرد کی آخر کونسی منطق کی رو سے درست ہو سکتی ہے کہ چند غلط فتووں کی وجہ سے یہ اعلان کر دیا جائے کہ اب دنیا میں کسی شخص کو بھی کافر نہیں کہا جا سکتا اور جس شخص کو پوری امت مسلمہ مل کر کافر قرار دے وہ بھی دائرہ اسلام سے خارج نہیں ہوگا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ مختلف اسلامی مکاتب فکر میں ایک تشدد پسند عنصر نے کفر کے فتووں کو انتہائی بے احتیاطی کے ساتھ استعمال کیا ہے۔ لیکن یہ بھی اپنی جگہ ناقابل انکار حقیقت ہے کہ اس تشدد پسند عنصر کو کبھی اس معاملہ میں اپنے پورے مکتب فکر کی نمائندگی کا مقام حاصل نہیں ہو سکا۔ اس کے بجائے ہر مسلمان مکتب فکر کے محقق اور اعتدال پسند علماء ہمیشہ تکفیر کی اس روش کی سختی کے ساتھ تردید کرتے رہے ہیں انہوں نے اختلافات کی شدید گرم بازاری کے دوران بھی ایمان وکفر کی حدود کو ہر قیمت پر محفوظ رکھا ہے اور کفر کے فتووں کو غصہ نکالنے کا ذریعہ نہیں بننے دیا اور اگر عملی اعتبار سے دیکھا جائے تو یہی اعتدال پسند عنصر ہر مکتب فکر میں غالب حیثیت کا حامل رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب بھی کبھی پوری امت کا کوئی اجتماعی مسئلہ ہو تو تمام مکاتب فکر ہمیشہ سر جوڑ کر بیٹھے اور چند لوگوں کے انفرادی فتوے ان کی بحیثیت مسلمان جمع ہونے میں رکاوٹ نہیں بنے۔

مسلمانوں کی فرقہ بندیوں کا شور تو باقاعدہ منصوبہ بندی کے ساتھ صبح وشام مچتا ہی رہتا ہے۔ لیکن کسی نے یہ سوچنے کی زحمت گوارا نہیں کی کہ اگر یہ مکاتب فکر واقعتاً ایک دوسرے کو کافر وملحد سمجھتے ہیں تو پھر وقتاً فوقتاً امت کے مقاصد کے لیے بحیثیت مسلمان کیوں جمع ہوتے رہتے ہیں؟ کیا انہی مسلمان فرقوں نے جن کے اختلافات ونزاع کے بارے میں آسمان سر پر اٹھا رکھا ہے ۱۹۵۱ء میں پاکستان کی دستوری بنیادیں متفقہ طور پر طے نہیں کیں۔ جبکہ چاروں طرف سے یہ خطرہ تھا کہ یہ اتفاق ایک امر محال ہے؟ کیا یہی ''گردن زدنی'' فرقے نے ۱۹۵۳ء میں اکٹھے ہو کر مفصل دستوری سفارشات مرتب کر کے نہیں اٹھے۔ جبکہ یہ کام پہلے سے زیادہ دشوار سمجھا جا رہا تھا؟ کیا انہی فرقوں نے

۱۹۵۳ء میں مرزائیت کے کھلے کفر کے خلاف مشترکہ موقف اختیار نہیں کیا؟ کیا انہی فرقوں نے ۱۹۶۲ء کے دستور پر ایک ساتھ بیٹھ کر ترمیمات مرتب نہیں کیں۔ کیا انہوں نے عائلی قوانین کی غیر اسلامی دفعات کو تبدیل کرنے کے لیے یکجا ہو کر اپنا متفقہ تبصرہ پیش نہیں کیا؟ کیا انہوں نے پاکستان کی دستور سازی کے دوران شیر وشکر ہو کر اس میں اسلامی دفعات کو موثر بنانے کی کوششیں نہیں کیں؟ سالہا سال سے بے سروپا پروپیگنڈہ جاری تھا کہ یہ لوگ مسلمان کی متفقہ تعریف بھی نہیں کر سکتے۔ لیکن کیا ۱۹۷۲ء کے دستور میں انہوں نے مسلمان کی تعریف پیش کر کے اس پروپیگنڈے کی قلعی نہیں کھولی۔

جو شخص بھی ان حقائق پر انصاف ودیانت کے ساتھ غور کرے گا وہ اس نتیجہ پر پہنچے بغیر نہیں رہ سکتا کہ بعض حلقوں کی طرف سے مسلمان مکاتب فکر کے خلاف کفر کے جو فتوے جاری کیے گئے ہیں وہ کسی بھی مکتب فکر کی نمائندہ حیثیت نہیں بلکہ ان کی حیثیت محض انفرادی ہے ورنہ واقعہ یہ ہے کہ اپنے فروعی اختلافات کے باوجود یہ تمام مکاتب فکر اسلام کے بارے میں متفق اور ایک زبان ہیں۔ لہٰذا چند غلو آمیز فتووں کی وجہ سے پوری امت مسلمہ کے فیصلہ کو ناقابل اعتبار ٹھہرانا صحیح نہیں ہے۔ جیسے کوئی شخص یہ کہنے لگے کہ بعض ڈاکٹروں کے غلط علاج کی بناء پر اب کسی ڈاکٹر کا اعتبار نہیں رہا اور وہ اس مسئلے میں بھی قابل اعتماد نہیں رہے جن پر تمام دنیا کے اطباء متفق ہیں۔

جو لوگ بعض افراد کے تشدد آمیز فتووں کو بنیاد بنا کر امت مسلمہ کے ہر اجتماعی فتوے کو ناقابل اعتبار قرار دیتے ہیں وہ براہ کرم یہ بتائیں کہ دنیا کا کونسا طبقہ ایسا ہے جس کے افراد سے کبھی کوئی غلطی نہیں ہوئی؟ کیا عدالتی فیصلوں میں جج صاحبان سے کبھی غلطیاں نہیں ہوتیں؟ اگر ہوتی ہیں اور سینکڑوں ہوتی ہیں تو کیا کوئی ذی ہوش انسان یہ تجویز پیش کر سکتا ہے کہ عدالتوں پر قفل چڑھا دینے چاہئیں اور اب عدالت کا کوئی فیصلہ قابل تسلیم نہیں رہا؟ کیا ماہر سے ماہر انجینئر مکان کی تعمیر میں غلطیاں نہیں کرتے۔ لیکن کیا اس غلطی کی بناء پر یہ تجویز معقول ہو سکتی ہے کہ اب کسی تعمیر کا ٹھیکہ کسی انجینئر کو نہیں دینا چاہیے۔ کیا قابل سے قابل فوجی افسروں سے دفاعی فیصلوں میں غلطی نہیں ہو جاتی؟ لیکن اس کی بناء پر یہ بات کون کہہ سکتا ہے کہ اب کسی فوجی کو حفاظتی ذمہ داری نہیں سونپی جا سکتی۔ پھر اگر کچھ افراد نے کسی وقت کفر کے غلط فتوے جاری کر دیئے ہیں تو وہ کونسی

معقول وجہ ہے جس کے یہ کہہ دیا جائے کہ جس گروہ کو پوری امت مسلمہ مل کر دائرہ اسلام سے خارج قرار دے رہی ہے اس کے بارے میں کفر کے فتوے ناقابل اعتبار ہیں۔

شاعر مشرق، مصور پاکستان علامہ محمد اقبال مرحوم نے بالکل صحیح بات کہی تھی کہ:

اس مقام پر یہ دہرانے کی غالباً ضرورت نہیں ہے کہ مسلمانوں کے بے شمار فرقوں کے مذہبی تنازعوں کا ان بنیادی مسائل پر کچھ اثر نہیں پڑتا جن مسائل پر سب فرقے متفق ہیں۔ اگر چہ وہ ایک دوسرے پر الحاد کے فتوے ہی دیتے ہوں۔

(حرف اقبال صفحہ ۱۹۔۱۱۳ مرتبہ لطیف احمد شیروانی ایم۔اے۔)

وزیراعظم پاکستان جناب ذوالفقار علی بھٹو نے قادیانی مسئلہ کے فیصلے کے لیے ۷ر ستمبر ۱۹۷۴ء کی تاریخ مقرر کر دی ہے۔ وزیراعظم کا یہ اعلان ہر اعتبار سے خیر مقدم اور تحسین کے لائق ہے اور اس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ حکومت اس مسئلہ کو غیر ضروری تعویق میں ڈالنا نہیں چاہتی۔ اس مسئلہ پر قومی اسمبلی کی خصوصی کمیٹی کے اجلاسات جاری ہیں اور پوری قوم کی نگاہیں اس پر لگی ہوئی ہیں۔ ہم معزز اراکین اسمبلی سے صرف یہ گزارش کرنا چاہتے ہیں کہ قدرت نے ان کے کندھوں پر جو ذمہ داری ڈال دی ہے وہ صرف دنیا ہی کی نہیں بلکہ آخرت کی بھی ایک عظیم ذمہ داری ہے۔ اگر خدانخواستہ انہوں نے اس معاملہ میں کوئی لغزش، غفلت، کمزوری یا دباؤ کو قبول کیا تو ملت اسلامیہ انہیں کبھی معاف نہیں کرے گی۔ اس وقت پوری اسلامی دنیا ان کی طرف دیکھ رہی ہے اور ہمیں امید ہے کہ وہ عالم اسلام کو مایوس نہیں کریں گے۔

وما علینا الا البلاغ

مضمون: ۲۸

مرنے والوں کو برا بھلا مت کہو......

الحمد لله نحمده ونستعينه ونستغفره ونومن به ونتوكل عليه، ونعوذ بالله من شرور انفسنا ومن سيأت اعمالنا من يهده الله فلا مضل له ومن يضلله فلا هادى له، واشهد ان لا اله الا الله وحده لاشريك له، واشهد ان سيدنا ونبينا ومولانا محمداً عبده ورسوله صلى الله تعالىٰ عليه وعلىٰ آله واصحابه وبارك وسلم تسليماً كثيرا. اما بعد

"عن المغيرة بن شعبة رضى الله عنه قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: لاتسبوا الاموات فتوذوا الاحياء" (ترمذی، کتاب البر، باب ماجاء فی الشتم)

مرنے والوں کو برا مت کہو:

حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ روایت فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

"کہ جن لوگوں کا انتقال ہو چکا ہے ان کو برا بھلا مت کہو اس لیے کہ مردوں کو برا بھلا کہنے سے زندہ لوگوں کو تکلیف ہوگی۔"

ایک اور حدیث جو حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

"اذكروا محاسن موتكم وكفوا عن مساويهم"

"اپنے مردوں کی اچھائیاں ذکر کرو اور ان کی برائیاں ذکر کرنے

سے باز رہو۔“ (ابوداؤد، کتاب الادب، باب فی النھی عن سب الموتی)

یہ دو حدیثیں ہیں۔ دونوں کا مضمون تقریباً ایک جیسا ہے کہ جب کسی کا انتقال ہو جائے تو انتقال کے بعد اگر اس کا ذکر کرنا ہے تو اچھائی سے ذکر کرو۔ برائی سے مت کرو۔ چاہے بظاہر اس کے اعمال کتنے ہی خراب رہے ہوں۔ لیکن تم اس کی اچھائی کا ذکر کرو۔ برائی کا ذکر مت کرو۔

مرنے والوں سے معاف کرانا ممکن نہیں:

یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ حکم تو زندوں کے لیے بھی ہے کہ زندوں کا ان کے پیچھے برائی سے تذکرہ کرنا جائز نہیں۔ بلکہ زندوں کا تذکرہ اچھائی سے کرنا چاہیے۔ اگر برائی سے ذکر کریں گے تو غیبت ہو جائے گی اور غیبت حرام ہے۔ پھر ان احادیث میں خاص طور پر مردوں کے بارے میں یہ کیوں فرمایا کہ مردوں کا ذکر برائی سے مت کرو...... اس کا جواب یہ ہے کہ اگرچہ زندہ آدمی کی غیبت بھی حرام ہے لیکن مردہ آدمی کی غیبت ڈبل حرام ہے۔ اس کی حرمت کہیں زیادہ ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ اگر کوئی شخص زندہ آدمی کی غیبت کرے تو امید ہے کہ جب اس سے کسی وقت ملاقات ہوگی تو اس سے معافی مانگ لے گا تو وہ معاف کر دے گا اور اس کی غیبت کرنے کا گناہ ختم ہو جائے گا۔ کیونکہ غیبت حقوق العباد سے ہے اور حقوق العباد کا معاملہ یہ ہے کہ اگر صاحب حق معاف کر دے تو معاف ہو جاتا ہے...... لیکن جس شخص کا انتقال ہو گیا، اس سے معافی مانگنے کا کوئی راستہ نہیں۔ وہ تو اللہ تعالیٰ کے یہاں جا چکا۔ اس وجہ سے وہ گناہ معاف ہو ہی نہیں سکتا۔ اس لیے یہ گناہ ڈبل ہو گیا۔

اللہ کے فیصلے پر اعتراض:

مرنے والوں کی غیبت منع ہونے کی دوسری وجہ یہ ہے کہ اب تو وہ اللہ تعالیٰ کے پاس پہنچ چکا اور تم اس کی جس برائی کا ذکر کر رہے ہو، ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کی اس برائی کی مغفرت کر دی ہو، اس کو معاف کر دیا ہو تو اس صورت میں اللہ تعالیٰ نے تو معاف کر دیا اور تم اس کی برائی لیے بیٹھے ہو۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے فیصلے

پر اعتراض ہو رہا ہے کہ یا اللہ آپ نے تو اس بندے کو معاف کر دیا۔ لیکن میں معاف نہیں کرتا۔ وہ تو بہت برا تھا۔ استغفر اللہ۔ یہ اور بڑا گناہ ہے۔

زندہ اور مردہ میں فرق:

تیسری وجہ یہ ہے کہ زندہ آدمی کی ''غیبت' میں بعض صورتیں ایسی ہوتی ہیں جو جائز ہوتی ہیں۔ مثلاً ایک آدمی کی عادت خراب ہے، اس عادت خراب ہونے کی وجہ سے اندیشہ ہے کہ لوگ اس سے دھوکے میں مبتلا ہو جائیں گے، یا وہ کسی کو تکلیف پہنچائے گا۔ اب اگر اس کے بارے میں کسی کو بتا دینا کہ دیکھو اس سے ہوشیار رہنا اس کی یہ عادت ہے۔ یہ غیبت جائز ہے۔ اس لیے کہ اس کا مقصد دوسروں کو نقصان سے بچانا ہے۔ لیکن جس آدمی کا انتقال ہو گیا ہے، وہ اب کسی دوسرے کو نہ تکلیف پہنچا سکتا ہے اور نہ دوسرے کو دھوکہ دے سکتا ہے اس لیے اس کی غیبت کسی بھی وقت حلال نہیں ہو سکتی۔ اس وجہ سے خاص طور پر فرمایا کہ مرنے والوں کی غیبت مت کرو اور نہ برائی سے ان کا تذکرہ کرو۔

مردہ کی غیبت سے زندہ کو تکلیف:

چوتھی وجہ خود حدیث شریف میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمادی۔ وہ یہ کہ تم نے یہ سوچ کر مردے کی غیبت کی کہ وہ مردہ تو اب اللہ تعالیٰ کے یہاں جا چکا ہے، میری برائی کرنے سے اس کو نہ تو تکلیف پہنچے گی اور نہ ہی اس کو اطلاع ہوگی، لیکن تم نے یہ سوچا کہ آخر اس مردے کے کچھ چاہنے والے بھی تو دنیا میں ہوں گے۔ جب ان کو یہ پتہ چلے گا کہ ہمارے فلاں مرنے والے قریبی عزیز کی برائی بیان کی گئی ہے تو اس کی وجہ سے ان کو تکلیف ہوگی...... فرض کریں کہ آپ نے کسی زندہ آدمی کی غیبت کر لی ہے تو آپ کے لیے یہ آسان ہے کہ جا کر اسی سے معافی مانگ لیں۔ اسے معاف کر دے گا تو بات ختم ہو جائے گی۔ لیکن اگر آپ نے کسی مردہ آدمی کی غیبت کر لی تو اس غیبت سے اس کے جتنے عزیز و اقارب، دوست احباب ہیں، ان سب کو تکلیف ہوگی، اب تم کہاں کہاں جا کر اس کے عزیز و اقارب کو تلاش کرو گے اور یہ تحقیق کرو گے

کہ کس کس کو تکلیف پہنچی اور کس کس سے جا کر معافی مانگو گے۔ اس لیے مردے کی غیبت کرنے کی برائی بہت زیادہ شدید ہے۔ لہٰذا زندہ آدمی کی غیبت تو حرام ہے ہی، لیکن مرنے والے کی غیبت اس کے مقابل میں زیادہ حرام ہے اور اس کی معافی بھی بہت مشکل ہے۔ اس لیے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مردوں کی برائی بیان نہ کرو۔ صرف اچھائی بیان کرو۔

مردہ کی غیبت جائز ہونے کی صورت:

صرف ایک صورت میں مردے کی برائی بیان کرنا جائز ہے وہ یہ کہ کوئی شخص گمراہ کن باتیں کتابوں میں لکھ کر دنیا سے رخصت ہو گیا، اب اس کی کتابیں ہر جگہ پھیل رہی ہیں، ہر آدمی کتابیں پڑھتا ہے، لہذا اس شخص کے بارے میں لوگوں کو یہ بتانا کہ اس شخص نے عقائد کے بارے میں جو باتیں لکھی ہیں وہ غلط ہیں اور گمراہی کی باتیں ہیں تاکہ لوگ اس کی کتابیں پڑھ کر گمراہی میں مبتلا نہ ہوں۔ بس اس حد تک اس کی برائی بیان کرنے کی اجازت ہے۔ اس میں یہ بھی ضروری ہے، اس حد تک اس کے بارے میں لوگوں کو بتایا جائے جس حد تک ضرورت ہو۔ لیکن اس شخص کو برا بھلا کہنا یا اس کے لیے ایسے الفاظ استعمال کرنا جو گالی میں داخل ہو جائیں۔ یہ عمل پھر بھی جائز نہ ہوگا۔

اس لیے کہ اگرچہ وہ اپنی کتابوں میں گمراہی کی باتیں لکھ گیا۔ لیکن کیا معلوم کہ مرتے وقت اس کو اللہ تعالیٰ نے توبہ کی توفیق دے دی ہو اور اس توبہ کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اس کو معاف فرما دیا ہو۔ لہٰذا اس کے لیے برے الفاظ استعمال کرنا مثلاً یہ کہنا کہ وہ تو جہنمی تھا، وغیرہ۔ العیاذ باللہ۔ یہ کسی طرح جائز نہیں۔ اس لیے کہ کسی کے جہنمی ہونے یا نہ ہونے کا فیصلہ صرف ایک ذات کے اختیار میں ہے، وہی فیصلہ کرتا ہے کہ کون جنتی ہے اور کون جہنمی ہے۔ لہٰذا تم اس کے اوپر جہنمی ہونے کا فیصلہ کرنے والے کون ہو؟ اور تم نے اس کے بارے میں یہ کیسے فیصلہ کر لیا کہ وہ مردود تھا۔ اس قسم کے الفاظ اس کے بارے میں استعمال کرنا کسی طرح جائز نہیں۔ البتہ اس نے جو گمراہی پھیلائی ہے اس کی تردید کر دو کہ اس کے یہ عقائد گمراہانہ تھے اور کوئی شخص ان عقائد سے دھوکہ میں نہ آئے۔

اچھے تذکرہ سے مردے کا بھی فائدہ:

لہٰذا جو بات حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمائی، یہ یاد رکھنے کی ہے کہ مرنے والوں کے محاسن ذکر کرو اور اس کی برائیوں کو ذکر کرنے سے پرہیز کرو۔ اس حدیث میں صرف برائیوں سے پرہیز کرنے کا ذکر نہیں کیا بلکہ ساتھ میں یہ بھی فرمادیا کہ اس کی اچھائیاں ذکر کرو، اس کی اچھائیاں ذکر کرنے کی ترغیب دی۔ میں نے اپنے بعض بزرگوں سے اس کی حکمت یہ سنی کہ یہ جب کوئی مسلمان کسی مرنے والے کی کوئی اچھائی ذکر کرتا ہے، یا اس کی نیکی کا تذکرہ کرتا ہے تو یہ اس مرنے والے کے حق میں ایک گواہی ہوتی ہے اور اس گواہی کی بنیاد پر بعض اوقات اللہ تعالیٰ اس مرنے والے پر فضل فرمادیتے ہیں کہ میرے نیک بندے تمہارے بارے میں اچھائی کی گواہی دے رہے ہیں، چلو ہم تمہیں معاف کرتے ہیں۔ لہٰذا اچھائی کا ذکر کرنا مرنے والے کے حق میں بھی فائدہ مند ہے اور جب تمہاری گواہی کے نتیجے میں اس کو فائدہ پہنچ گیا تو کیا بعید ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کے نتیجے میں تمہاری بھی مغفرت فرمادیں اور یہ فرمادیں کہ تم نے میرے ایک بندے کو فائدہ پہنچایا، لہٰذا ہم تمہیں بھی فائدہ پہنچاتے ہیں اور تمہیں بھی بخش دیتے ہیں۔ اس لیے فرمایا کہ صرف یہ نہیں کہ مرنے والے کا برائی کے ساتھ تذکرہ مت کرو بلکہ فرمایا کہ اس کی اچھائیاں ذکر کرو۔ اس سے انشاء اللہ ان کو بھی فائدہ پہنچے گا اور تمہیں بھی فائدہ پہنچے گا۔

مرنے والوں کے لیے دعائیں کرو:

ایک اور حدیث بھی اسی مضمون کی ہے، لیکن الفاظ دوسرے ہیں۔ وہ یہ کہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ:

لاتذکروا ھلکا کم الا بخیر

''اپنے مرنے والوں کا ذکر مت کرو، مگر اچھائی کے ساتھ۔''

(نسائی، کتاب الجنائز، النہی عن ذکر الھلکی الا بخیر)

اور اچھائی کے ساتھ ذکر میں یہ بات بھی داخل ہے کہ جب اس کی اچھائی ذکر کر رہے ہو تو اس کے حق میں دعا کردو کہ اللہ تعالیٰ اس کی مغفرت فرمائے، اس پر اپنا

فضل فرمائے۔ اللہ تعالیٰ اس کو اپنے عذاب سے محفوظ فرمائے۔ یہ دعائیں ڈبل فائدہ دیں گی۔ ایک تو دعا کرنا بذات خود عبادت اور ثواب ہے، چاہے وہ کسی کام کے لیے بھی کرے۔ دوسرے کسی مسلمان کو فائدہ پہنچانے کا اجر و ثواب بھی حاصل ہو جائے گا۔ اس لیے اس کے حق میں دعا کرنے میں آپ کا بھی فائدہ ہے اور اس کا فائدہ بھی ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے ہم سب کو اس پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

واخر دعوانا عن الحمد للہ رب العالمین

مضمون:۲۹

قصص القرآن کی فلم بندی

اس مرتبہ رمضان کے مبارک مہینے میں ٹیلی ویژن پر ''قصص القرآن'' کے نام سے ایک فلم کی نمائش کا سلسلہ شروع کیا گیا۔ جس کے بارے میں کہا جارہا ہے کہ وہ بعض عرب ممالک سے درآمد کی گئی ہے۔ اس فلم میں مختلف قرآنی واقعات کو فلم کی شکل میں پیش کیا جارہا ہے۔ اس فلم کی نمائش پر ملک کے ممتاز علماء نے احتجاج کیا اور حکومت سے مطالبہ کیا کہ اس کی نمائش بند کی جائے۔ اس سلسلے میں دارالعلوم کراچی کے ذمہ دار حضرات کی طرف سے مفصل بیان اخبارات میں شائع ہو چکا ہے اور ملک کے دوسرے علماء اور دینی وسماجی تنظیموں کی طرف سے بھی اس پر مسلسل احتجاج ہو رہا ہے۔ حکومت کے ذمہ دار حضرات سے گفت وشنید کا سلسلہ بھی جاری ہے۔ امید رکھنی چاہیے کہ جب تک یہ سطور قارئین کے سامنے پہنچیں گی قرآن کریم کے ساتھ سنگین جسارت کا یہ سلسلہ بند کر دیا جائے۔ لیکن چونکہ اس قسم کے اقدامات وقتاً فوقتاً مختلف اطراف سے ہوتے رہتے ہیں اور اس فلم کے بارے میں بھی بعض حلقوں سے یہ دلیل پیش کی جارہی ہے کہ ٹیلی ویژن جیسے مؤثر ذریعہ ابلاغ سے قرآنی واقعات کی فلم پیش کرنا موجودہ دور میں تبلیغ کا ایک کارآمد ذریعہ ہے اور بعض حلقوں کی طرف سے کہا جارہا ہے کہ اس فلم میں آخر نقصان ہی کیا ہے؟ جو علماء کی طرف سے اس کی مخالفت کی جارہی ہے۔ اس لیے اس موضوع پر چند مختصر گذارشات پیش کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

سب سے پہلے تو یہ غلط فہمی ذہن سے دور کرنے کی ضرورت ہے کہ اسلام میں تبلیغ و دعوت کا کوئی اصول مقرر نہیں ہے اور جب جس شخص کا جی چاہے تبلیغ اسلام کے لیے کوئی بھی ایسا ذریعہ استعمال کر سکتا ہے جو دوسروں پر اثر انداز ہونے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ بعض دوسرے تبلیغی مذاہب میں بے شک یہ بات نظر آتی ہے کہ وہ اپنے ماننے والوں کی تعداد میں اضافہ کرنے کے لیے ہر اچھے برے طریقے کو نہ صرف جائز سمجھتے ہیں بلکہ اس

پر بے جھجک عمل بھی کرتے ہیں۔ اپنے نام لیواؤں کی مردم شماری، لالچ، ڈراوے اور دھوکہ فریب سے لے کر کھیل تماشے تک ہر طریقے ان کے نزدیک جائز ہیں۔ اگر اس غرض کے لیے انہیں اپنی عورتوں کو بے عزت کرنا پڑے تو بھی اس سے نہیں چوکتے اور اگر اپنی مقدس شخصیتوں کے وقار سے کھیلنا پڑے تو اس سے بھی انہیں کوئی دریغ نہیں۔ عیسائی مشنریوں کا طریق کار یہ ہے کہ بائبل کی طرف لوگوں کو مائل کرنے کے لیے بائبل کے باتصویر نسخے عام ہیں۔ جن میں انبیاء کرام کی ایسی حیا سوز تصویریں کھلم کھلا شائع ہو رہی ہیں جنہیں دیکھ کر ایک شریف انسان کی پیشانی عرق عرق ہو جائے۔ بائبل کے مختلف قصوں پر مشتمل فلمیں تیار کی جاتی ہیں اور ان میں دلچسپی پیدا کرنے کے لیے ان میں عشقیہ قصوں کی پوری ڈھٹائی کے ساتھ آمیزش کردی جاتی ہے، تاکہ نوعمر لوگ انہیں ذوق وشوق کے ساتھ دیکھ سکیں۔ اس کے علاوہ لوگوں کو راغب کرنے کے لیے رقص و سرور کے ایسے پروگرام ترتیب دیئے جاتے ہیں جن کے درمیان کلیسا میں آنے کی دعوت دی جاتی ہے۔ غرض تبلیغ و دعوت کے طریقے لوگوں کی خواہشات نفس کے تابع آئے دن بدلتے رہتے ہیں۔

اس کے برعکس اسلام نے جہاں تبلیغ و دعوت کو ضروری قرار دیا ہے وہاں اس کے باوقار آداب بھی بتلائے ہیں۔ لہٰذا اسلام کے لیے یہ بات ممکن نہیں ہے کہ وہ لوگوں کی خواہشات نفس کی اصلاح کے بجائے اپنی دعوت وتبلیغ کو ان خواہشات کا تابع مہمل بنادے۔ اسلام کا مقصد صرف اپنے نام نہاد پیروؤں کی مردم شماری میں اضافہ کرنا نہیں، بلکہ ایسے انسان تیار کرنا ہے جو اپنی خواہشات نفس کے بجائے اللہ کے احکام کے تابع ہوں۔ اسلام کی دعوت کا ایک خاص وقار ہے اور اس وقار کو ملحوظ رکھے بغیر دعوت کا جو بھی طریقہ اختیار کیا جائے گا وہ اسلام کا نہیں، کسی اور دین کا طریقہ ہوگا۔ لہٰذا اگر کوئی شخص یہ سمجھتا ہے کہ اسلام کی سنجیدہ اور باوقار تعلیمات کو کھیل تماشا بنا کر پیش کرنے سے اسلام کی تبلیغ ہو رہی ہے تو وہ اسلام کے مزاج ومذاق سے سنگین حد تک ناواقف ہے۔ اسلام انسانوں کو خواہشات نفس کی غلامی سے نکال کر خدائے واحد کی غلامی میں لانے کے لیے آیا ہے اور اگر وہ ان خواہشات کے آگے ہتھیار ڈال کر خود اپنی تبلیغ کے لیے وہ طریقے اختیار کرنا شروع کردے جو اس کے نزدیک جائز یا نامناسب ہیں تو یہ آپ اپنی تردید

کے مترادف ہوگا۔

خاص طور سے قرآن کریم اللہ تعالیٰ کی وہ کتاب ہے جسے قیام قیامت تک کسی ادنیٰ تغیر کے بغیر باقی رکھنے کے لیے بہت سے ایسے احکام دیئے گئے ہیں جو اسے دوسری کتابوں سے ممتاز کرتے ہیں۔ یہ اللہ تعالیٰ کا کلام ہے اور اس کی تلاوت و تبلیغ کے لیے وہ آداب مقرر کیے گئے ہیں جو اس کی عظمت وجلال کے شایان شان ہوں، اس کی آیات کو لکھنے کے لیے رسم الخط تک تبدیل کرنے کی ممانعت ہے۔ اسے ایسے مقامات پر پڑھنا ناجائز قرار دیا گیا ہے جہاں اس کا صحیح ادب ملحوظ نہ رکھا جاسکے۔ اس کی تفسیر کے بارے میں یہ ہدایت دی گئی ہے کہ قرآن کے الفاظ و معانی کے ساتھ تفسیری اضافوں کو بالکل ممتاز اور جدا رکھا جائے، تاکہ قرآن کریم کی طرف اس سے زیادہ بات منسوب نہ ہو جتنی اس نے واقعتاً کہی ہے۔ اس کے متن کے بغیر صرف ترجمہ شائع کرنے کو ناجائز قرار دیا گیا ہے تاکہ یہ ترجمے بائبل کی طرح کہیں رفتہ رفتہ اصل متن کی جگہ نہ لے لیں۔ قرآنی آیات کو ہنسی مذاق کا موضوع بنانے سے سختی کے ساتھ روکا گیا ہے تاکہ اس عظیم کتاب کے وقار پر کوئی ادنیٰ آنچ نہ آسکے۔ قرآن کریم کے نسخوں کو بے وضو چھونا ناجائز قرار دیا گیا ہے، تاکہ جو شخص بھی اس کی تلاوت یا اس سے استفادہ کرنا چاہے وہ پہلے اپنے آپ کو پاک صاف کر کے پوری سنجیدگی کے ساتھ اس کی طرف متوجہ ہو اور اس کے تقدس کو ملحوظ رکھتے ہوئے اس سے ہدایت حاصل کرے۔

یہ تمام احکام آخر کس لیے ہیں؟ درحقیقت ان کا بنیادی مقصد ہی یہ ہے کہ یہ کتاب کوئی معمولی کتاب نہیں ہے، جسے کسی غیر سنجیدہ انداز میں پڑھا یا سنا جائے، بلکہ یہ اللہ جل جلالہ کا کلام ہے جسے پڑھنے اور سننے کے لیے نہ صرف سنجیدہ اور باوقار بلکہ پوری طرح پاکیزہ ماحول ضروری ہے اور ان حدود و شرائط کی رعایت کیے بغیر اسے پیش کرنا اس کی سنگین بے ادبی ہے، جسے اسلام کبھی گوارا نہیں کرسکتا۔

ان باتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے غور فرمائیے کہ ایسی مقدس کتاب، جس کے اردگرد آداب و شرائط کے ایسے پہرے بٹھائے گئے ہیں، اس کو کسی ایسی فلم یا ڈرامے کی غیر سنجیدہ شکل میں پیش کرنا آخر اسلام کی غیرت کو کیسے گوارا ہوسکتا ہے۔ جس میں کچھ پیشہ وارانہ اداکار مقدس قرآنی شخصیتوں کا بہروپ بھر کر ان کی مصنوعی نقل اتاریں اور ان

بہروپیوں کی بناوٹی حرکات وسکنات کو قرآنی مضامین قرار دے کر پیش کیا جائے؟ واقعہ یہ ہے کہ جس قرآن کریم نے خود اپنے بارے میں یہ فرمایا ہے کہ اس کی آیات سن کر اللہ کے بندوں کے رونگھٹے کھڑے ہوتے ہیں اور دل لرزتے ہیں اس جیسی عظمت وجلال کی کتاب کے ساتھ گستاخی وجسارت کا اس سے بڑا مظاہرہ اور کیا ہوسکتا ہے؟

پھر کیا کوئی فلم تصویروں سے خالی ہوسکتی ہے؟ کیا کسی ایسی فلم کا تصور کیا جاسکتا ہے جس میں نامحرم عورتیں بے حجاب ہوکر سامنے نہ آئیں؟ کیا کوئی فلم آج تک موسیقی سے پاک تیار کی گئی ہے؟ سوال یہ ہے کہ وہ کبائر جن کو مٹانا اسلام کے اولین مقاصد میں شامل ہے ان کا ارتکاب کر کے اس مصنوعی ناٹک کو قرآنی مضامین کا نام دینا قرآن کریم کے ساتھ ایک کھلم کھلا مذاق نہیں تو اور کیا ہے؟ وہ آخر کونسی تبلیغ اسلام ہے جو خدائی احکام کی صریح خلاف ورزی کر کے انجام دی جارہی ہے؟ اور جس کے ذریعے ان گناہوں کی برائی تک کا احساس دلوں سے مٹایا جارہا ہے؟

کہا جاتا ہے کہ ان فلموں کے ذریعے ان لوگوں تک قرآنی مضامین پہنچانا مقصود ہے جو کبھی مسجد میں آکر کوئی وعظ نہیں سنتے، جنہیں دینی کتابوں کے مطالعے سے دلچسپی نہیں ہے اور جن کو بذات خود قرآن کریم پڑھنے کی توفیق نہیں ہوتی۔ لیکن اسلام کی تبلیغ کے سلسلے میں جو اصولی گذارشات ہم نے اوپر پیش کی ہیں، ان کے پیش نظر اس دلیل میں رتی برابر وزن نہیں ہے جو لوگ قرآنی مضامین کو فلم اور ڈرامے کے سوا کسی اور ذریعے سے سننے کے لیے تیار نہیں ہیں، اسلام اور قران ان کو اپنے مضامین سنانے سے بے نیاز ہے اور جن لوگوں کے حلق سے دین کی کوئی بات اس وقت تک نہ اترے جب تک اسے ایک رنگین فلم کی شکل میں پیش نہ کیا جائے، ایسے لوگوں کو قرآن سے کبھی کوئی ہدایت نصیب بھی نہیں ہوسکتی، قرآن کریم نے تو اپنی پہلی ہی آیت میں فرمایا ہے کہ:

ذلک الکتاب لاریب فیه هدی للمتقین

”اس کتاب میں کوئی شک نہیں اور یہ ان لوگوں کے لیے ہدایت ہے جو اللہ سے ڈرتے ہیں۔“

لہٰذا جن لوگوں میں حق کی کوئی بات طلب یا تلاش نہ ہو اور جو کھیل تماشے کے بغیر دین کی کوئی بات سننے کے لیے تیار نہ ہوں آپ ان کے سامنے ایسی ہزار فلموں کے

ذریعے تمام قرآنی مضامین بیان کر دیجیے، انہیں اس سے وہ ہدایت رتی برابر بھی حاصل نہ ہوگی جو قرآن کریم کا اصل مقصد اور اس کو حقیقتاً مطلوب ہے۔ جن لوگوں کے دل میں ازخود حق تک پہنچنے کی کوئی ادنیٰ تڑپ نہیں ہے اور جو حق تک پہنچنے کے حقیقی راستوں سے اپنے آپ کو نہ صرف مستغنیٰ اور بے نیاز سمجھتے ہیں بلکہ اس سے نفرت اور اعراض کا معاملہ کرتے ہیں۔ ان کے لیے خود قرآن کریم کا ارشاد یہ ہے کہ:۔

اما من استغنٰی فانت لہ تصدّٰی وما علیک الا یزکی

"رہے وہ لوگ جو (حق سے) مستغنی ہیں، تو آپ ان کے پیچھے پڑھتے ہیں، حالانکہ اگر وہ (دین حق قبول کر کے) پاک نہ ہوں تو آپ پر اس کی کوئی ذمہ داری نہیں۔"

ایسے لوگوں کے بارے میں یہ خیال کرنا کہ دین کو ان کی خواہشات کے سانچے میں ڈال کر پیش کرنے سے ان کی اصلاح ہو جائے گی انتہاء درجے کی خام خیالی کے سوا کچھ نہیں۔

پھر فلم اور ڈرامے کا مزاج ہی یہ ہے کہ وہ کبھی ٹھیک واقعات کے مطابق نہیں بنایا جاسکتا۔ اگر اس میں صرف اتنی بات دکھائی جائے جو قرآن کریم میں مرکوز ہے تو صرف اتنے واقعات سے کوئی فلم تیار نہیں ہوسکتی۔۔ جب تک کہ اس میں فلمساز کے ذاتی تخیلات کی آمیزش نہ ہو۔ قصص القرآن نامی زیر بحث فلم میں بھی صورت یہی ہے کہ اس میں قرآن کریم کے بیان کردہ واقعات کے ساتھ اسرائیلی روایات اور فلمساز کے ذاتی تخیلات کو گڈمڈ کر کے دکھایا گیا ہے اور اس مجموعے کا نام قصص القرآن رکھ کر تاثر یہ دیا گیا ہے کہ یہ سب کچھ قرآنی مضامین ہیں۔ اس طرح وہ باتیں قرآن کی طرف منسوب کی گئی ہیں جو قرآن کریم نے نہیں فرمائیں، یا فرمائی ہیں تو ان کی دوسری تفسیر وتوجیہ بھی ممکن ہے۔

اگر آج اس قسم کی فلموں کا دروازہ کھول دیا گیا تو کل تجارتی بنیادوں پر بننے والی فلمیں اپنے آپ کو ایک دوسرے سے زیادہ دلچسپ بنانے کے شوق میں ان پاکباز شخصیتوں اور مقدس واقعات کا کیا حشر بنا کر چھوڑیں گی؟ اس کے تصور سے بھی رونگٹے

کھڑے ہو جاتے ہیں۔

یہودیوں اور عیسائیوں کی بنائی ہوئی فلموں کا حال ہماری آنکھوں کے سامنے ہے کہ انہوں نے انبیاء علیہم السلام تک کو (معاذ اللہ) رومانی قصوں کا ہیرو بنا کر اپنی فلمی صنعت کو چمکایا ہے، نہ جانے کتنی فلمیں ایسی ہیں کہ ان کے دیکھنے والوں کو سالہا سال تک یہ معلوم نہ ہو سکا کہ ان کے ہیرو در حقیقت انبیاء علیہم السلام تھے جن کے واقعات کو ان ظالموں نے مسخ کر کے رومانی فلم کی شکل دے دی ہے۔

اگر ایک مرتبہ اس قسم کی فلمیں بنانے کی اجازت دے دی گئی تو اس سیلاب کو روکنا کسی کے بس میں نہ ہوگا۔

کہا جا رہا ہے کہ یہ فلم بعض عرب ممالک میں تیار ہوئی ہے اور وہاں کے بعض علماء نے اس کی اجازت بھی دے دی ہے، ہمیں معلوم نہیں کہ وہ کون سے علماء ہیں جنہوں نے یہ اجازت دی ہے، لیکن بہر حال! دین میں اصل اہمیت دلائل کو ہے اور ان حضرات نے اگر اجازت دی ہے تو وہ مذکورہ بالا دلائل کے مقابلے میں حجت نہیں ہے۔

اور ہمارے نزدیک تو یہ مسئلہ بھی تحقیق طلب ہے کہ اس فلم کے پیچھے کوئی یہودی سازش تو کارفرما نہیں؟ اس لیے کہ جن لوگوں نے یہ فلم دیکھی ہے ان میں سے بعض حضرات نے بتایا کہ قرآن کریم نے میدان تیہ میں بنی اسرائیل کے محصور ہونے کے جو واقعات بیان فرمائے ہیں ان کا اصل مقصد تو یہ بتانا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس قوم پر کیسے کیسے غیر معمولی انعامات فرمائے، لیکن اس کے جواب میں انہوں نے ہمیشہ سرکشی کا معاملہ کیا۔ اس کے برعکس فلم کے اس حصے کو دیکھ کر دیکھنے والوں پر بنی اسرائیل کی مظلومیت اور ان کے ساتھ ہمدردی کا تاثر پیدا ہوتا ہے۔ گویا اللہ تعالیٰ نے ان کے ساتھ (معاذ اللہ) بہت زیادہ سختی کا معاملہ فرمایا اور اس کے جواب میں ان کے طرح طرح کے مطالبات اور ان کا رویہ وہی تھا جو ایسی مظلوم قوم کا ہونا چاہیے تھا۔

اگر یہ بات درست ہے تو کچھ بعید نہیں ہے کہ کسی یہودی سازش نے بعض مسلمانوں کی سادہ لوحی سے فائدہ اٹھا کر اس فلم کو مسلمانوں میں رائج کرنے کی کوشش کی ہو، تاکہ یہودیوں کے بارے میں مسلم دنیا میں جو تاثرات ہیں ان کو غیر شعوری طور پر ذہنوں سے کھرچا جائے اور ان کی جگہ یہودیوں کی ساتھ ہمدردی کے جذبات پیدا کیے

جائیں۔ واللہ اعلم۔

بہرصورت! یہ فلم کسی بھی حیثیت سے اس لائق نہیں ہے کہ مسلمان اسے دیکھیں، یا اپنے ملکوں میں اس کی نمائش کی اجازت دیں۔ امید ہے کہ ملک میں اس فلم کے خلاف جو احتجاج ہو رہا ہے اس کے پیش نظر حکومت اپنی رائے پر اصرار نہیں کرے گی اور اس فلم کی نمائش بند کر دی جائے گی۔

وما علینا الا البلاغ

محمد تقی عثمانی

۱۸؍رمضان المبارک ۱۴۰۴ھ

مضمون: ۳۰

اپنے گھروں کو بچائیے

زمانہ اس تیزی سے بدل رہا ہے کہ جس انقلاب کو پہلے ایک طویل مدت درکار ہوتی تھی اب وہ دیکھتے ہی دیکھتے رونما ہو جاتا ہے۔ آج کے ماحول کا زیادہ نہیں پندرہ بیس سال پہلے کے وقت سے موازنہ کر کے دیکھئے۔ زندگی کے ہر شعبے میں کایا ہی پلٹی ہوئی نظر آئے گی، لوگوں کے افکار و خیالات، سوچنے سمجھنے کے انداز، معمولات زندگی، معاشرے، رہن سہن کے طریقے، باہمی تعلقات، غرض زندگی کے ہر شعبے میں ایسا انقلاب برپا ہو گیا ہے کہ بعض اوقات سوچنے سے حیرت ہو جاتی ہے۔

کاش یہ برق رفتاری کسی صحیح سمت میں ہوتی تو آج یقیناً ہماری قوم کے دن پھر چکے ہوتے، لیکن حسرت اور شدید حسرت، افسوس اور نا قابل بیان افسوس اس بات کا ہے کہ یہ ساری برق رفتاری الٹی سمت میں ہو رہی ہے، کسی شاعر حکیم نے یہ مصرعہ مغرب کے لیے کہا تھا۔ مگر آج یہ ہمارا اپنا حال بن چکا ہے کہ:

تیز رفتاری ہے، لیکن جانب منزل نہیں

اس بات کو کب اور کس کس عنوان سے کہا جائے کہ پاکستان اسلام کے لیے بنا تھا، اس لیے بنا تھا کہ یہاں کے باشندے احکام الٰہی کا عملی پیکر بن کر دنیا بھر کے لیے ایک قابل تقلید مثال قائم کریں۔ لیکن ہماری ساری تیز رفتاری اس کی بالکل مخالف سمت میں صرف ہوتی رہی اور آج تک ہو رہی ہے۔ جن گھروں سے کبھی کبھی تلاوت قرآن کی آواز آ جایا کرتی تھی اب وہاں صرف فلمی نغمے گونجتے ہیں۔ جہاں کبھی اللہ و رسول اور اسلاف امت کی باتیں ہو جایا کرتی تھیں، اب وہاں باپ بیٹوں کے درمیان بھی ٹی وی فلموں پر تبصرے ہی زیر بحث رہتے ہیں۔ جن گھرانوں میں کبھی کسی اجنبی عورت کی تصویر کا داخلہ محال تھا، اب وہاں باپ بیٹیاں اور بہن بھائی ایک ساتھ بیٹھ کر نیم برہنہ رقص دیکھتے ہیں اور خوش ہوتے ہیں۔ جن خاندانوں میں کبھی حرام آمدنی سے آگ کے

انگاروں کی طرح پرہیز کیا جاتا تھا، اب وہاں نسلیں کی نسلیں سود، رشوت اور قمار سے پروان چڑھ رہی ہیں۔ جو خواتین پہلے برقعہ کے ساتھ باہر نکلتی ہوئی ہچکچاتی تھیں، اب وہ دوپٹے تک کی قید سے آزاد ہو رہی ہیں۔ غرض اسلامی احکام سے عملی اعراض اس تبدیلی سے بڑھ رہا ہے کہ مستقبل کا تصور کر کے بعض اوقات روح کانپ اٹھتی ہے۔

اس تشویشناک صورت حال کے یوں تو بہت سے اسباب ہیں، لیکن اس وقت اس کے صرف ایک سبب کی طرف توجہ دلانا مقصود ہے، خدا کرے کہ اسے اسی توجہ اور اہتمام کے ساتھ سن اور سمجھ لیا جائے جس کا وہ مستحق ہے۔

وہ سبب یہ ہے کہ ہمارے معاشرے میں جو لوگ دیندار سمجھے جاتے ہیں وہ بھی اپنے گھر والوں کی دینی اصلاح و تربیت سے بالکل بے فکر بیٹھ گئے ہیں۔ اگر آپ اپنے گرد و پیش کا جائزہ لیں تو ایسی بیسیوں مثالیں آپ کو نظر آجائیں گی کہ ایک سربراہ خاندان اپنی ذات میں بڑا نیک اور دیندار انسان ہے، صوم وصلوٰۃ کا پابند ہے، سود، رشوت، قمار اور دوسرے گناہوں سے پرہیز کرتا ہے، اچھی خاصی دینی معلومات رکھتا ہے اور مزید معلومات حاصل کرنے کا شوقین ہے۔ لیکن اس کے گھر کے دوسرے افراد پر نگاہ ڈالیے تو ان میں ان اوصاف کی کوئی جھلک خوردبین لگا کر بھی نظر نہیں آتی۔ دین، مذہب، خدا، رسول صلی اللہ علیہ وسلم، قیامت اور آخرت جیسی چیزیں سوچ بچار کے موضوعات سے یکلخت خارج ہو چکی ہیں۔ ان کی بڑی سی بڑی عنایت اگر کچھ ہے تو یہ کہ وہ اپنے ماں باپ کے مذہبی طرز عمل کو گوارا کر لیتے ہیں، اس سے نفرت نہیں کرتے۔ لیکن اس سے آگے نہ وہ کچھ سوچتے ہیں، نہ سوچنا چاہتے ہیں۔

کوئی شک نہیں کہ ہر شخص اپنے عمل کا ذمہ دار ہوتا ہے اور اولاد کی مکمل ہدایت ماں باپ کے قبضہ قدرت میں نہیں ہے۔ نوح علیہ السلام کے گھر میں بھی کنعان پیدا ہو جاتا ہے۔ لیکن یہ فریضہ تو ہر مسلمان کے ذمہ عائد ہوتا ہے کہ وہ اپنے گھر والوں کی دینی تربیت میں اپنی پوری کوشش صرف کر دے۔ اگر کوشش کے باوجود راہ راست پر نہیں آتے تو بلاشبہ وہ اپنی ذمہ داری سے بری ہے۔ لیکن اگر کوئی شخص اس مقصد کی طرف کوئی دلی توجہ ہی نہیں کرتا اور اس نے اپنے تئیں دین پر عمل کر کے اپنے گھر والوں کو حالات کے دھارے پر بے فکری سے چھوڑ دیا ہے تو وہ ہرگز اللہ کے نزدیک بری نہیں ہے۔ اس

کی مثال بالکل اس احمق کی سی ہے، جو اپنے بیٹے کو خودکشی کرتے ہوئے دیکھے اور یہ کہہ کر الگ ہو جائے کہ جوان بیٹا اپنے عمل کا خود ذمہ دار ہے۔

کنعان بلاشبہ حضرت نوح علیہ السلام کا بیٹا تھا اور آخر دم تک اس کی اصلاح نہ ہو سکی، لیکن یہ بھی تو دیکھئے کہ اس کے جلیل القدر باپ نے اسے راہ راست پر لانے کے لیے کیا کیا جتن کیے؟ کیسے کیسے پاپڑ بیلے؟ کس کس طرح خون کے گھونٹ پی کر اسے تبلیغ کی؟ اس کے بعد بھی اس نے اپنے لیے سفینہ ہدایت کے بجائے کفر و ضلالت کی موجیں ہی منتخب کیں تو بے شک حضرت نوح علیہ السلام اس کی ذمہ داری سے بری ہو گئے۔ لیکن کیا آج کوئی ہے جو اپنی اولاد کی اصلاح کے لیے فکر و عمل کی اتنی توانائیاں صرف کر رہا ہو۔

قرآن کریم نے ایک مسلمان پر صرف اپنی اصلاح کی ذمہ داری عائد نہیں کی۔ بلکہ اپنے گھر والوں، اپنی اولاد، اپنے عزیز و اقارب اور اپنے اہل خاندان کو راہ راست پر لانے کی کوشش بھی اس پر ڈالی ہے۔ سرور کائنات محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ احکام الٰہی پر کاربند کون ہوگا؟ لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی نبوت کے بعد جو سب سے پہلا تبلیغی حکم نازل ہوا وہ یہ تھا کہ:

وأنذر عشيرتك الاقربين

''اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے قریبی اہل خاندان کو (عذاب الٰہی) سے ڈرائیے۔''

چنانچہ اسی حکم کی تعمیل فرماتے ہوئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اہل خاندان کو کھانے پر جمع فرمایا اور کھانے کے بعد ایک موثر خطبہ دیا جس کے مندرجہ ذیل جملے روایات میں محفوظ رہ سکے ہیں۔

يا فاطمه بنت محمد، يا صفية بنت عبدالمطلب، يا بني عبدالمطلب لا أملك لكم من الله شيئاً، سلوني ما شئتم يا بني عبدالمطلب اني والله ما اعلم شاباً من العرب جاء قومه بأفضل مما جئتكم به، اني قد جئتكم بخير الدنيا والآخرة

وقد أمرنی الله ان ادعو کم الیه فایکم یوازرنی علی هذا الامر علی ان یکون اخی

''اے فاطمہ بنت محمد! اے صفیہ بنت عبدالمطلب! اے بنی عبدالمطلب! مجھے اللہ کی طرف سے تمہارے حق میں کوئی اختیار نہیں۔ تم (میرے مال میں سے) جتنا چاہو مجھ سے مانگ لو۔ اے بنی عبدالمطلب! خدا کی قسم جو چیز میں تمہارے پاس لے کر آیا ہوں۔ مجھے عرب میں کوئی جوان ایسا معلوم نہیں جو اپنی قوم کے پاس اس چیز سے بہتر کوئی شے لایا ہو۔ میں تمہارے پاس دنیا اور آخرت کی بھلائی لایا ہوں اور مجھے اللہ نے حکم دیا ہے کہ تم کو اس کی طرف دعوت دوں۔ تم میں سے کون ہے جو اس کام میں میرے ہاتھ مضبوط کرے اور اس کے نتیجے میں میرا بھائی بن جائے۔''

(تفسیر ابن کثیر" ص ۳۵۰ و ۳۵۱، ج ۳۔ المکتبۃ التجارتہ۔ مصر ۱۳۵۶ھ)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ تمام انبیاء علیہم السلام کی سنت یہی رہی ہے کہ انہوں نے اپنی تبلیغ کا آغاز اپنے گھر والوں سے کیا اور خود احکام الٰہی پر کاربند ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے اہل خانہ کی دینی تربیت پر اپنی پوری توجہ صرف فرمائی۔ حضرت یعقوب علیہ السلام نے وفات سے پہلے اپنی اولاد کو جمع کر کے وصیت فرمائی، اس کا تذکرہ قرآن کریم نے اس طرح کیا ہے:

اذ قال لبنیه ماتعبدون من بعدی قالوا نعبد الهک واله ابآئک ابراهیم واسمعیل واسحق الها واحدًا ونحن له مسلمون. (البقرہ ۱۳۳)

''جب (یعقوب علیہ السلام نے) اپنے بیٹوں سے کہا کہ تم میرے بعد کس کی عبادت کرو گے؟ انہوں نے کہا کہ ہم اس ذات پاک کی پرستش کریں گے جس کی آپ اور آپ کے آباء واجداد ابراہیم، اسمٰعیل اور اسحٰق (علیہم السلام) پرستش کرتے آئے ہیں، یعنی وہی معبود جو وحدہٗ لاشریک ہے اور ہم اسی کی اطاعت پر (قائم) رہیں

گے۔"

حضرت ابراہیم علیہ السلام دعا فرماتے ہیں کہ:

رب اجعلنی مقیم الصلوۃ ومن ذریتی ربنا وتقبل دعآء (ابراہیم:۴۰)

"اے میرے پروردگار مجھے بھی نماز کا پابند بنایئے اور میری اولاد کو بھی۔ اے ہمارے پروردگار! میری دعا قبول کر لیجیے۔"

انبیاء علیہم السلام کی ایسی ایک دو نہیں دسیوں دعائیں منقول ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اپنی اولاد اور اہل خاندان کی دینی اصلاح کی فکر ان حضرات کی رگ رگ میں سمائی ہوئی تھی۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے جہاں تمام مسلمانوں کو خود عذاب الٰہی سے بچنے کی تاکید فرمائی وہاں گھر والوں کو بھی اس سے بچانے کی ذمہ داری ان پر عائد کی ہے۔ ارشاد ہے:

یایھا الذین امنوا قوا انفسکم واھلیکم نارًا.

(تحریم:۶)

"اے ایمان والو! اپنی جانوں کو اور اپنے گھر والوں کو آگ سے بچاؤ۔"

نیز ارشاد فرمایا:

وامر اھلک بالصلوۃ واصطبر علیھا (طٰہٰ:۱۳۲)

"اور اپنے گھر والوں کو نماز کا حکم دو اور خود بھی اس کی پابندی کرو۔"

قرآن وحدیث کے یہ واضح احکام اور انبیاء علیہم السلام کی یہ سنت جاریہ اس بات کو ثابت کرنے کے لیے کافی ہے کہ ایک مسلمان کے ذمہ صرف اپنی ذات کی دینی اصلاح ہی نہیں ہے، بلکہ اپنی اولاد اور اپنے گھر والوں کی دینی تربیت بھی اس کے فرائض میں داخل ہے اور درحقیقت اس کے بغیر انسان کا خود دین پر ٹھیک کاربند رہنا ممکن ہی نہیں ہے، اگر کسی شخص کا سارا گھریلو ماحول دین سے بیزار اور خدا ناآشنا ہو، تو خواہ وہ اپنی ذات میں کتنا دیندار کیوں نہ ہو، ایک نہ ایک دن اپنے ماحول سے ضرور متاثر ہوگا، اس لیے خود اپنے آپ کو استقامت کے ساتھ صراط مستقیم پر رکھنے کے لیے بھی یہ ضروری ہے کہ اپنے گرد و پیش کو فکر وعمل کے اعتبار سے اپنا ہم مشرب بنایا جائے۔

آج ہمارے بگاڑ کی ایک بہت بڑی وجہ یہ ہے کہ ہم اپنے اس فریضے سے یکسر غافل ہو چکے ہیں۔ بڑے بڑے دیندار گھرانوں میں نئی نسل کی دینی تربیت بالکل خارج از بحث ہوگئی ہے اور اگلے وقتوں کے لوگ حالات کے آگے سپر ڈال کر اپنی اولاد کو زمانہ کے بہاؤ پر چھوڑ چکے ہیں۔

بعض حضرات یہ بھی کہتے سنے گئے ہیں کہ ہم نے تو اپنے اہل خانہ کو دینی رنگ میں رنگنے میں بڑے کوشش کی، لیکن زمانے کی ہوا ہی ایسی ہے کہ ہمارے وعظ ونصیحت کا ان پر کچھ اثر نہ ہوا۔ مگر بعض اوقات یہ خیال شیطان کے دھوکے کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ سوال یہ ہے کہ آپ نے کتنی لگن، کتنے اضطراب اور کتنی دلسوزی کے ساتھ یہ کوششیں کی ہیں۔ اگر آپ کی اولاد جسمانی طور پر بیمار ہو جائے یا اس کا کوئی عضو خدا نہ کرے آگ میں جلنے لگے تو آپ اپنے دل میں کتنی تڑپ محسوس کرتے ہیں اور یہ تڑپ آپ سے کیسے کیسے مشکل کام کرا لیتی ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا اپنی اولاد کو گناہوں میں مبتلا دیکھ کر بھی کبھی آپ نے اتنی تڑپ محسوس کی ہے؟ اگر واقعتاً اولاد کی دینی اور اخلاقی تباہی کو دیکھ کر آپ میں اتنی ہی تڑپ پیدا ہوئی ہے جتنی اسے بیمار دیکھ کر ہوتی ہے اور آپ نے اسے دینی تباہی سے بچانے کی ایسی ہی کوشش کی ہے جتنی جسمانی ہلاکت سے بچانے کے لیے کرتے ہیں تو بلاشبہ آپ نے اپنا فریضہ ادا کر دیا۔

لیکن اگر آپ نے اپنے گھر والوں کی دینی تربیت میں اتنی لگن، ایسے جذبے اور اتنی کاوش کا مظاہرہ نہیں کیا تو کیا وجہ ہے کہ ایک معمولی سی آگ اپنے بچے کے قریب دیکھ کر آپ کے سینے پر سانپ لوٹ جاتے ہیں اور جہنم کی ابدی آگ جس سے بچاؤ کی کوئی صورت نہیں، اسے آپ اپنی اولاد کے سامنے منہ کھولے دیکھتے ہیں، مگر آپ کی محبت وشفقت کوئی جوش نہیں مارتی؟ اگر آپ اپنے ننھے سے بچے کے ہاتھ میں بھرا ہوا پستول دیکھ لیتے ہیں تو اس کے رونے دھونے کی پروا کیے بغیر جب تک اس کے ہاتھ سے وہ پستول چھین نہ لیں، چین سے نہیں بیٹھ سکتے، لیکن کیا وجہ ہے کہ جب وہی اولاد آپ کو دینی تباہی کے آخری سرے پر نظر آتی ہے، تو آپ صرف ایک دو مرتبہ زبانی وعظ ونصیحت کر کے یہ سمجھ لیتے ہیں کہ آپ نے اپنا فریضہ ادا کر دیا۔

سوال یہ ہے کہ کیا آپ نے کبھی سنجیدگی اور اہتمام کے ساتھ اپنے گھر کی اصلاح

کی موثر تدبیریں سوچی ہیں، جس لگن اور دلچسپی کے ساتھ آپ اپنی اولاد کے لیے روزگار تلاش کرتے ہیں کیا اتنی لگن کے ساتھ اس کی تربیت کے راستے تلاش کیے ہیں؟ جس خضوع وخشوع اور سوز قلب کے ساتھ آپ ان کی صحت کے لیے دعائیں کرتے ہیں کیا اسی طرح آپ نے ان کے لیے اللہ سے صراط مستقیم طلب کی ہے؟ اگر ان میں سے کوئی کام آپ نے نہیں کیا تو آپ کو اپنے اہل خانہ کی ذمہ داری سے سبکدوش سمجھنے کا کوئی حق نہیں پہنچتا۔

ان ساری گزارشات کا منشاء صرف یہ ہے کہ نئی نسل جس برق رفتاری کے ساتھ فکری گمراہی اور عملی بے راہ روی کی طرف بڑھ رہی ہے، اس کا پہلا موثر علاج خود ہمارے گھروں میں ہونا چاہیے۔ اگر مسلمانوں میں اپنے گھر کی اصلاح کا خاطر خواہ جذبہ، اس کی سچی لگن اور اس کی حقیقی تڑپ پیدا ہو جائے تو یقین کیجیے کہ آدھی سے زائد قوم خود بخود سدھر سکتی ہے۔

اگر کوئی دیندار شخص یہ سمجھتا ہے کہ میری اولاد خدا بیزاری کی جس راہ پر چل رہی ہے، حقیقت میں اس کے لیے وہی راہ راست ہے اور ہم نے اپنے گرد مذہب واخلاق کے بندھن باندھ کر غلطی کی تھی تو ایسے ''دیندار'' کے حق میں تو دنیا وآخرت دونوں کے خسارے پر ماتم کرنے کے سوا اور کیا کیا جا سکتا ہے؟ لیکن اگر آپ اس بات پر ایمان رکھتے ہیں کہ آپ کا دین دین برحق ہے اور مرنے کے بعد جزا وسزا کے مراحل پیش آنے والے ہیں تو پھر خدا کے لیے اپنی اولاد کو بھی اس جزا وسزا کے دن کے واسطے تیار کیجیے۔ اسے ضروری دینی تعلیم دلوائیے، اس کے ذہن کی شروع ہی سے ایسی تربیت کیجیے کہ اس میں نیکیوں کا شوق اور گناہوں سے نفرت پیدا ہو، اس کی صحبت اور اس کا ماحول درست رکھنے کا اہتمام کیجیے، اپنے گھروں کو تلاوت قرآن اور اسلاف امت کے تذکروں سے آباد کیجیے۔ گھر میں کوئی ایسا وقت نکالیے جس میں سارے گھر والے اجتماعی طور پر دینی کتب کا مطالعہ کریں، اپنے ذاتی عمل کو ایسا دلکش بنائیے کہ اولاد اس کی تقلید کرنے میں فخر محسوس کرے۔ اپنے اہل وعیال اور اقارب واحباب کے حق میں اللہ تعالیٰ سے دعائیں کیجیے کہ اللہ تعالیٰ انہیں صراط مستقیم پر گامزن ہونے اور رہنے کی توفیق عطا فرمائے۔ اس کے بعد بھی ہو سکتا ہے کہ چند مثالیں ایسی باقی رہ جائیں جو اپنی بدخمیری کی

وجہ سے اصلاح پذیر نہ ہوسکیں، لیکن یقین ہے کہ اگر اس مقصد کے لیے اتنا اہتمام کرلیا گیا تو نئی نسل کی ایک بھاری اکثریت راہ راست پر آ جائے گی۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کی محنت اور کوشش میں برکت دی ہے اور دین کی دعوت و تبلیغ میں جو محنت کی جائے اس کی کامیابی کا خصوصی وعدہ کیا گیا ہے۔ اس لیے ناممکن ہے کہ اپنے گھر کی اصلاح کی یہ کوشش بالکل بارآور نہ ہو۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

محمد تقی عثمانی

۲۵ ربیع الاول ۱۴۰۳ھ

مضمون:۳۱

ووٹ کی اسلامی حیثیت

ماضی کی گندی سیاست نے الیکشن اور ووٹ کے لفظوں کو اتنا بدنام کر دیا ہے کہ ان کے ساتھ مکر و فریب، جھوٹ، رشوت اور دغابازی کا تصور لازم ذات ہو کر رہ گیا ہے، اسی لیے اکثر شریف لوگ اس جھنجھٹ میں پڑنے کو مناسب ہی نہیں سمجھتے اور یہ غلط فہمی تو بے حد عام ہے کہ الیکشن اور ووٹوں کی سیاست کا دین و مذہب سے کوئی واسطہ نہیں، اس سلسلے میں ہمارے معاشرے کے اندر چند در چند غلط فہمیاں پھیلی ہوئی ہیں۔ یہاں ان کا ازالہ بھی ضروری ہے۔

پہلی غلط فہمی تو سیدھے سادے لوگوں میں اپنی طبعی شرافت کی وجہ سے پیدا ہوئی ہے۔ اس کا منشاء اتنا برا نہیں، لیکن نتائج بہت برے ہیں، وہ غلط فہمی یہ ہے کہ آج کی سیاست مکر و فریب کا دوسرا نام بن چکی ہے، اس لیے شریف آدمیوں کو نہ سیاست میں کوئی حصہ لینا چاہیے، نہ الیکشن میں کھڑا ہونا چاہیے اور نہ ووٹ ڈالنے کے خرخشے میں پڑنا چاہیے۔

یہ غلط فہمی خواہ کتنی نیک نیتی کے ساتھ پیدا ہوئی ہو، لیکن بہر حال غلط اور ملک و ملت کے لیے سخت مضر ہے، ماضی میں ہماری سیاست بلاشبہ مفاد پرست لوگوں کے ہاتھوں گندگی کا ایک تالاب بن چکی ہے، لیکن جب تک کچھ صاف ستھرے لوگ، اسے پاک کرنے کے لیے آگے نہیں بڑھیں گے، اس گندگی میں اضافہ ہی ہوتا چلا جائے گا اور پھر ایک نہ ایک دن یہ نجاست خود ان کے گھروں تک پہنچ کر رہے گی۔ لہٰذا عقلمندی اور شرافت کا تقاضا یہ نہیں ہے کہ سیاست کی اس گندگی کو دور دور سے برا کہا جاتا رہے، عقلمندی کا تقاضا یہ ہے کہ سیاست کے میدان کو ان لوگوں کے ہاتھ سے چھیننے کی کوشش کی جائے جو مسلسل اسے گندا کر رہے ہیں۔

پھر آئندہ ماہ کے انتخابات محض چند انتظامی نوعیت کی تبدیلیوں کے لیے منعقد

ہو رہے ہیں۔ یہ پورے ملک کی زندگی کا ایک انقلابی موڑ ہے جس میں ملک وملت کی قسمت کا فیصلہ ہونا ہے۔ ان انتخابات میں دو مختلف نظریئے اور دو متحارب نظام زندگی ٹکرائیں گے، ایک کا کہنا یہ ہے کہ پاکستان محض ایک معاشی ضرورت کے تحت بنا تھا۔ اس کا کوئی مستقل نظریہ نہیں ہے، اس کائنات پر حکومت انسانی خواہشات کی ہے، وہی اچھے برے کا فیصلہ کرے گی اور وقت کے لحاظ سے زندگی کا جو دستور بھی سمجھ میں آجائے گا، اسی کے مطابق زندگی کو ڈھال لیا جائے گا اور دوسرے کا دعویٰ یہ ہے کہ اس کائنات پر حاکمیت صرف اللہ کی ہے، اچھے برے کا فیصلہ کرنے والا وہی ہے، پاکستان اسی کے نام سے بنا تھا، یہاں اسی کا قانون چلے گا۔ اسی کی بات مانی جائے گی اور سیاست و معیشت سے لے کر پرائیویٹ زندگی تک ہر معاملے میں اسی کے احکام واجب الاطاعت ہوں گے۔

ان حالات میں جب کہ لڑائی اسلام اور لادینیت کی اور پاکستان کی بقاء وفنا کی ہے، کسی بھی باشعور شخص کے لیے غیر جانبدار رہنے کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ اس وقت ہر مسلمان کا فرض ہے کہ وہ اپنی ساری توانائیاں اسلامی قوتوں کو مدد پہنچانے میں صرف کرے۔ اس موقع پر خاموش بیٹھنا بھی ایسا ہی جرم ہے جیسا دشمن کو تقویت پہنچانا۔

حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ سرور کونین صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

الناس إذا رأوا الظالم فلم ياخذوا على يديه أوشک أن يعمهم الله بعقاب

(جمع الفوائد ص ۵۱ ج ۲ بحوالہ ابو داؤد و ترمذی)

''اگر لوگ ظالم کو دیکھ کر اس کا ہاتھ نہ پکڑیں تو کچھ بعید نہیں کہ اللہ تعالیٰ ان سب پر اپنا عذاب عام نازل فرمائیں۔''

اگر آپ کھلی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں کہ ظلم ہو رہا ہے اور انتخابات میں سرگرم حصہ لے کر اس ظلم کو کسی نہ کسی درجے میں مٹانا آپ کی قدرت میں ہے تو اس حدیث کی رو سے یہ آپ کا فرض ہے کہ خاموش بیٹھنے کے بجائے ظالم کا ہاتھ پکڑ کر اس ظلم کو روکنے کی مقدور بھر کوشش کریں۔

بہت سے دیندار لوگ سمجھتے ہیں کہ اگر ہم اپنا ووٹ استعمال نہیں کریں گے تو اس سے کیا نقصان ہوگا؟ لیکن سنئے کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کیا ارشاد فرماتے ہیں؟

حضرت حنیف رضی اللہ عنہ سے مسند احمد میں روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

من اذل عنده مومن فلم ينصره وهو يقدر على أن ينصره أذله الله على ر وس الخلائق

(ایضاً ص ۵۱۔ ج ۲)

''جس شخص کے سامنے کسی مومن کو ذلیل کیا جارہا ہو اور وہ اس کی نصرت کرنے پر قدرت رکھنے کے باوجود اس کی مدد نہ کرے تو اللہ تعالیٰ اسے برسرِ عام رسوا کرے گا۔''

شرعی نقطہ نظر سے ووٹ کی حیثیت ''شہادت'' (گواہی) کی سی ہے اور جس طرح جھوٹی گواہی دینا حرام اور ناجائز ہے اسی طرح ضرورت کے موقع پر شہادت کو چھپانا بھی حرام ہے۔ قرآن کریم کا ارشاد ہے:

ولا تكتموا الشهادة ومن يكتمها فإنه اثم قلبه

''اور تم...... گواہی کو نہ چھپاؤ اور جو شخص اس گواہی کو چھپائے، اس کا دل گناہ گار ہے۔''

اور حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

من كتم شهادة اذا دعى اليها كان كمن شهد بالزور. (جمع الفوائد۔ بحوالہ طبرانی ص ۶۲ ج ۱)

''جس کسی کو شہادت کے لیے بلایا جائے، پھر وہ اسے چھپائے تو وہ ایسا ہے جیسے جھوٹی گواہی دینے والا۔''

بلکہ گواہی دینے کے لیے تو اسلام نے اس بات کو پسند کیا ہے کہ کسی کے مطالبہ کرنے سے پہلے ہی انسان اپنا یہ فریضہ ادا کردے اور اس میں کسی کی دعوت یا ترغیب کا انتظار بھی نہ کرے، حضرت زید بن خالد رضی اللہ تعالیٰ عنہ روایت کرتے ہیں کہ

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

ألا اخبركم بخير الشهداء الذى يأتى بشهادته قبل ان يسألها. (ایضاً ص:۲۶۱، ج ا بحوالہ مالک ومسلم وغیرہ)

"کیا میں تمہیں نہ بتاؤں کہ بہترین گواہ کون ہے؟ وہ شخص جو اپنی گواہی کسی کے مطالبہ کرنے سے پہلے ہی ادا کردے۔"

ووٹ بلاشبہ ایک شہادت ہے، قرآن وسنت کے یہ تمام احکام اس پر بھی حاوی ہوتے ہیں، لہٰذا ووٹ کو محفوظ رکھنا دینداری کا تقاضا نہیں، اس کا زیادہ سے زیادہ صحیح استعمال کرنا ہر مسلمان کا فرض ہے۔ یوں بھی سوچنے کی بات ہے کہ اگر شریف، دیندار اور معتدل مزاج کے لوگ انتخابات کے تمام معاملات سے بالکل یکسو ہو کر بیٹھ جائیں تو اس کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ وہ یہ پورا میدان، شریروں، فتنہ پردازوں اور بے دین افراد کے ہاتھوں میں سونپ رہے ہیں، ایسی صورت میں کبھی بھی یہ توقع نہیں کی جاسکتی کہ حکومت نیک اور اہلیت رکھنے والے افراد کے ہاتھ میں آئے، اگر دیندار لوگ سیاست سے اتنے بے تعلق ہو کر رہ جائیں تو پھر انہیں ملک کی دینی اور اخلاقی تباہی کا شکوہ کرنے کا بھی حق نہیں پہنچتا کیونکہ اس کے ذمہ دار وہ خود ہوں گے اور ان کے احکام کا سارا عذاب وثواب ان ہی کی گردن پر ہوگا اور خود ان کی آنے والی نسلیں اس شر وفساد سے کسی طرح محفوظ نہیں رہ سکیں گی۔ جس پر بند باندھنے کی انہوں نے کوئی کوشش نہیں کی۔

انتخابات کے سلسلے میں ایک دوسری غلط فہمی پہلی سے زیادہ سنگین ہے، چونکہ دین کو لوگوں نے صرف نماز روزے کی حد تک محدود سمجھ لیا ہے اس لیے سیاست ومعیشت کے کاروبار کو وہ دین سے بالکل الگ تصور کر کے یہ سمجھتے ہیں کہ یہ سارے معاملات دین کی گرفت سے بالکل آزاد ہیں۔ چنانچہ بہت سے لوگ ایسے بھی دیکھے گئے ہیں جو اپنی نجی زندگی میں نماز روزے کے اور وظائف اوراد تک کے پابند ہوتے ہیں، لیکن نہ انہیں خرید وفروخت کے معاملات میں حلال وحرام کی فکر ہوتی ہے، نہ وہ نکاح وطلاق اور برادریوں کے تعلقات میں دین کے احکام کی کوئی پرواہ کرتے ہیں۔

ایسے لوگ انتخابات کو بھی ایک خالص دنیاوی سودا سمجھ کر اس میں مختلف بدعنوانیوں

کو گوارا کر لیتے ہیں اور یہ نہیں سمجھتے کہ ان سے کوئی بڑا گناہ سرزد ہوا ہے۔ چنانچہ بہت سے لوگ اپنا ووٹ اپنی دیانتدارانہ رائے کے بجائے محض ذاتی تعلقات کی بنیاد پر کسی نااہل کو دے دیتے ہیں۔ وہ دل میں خوب جانتے ہیں کہ جس شخص کو ووٹ دیا جا رہا ہے وہ اس کا اہل نہیں، یا اس کے مقابلے میں کوئی دوسرا شخص اس کا زیادہ حقدار ہے، لیکن صرف دوستی کے تعلق، برادری کے رشتے یا ظاہری لحاظ و مروت سے متاثر ہو کر وہ اپنے ووٹ کو غلط جگہ استعمال کر لیتے ہیں اور کبھی خیال بھی نہیں آتا کہ شرعی و دینی لحاظ سے انہوں نے کتنے بڑے جرم کا ارتکاب کیا ہے، جیسا کہ اوپر عرض کیا جا چکا ہے۔ ووٹ ایک ''شہادت'' ہے اور شہادت کے بارے میں قرآن کریم کا ارشاد یہ ہے:

واذا قلتم فاعدلوا ولو كان ذا قربى

''اور جب کوئی بات کہو تو انصاف کرو خواہ وہ شخص (جس کے خلاف بات کہی جا رہی ہے) تمہارا قرابت دار ہی کیوں نہ ہو۔''

جب کسی شخص کے بارے میں ضمیر اور دیانت کا فیصلہ یہ ہو کہ وہ ووٹ کا مستحق نہیں ہے، یا کوئی دوسرا شخص اس کے مقابلے میں زیادہ اہلیت رکھتا ہے تو اس وقت محض ذاتی تعلقات کی بناء پر اسے ووٹ دے دینا ''جھوٹی گواہی'' کے ذیل میں آتا ہے اور قرآن کریم میں جھوٹی گواہی کی مذمت اتنی شدت کے ساتھ کی گئی ہے کہ اسے بت پرستی کے ساتھ ذکر فرمایا گیا ہے۔ ارشاد ہے:

فاجتنبوا الرجس من الاوثان واجتنبوا قول الزور

''پس تم پرہیز کرو بتوں کی نجاست سے اور پرہیز کرو جھوٹی بات سننے سے۔''

اور حدیث میں سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے متعدد مواقع پر جھوٹی گواہی کو اکبر الکبائر میں شمار کر کے اس پر سخت وعیدیں ارشاد فرمائی ہیں۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ''کیا میں اکبر الکبائر (بڑے بڑے گناہ) نہ بتاؤں؟ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرانا اور والدین کی نافرمانی کرنا اور خوب اچھی طرح سنو! جھوٹی گواہی! جھوٹی بات!''

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ:

''آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تکیہ لگائے ہوئے بیٹھے تھے، جب جھوٹی گواہی کا ذکر آیا تو اٹھ کر بیٹھ گئے اور ''جھوٹی گواہی'' کا لفظ بار بار ارشاد فرماتے رہے، یہاں تک کہ ہم دل میں کہنے لگے کہ کاش! آپ صلی اللہ علیہ وسلم خاموش ہو جائیں۔''

(بخاری ومسلم، جمع الفوائد ص ۱۶۲، ج ۲)

یہ وعیدیں تو صرف ووٹ کے اس غلط استعمال پر صادق آتی ہیں جو محض ذاتی تعلقات کی بناء پر دیا گیا ہو اور روپے پیسے لے کر کسی نااہل کو ووٹ دینے میں جھوٹی گواہی کے علاوہ رشوت کا عظیم گناہ بھی ہے۔

لہٰذا ووٹ ڈالنے کے مسئلہ کو ہرگز یوں نہ سمجھا جائے کہ یہ ایک خالص دنیوی مسئلہ ہے اور دین سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ یقین رکھئے کہ آخرت میں ایک ایک شخص کو اللہ کے سامنے کھڑا ہونا ہے اور اپنے دوسرے اعمال کے ساتھ اس عمل کا بھی جواب دینا ہے کہ اس نے اپنی ''شہادت'' کا استعمال کس حد تک دیانتداری کے ساتھ کیا ہے۔

بعض حضرات یہ بھی سوچتے ہیں کہ اگر نااہل کو ووٹ دینا گناہ ہے تو ہم کون سے پاکباز ہیں؟ ہم صبح سے لے کر شام تک بے شمار گناہوں میں ملوث رہتے ہیں۔ اگر اپنے گناہوں کی طویل فہرست میں ایک اور گناہ کا اضافہ ہو جائے تو بھی کیا حرج ہے؟

لیکن خوب سمجھ لیجیے کہ یہ نفس وشیطان کا سب سے بڑا دھوکہ ہے۔ اول تو انسان اگر ہر گناہ کے ارتکاب کے وقت یہی کچھ سوچا کرے تو وہ کبھی کسی گناہ سے نہیں بچ سکتا، اگر کوئی شخص تھوڑی سی گندگی میں ملوث ہو جائے تو اس کو اس سے پاک ہونے کی فکر کرنی چاہیے نہ یہ کہ وہ غلاظت کے کسی تالاب میں چھلانگ لگا دے۔

دوسرے گناہوں کی نوعیتوں میں بھی بڑا فرق ہے۔ جن گناہوں کے نتائج بد پوری قوم کو بھگتنے پڑیں: ان کا معاملہ پرائیویٹ گناہوں کے مقابلے میں بہت سخت ہے۔ انفرادی نوعیت کے جرائم، خواہ اپنی ذات میں کتنے ہی گھناؤنے اور شدید ہوں، لیکن ان کے اثرت دو چار افراد سے آگے نہیں بڑھتے، اس لیے ان کی تلافی بھی عموماً اختیار میں ہوتی ہے، ان سے توبہ استغفار کر لینا بھی آسان ہے اور ان کے معاف ہو جانے کی امید بھی ہر وقت کی جا سکتی ہے۔ اس کے برخلاف جس گناہ کا برا نتیجہ پورے ملک اور پوری

قوم نے بھگتنا ہو، اس کی تلافی کی کوئی صورت نہیں۔ یہ تیر کمان سے نکلنے کے بعد واپس نہیں آسکتا۔ اس لیے اگر کسی وقت انسان اس بد عملی سے آئندہ کے لیے توبہ کرلے تو کم از کم ماضی کے جرم سے عہدہ برآ ہونا بہت مشکل ہے اور اس کے عذاب سے رہائی کی امید بہت کم۔

اس حیثیت سے یہ گناہ چوری، ڈاکہ، زنا کاری اور دوسرے تمام گناہوں سے شدید تر ہے اور اسے دوسرے جرائم پر قیاس نہیں کیا جا سکتا۔

یہ درست ہے کہ ہم صبح و شام بیسیوں گناہوں کا ارتکاب کرتے ہیں۔ لیکن یہ سب گناہ ایسے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کسی وقت توبہ کی توفیق بخشے تو معاف بھی ہو سکتے ہیں اور ان کی تلافی بھی کی جا سکتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ ہم اپنی گردن ایک ایسے گناہ میں پھنسا لیں جس کی تلافی ناممکن اور جس کی معافی بہت مشکل ہے۔

بعض لوگ یہ بھی سوچتے ہیں کہ لاکھوں ووٹوں کے مقابلے میں ایک شخص کے ووٹ کی کیا حیثیت ہے؟ اگر وہ غلط استعمال بھی ہو جائے تو ملک و قوم کے مستقبل پر کیا اثر انداز ہو سکتا ہے؟

لیکن اول تو اگر ہر شخص ووٹ ڈالتے وقت یہی سوچنے لگے تو ظاہر ہے کہ پوری آبادی میں کوئی ایک ووٹ بھی صحیح استعمال نہیں ہو سکے گا۔ پھر ووٹوں کی گنتی کا جو نظام ہمارے یہاں رائج ہے اس میں صرف ایک ان پڑھ جاہل شخص کا ووٹ بھی ملک و ملت کے لیے فیصلہ کن ہو سکتا ہے۔ اگر ایک بے دین، بے عقیدہ اور بد کردار کے بیلٹ بکس میں صرف ایک ووٹ دوسروں سے زیادہ چلا جائے تو وہ کامیاب ہو کر پوری قوم پر مسلط ہو جائے گا۔ اس طرح بعض اوقات صرف ایک جاہل اور ان پڑھ انسان کی معمولی غفلت، بھول چوک یا بد دیانتی بھی پورے ملک کو تباہ کر سکتی ہے ا لیے مروجہ نظام میں ایک ایک ووٹ قیمتی ہے اور یہ ہر فرد کا شرعی، اخلاقی، قومی اور ملی مہ ہے کہ وہ اپنے ووٹ کو اتنی ہی توجہ اور اہمیت کے ساتھ استعمال کرے، جس کا وہ فی الواقعہ ہے۔

مضمون: ۳۲

ترکی جاگ رہا ہے

حال ہی میں امریکہ کے ایک معروف جریدہ ''کرسچین سائنس مانیٹر'' میں ایک یہودی نامہ نگار سام کوھن (مقیم ترکی) کا ایک مضمون شائع ہوا ہے جس کا متن پاکستان کے بعض انگریزی اخبارات ورسائل نے بھی نقل کیا ہے۔ یہ مضمون چونکہ پورے عالم اسلام کو مختلف حیثیتوں سے دعوت فکر دیتا ہے اس لیے ہم آج کی مجلس میں پہلے اس مضمون کا ترجمہ اور پھر کچھ اپنی گذارشات پیش کریں گے۔

اس مضمون کا عنوان ہے:

ترکی میں اسلام کا احیاء

تجدد پسندوں کو خطرہ

اس عنوان کے تحت سام کوھن لکھتا ہے کہ:

ترکی کے بہت سے باشندے آج کل احیاء اسلام کی روز افزوں مہم سے پیدا ہونے والے ممکنہ نتائج کے بارے میں بڑی سنجیدگی سے غور وفکر کر رہے ہیں، وہ اس بات سے پریشان ہیں کہ یہ تحریک کہیں ترکی کو دو کیمپوں میں تقسیم کر کے ملک کے استحکام اور پارلیمانی جمہوریت کے لیے خطرہ نہ بن جائے۔ تجدد پسند اور آزاد خیال حلقے یہ محسوس کر رہے ہیں کہ جمہوریہ ترکیہ کے بانی کمال اتاترک نے چالیس سال پہلے ترکی معاشرے کو جن لادینی بنیادوں پر کھڑا کیا تھا، آج کی یہ اسلامی مہم ان کے لیے ایک خطرہ ہے۔ لیکن سلیمان ڈیمرل کی رجعت پسند حکومت اور ان کی حکمران جماعت (جسٹس پارٹی) کسی خطرے کے وجود سے انکار کر رہی ہے۔

جب تک ترکی میں کمال اتاترک کا راج اور ایک جماعتی نظام جاری تھا اس وقت تک اسلامی تعصب کی اس تحریک کو زبان کھولنے کا کوئی موقعہ نہ مل سکا، لیکن جب ۱۹۵۰ء میں پارلیمانی جمہوریت مکمل طور سے بحال ہوئی تو رجعت پسندی کے رجحانات سطح پر

آ گئے۔

اس وقت ملک پر عدنان مندریس کی ڈیموکریٹک پارٹی برسر اقتدار تھی جس نے رجعت پسند دیہاتی اکثریت سے ووٹ اور حمایت حاصل کرنے کے لیے ''مذہبی تعصب'' کو گوارا کرلیا۔ لیکن ۱۹۶۰ء کے فوجی انقلاب نے عدنان مندریس کی پارٹی کا تختہ الٹ دیا اور ایک سال بعد عدنان مندریس کو پھانسی پر لٹکا دیا۔ اب جو جماعت (جسٹس پارٹی) ترکی میں برسر اقتدار ہے اسے عام طور سے (عدنان مندریس) کی ڈیموکریٹک پارٹی کا قدرتی وارث سمجھا جاتا ہے اور آج اس پر بھی یہ الزام ہے کہ وہ بھی عدنان مندریس کی قائم کی ہوئی راہ پر گامزن ہے۔

اتاترک کی اصلاحات پر حملے:

واقعہ یہ ہے کہ جو لوگ ترکی میں احیاء اسلام کی وکالت کر رہے ہیں ان کے حوصلے موجودہ حکومت کے روادارانہ طرز عمل سے بہت بڑھے ہوئے ہیں۔ بہت سی مسجدوں کے امام مسلمان اپنی تقریروں میں اتاترک کی اصلاحات پر حملے کرنے لگے ہیں۔ بعض لوگوں نے تو کھلم کھلا شریعت (اسلامی قوانین) کو دوبارہ نافذ کرنے کا مطالبہ کیا ہے اور دوسرے بہت سے لوگوں نے منی اسکرٹ کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے عورتوں پر زور دیا ہے کہ وہ اپنے بدن اور اپنے سروں کو ''خوب اچھی طرح'' ڈھانک کر رکھیں۔

اس ملک میں جابجا اتاترک کے جو مجسمے اور تصویریں نصب ہیں ان کے خلاف بھی آوازیں اٹھنے کی متعدد خبریں ملی ہیں۔ حالیہ چند مہینوں میں بہت سے رجعت پسند اخبارات اور رسائل کیڑے مکوڑوں کی طرح اچانک میدان میں آ دھمکے ہیں اور ان میں سے بعض نے علی الاعلان دوبارہ مذہبی حکومت کی طرف لوٹنے کا مطالبہ کیا ہے۔

ملک میں بہت سی کٹر مذہبی تنظیموں کی سرگرمیاں بھی بڑھ رہی ہیں، یہ تنظیمیں ایسے پمفلٹ اور اشتہار تقسیم کرتی ہیں جنھیں موجودہ دستور کو بدلنے اور منجملہ اور ترمیمات کے خاص طور سے ''خلافت'' کو بحال کرنے کا مطالبہ کیا گیا ہے۔ (خلافت ملک کے روحانی قائد کا وہ عہدہ تھا جسے ۱۹۲۴ء میں ختم کیا گیا تھا) ان تنظیموں کے بارے میں عموماً یہ سمجھا جارہا ہے کہ وہ ہمسایہ عرب ملکوں کی اخوان المسلمین جیسی جماعتوں کی شہ پر قائم ہوئی

ہیں۔

بہت سے دیہات میں مسلمان اساتذہ (جنہیں یہاں ''خوجہ'' کہتے ہیں) بڑی سرگرمی کے ساتھ حکومت کے لادینی اسکولوں کا مقابلہ کر رہے ہیں۔ اصل مشکل یہ ہے کہ تمام چھوٹے علاقوں میں سرکاری اسکولوں کی تعداد اتنی کم ہے کہ وہ وہاں کی ضروریات کے لیے کافی نہیں اور اس طرح ان مذہبی دیوانوں کو اپنے لیے راستہ کھلا مل گیا ہے اور بہت سے بچے انہی ''خوجوں'' کے قائم کیے ہوئے اسکولوں کا رخ کر رہے ہیں۔

اس مہینے کے شروع کی بات ہے کہ انقرہ یونیورسٹی کے شعبہ اسلامیات میں ایک لڑکی نے کلاس میں دوپٹہ سر پر اوڑھنے پر اصرار کیا تو اسے کلاس سے نکال دیا گیا۔ اس واقعہ پر طلباء نے ہڑتال شروع کردی، اس کا مطالبہ یہ تھا کہ فیکلٹی کا ''ڈین'' مستعفی ہوجائے، انہوں نے اسے ''طلباء کا دشمن'' بھی قرار دیا۔ یہ واقعہ عرصہ تک بہت سے ترکی اخباروں کا موضوع گفتگو بنا رہا اور اب جسٹس پارٹی کے بعض ارکان نے لڑکی کی حمایت کرنے کے لیے اس مسئلے کو پارلیمنٹ میں بھی اٹھایا ہے۔

سبز جھنڈے لہراتے ہیں:

کئی تنظیمیں ایسی بھی ہیں جو اپنے آپ کو نیشلسٹ اور ''روایت پرست'' کہتی ہے، انہوں نے کمیونزم اور ملک میں بائیں بازو کی بڑھتی ہوئی سرگرمیوں کے خلاف احتجاج کرنے کے بہانے عوامی مظاہرے بھی شروع کردیئے ہیں۔ انقرہ اور استنبول میں جو مظاہرے ہوئے ان میں ان لوگوں نے سبز پرچم ہاتھ میں لے کر مارچ کیا۔ (سبز پرچم مسلمانوں کے رنگ کی نمائندگی کرتا ہے) اور یہ نعرے لگائے کہ:

''ترکی میں اسلام ہی سربلند ہوگا''

ان مظاہروں کا رخ کمیونزم سے زیادہ لادینیت اور تجدد پسندی کے خلاف تھا۔

اس کے علاوہ اس مہینے کے شروع میں بورسہ شہر کے اندر دائیں بازو کی مختلف تنظیموں کی طرف سے جو کانفرنس منعقد ہوئی اس نے بھی اتاترک کی اصلاحات اور ۱۹۶۰ء کے انقلاب کے خلاف اپنے جذبات کا اظہار کیا۔

مسٹر سام کوھن کے اس مضمون کو ہم نے اس لیے بعینہ نقل کردیا ہے کہ یہ عالم اسلام کے ارباب فکر کے لیے اپنے دامن میں عبرت وموعظت اور فکر ونظر کے بہت سے پہلو رکھتا ہے۔ اس سے نہ صرف یہ حقیقت کھل کر سامنے آتی ہے کہ ترک عوام کے اصل جذبات کیا ہیں؟ بلکہ یہ بات بھی پوری طرح واشگاف ہوجاتی ہے کہ عالم اسلام کی وہ کونسی تحریکیں ہیں جن کی پیٹھ مغرب اور پوری دشمن اسلام دنیا تھپکتی رہتی ہے اور وہ کون لوگ ہیں جو اس کی نظر میں کانٹے کی طرح کھٹکتے ہیں۔

ہم ذیل میں اس مضمون کے بارے میں بعض ضروری گذارشات مختصراً پیش کرتے ہیں۔

بیسویں صدی کی ابتداء میں پورے عالم اسلام کو مغربی افکار ونظریات کے جس سیلاب کا مقابلہ کرنا پڑا، اس کے آگے بظاہر سب سے پہلے ہتھیار ڈال دینے والا ملک ترکی تھا، خلافت عثمانیہ اس سیلاب کے مقابلے لیے آخری بند کا کام دے رہی تھی، چنانچہ اسی کو مغرب کی دراز دستیوں کا سب سے پہلا نشانہ بننا پڑا اور جب خلافت کے نظام کو تہس نہس کرکے مصطفےٰ کمال پاشا اور اس کی جماعت برسر اقتدار آئی تو اس نے پورے جبر واستبداد کے ساتھ ترکوں کے دینی شعور اور اسلامی جذبہ کو کچلنے کی کوشش کی۔ شرعی اداروں اور محکموں سے اسلامی قانون کو دیس سے نکال کر سوئزر لینڈ سے دیوانی اور اٹلی سے فوجداری قانون درآمد کیا، دینی تعلیم کو ممنوع کردیا گیا، پردہ کو خلاف قانون قرار دے دیا، مخلوط تعلیم شروع کردی، عربی حروف کی جگہ لاطینی رسم الخط جاری کیا، عربی میں اذان کو ممنوع قرار دے دیا۔ غرض یہ کہ اپنا سارا زور اس بات پر صرف کردیا کہ ترک عوام سر سے لیکر پاؤں تک مغرب کی ''نقل مطابق اصل'' بن کر رہ جائیں۔ انتہا یہ ہے کہ عوام کے سروں سے ترکی ٹوپی اتروا کر انہیں ہیٹ پہنانے کے خبط نے نہ جانے کتنے بے گناہوں کو تختہ، دار پر لٹکا دیا اور اس انگریزی ٹوپی کی خاطر نہ جانے کتنے طویل عرصے تک ترکی کے کوچہ وبازار میدان جنگ بنے رہے۔

کمال اتاترک کا خیال غالباً یہ تھا کہ انگریزی ٹوپی کے ذریعہ ترکوں کے سروں میں انگریزی دماغ بھی منتقل ہوجائے گا اور جس جبر واستبداد کے ساتھ اسلامی شعور کو فنا کرنے کی کوششیں جاری تھیں، ان کے پیش نظر اس کا یہ خیال بے بنیاد بھی نہ تھا، لیکن شاید

اسے یہ معلوم نہ ہو کہ

اسلام کی فطرت میں قدرت نے لچک دی ہے

اسلام کی محبت وعظمت کا جذبہ جو ترکوں کی رگوں میں خون حیات بن کر دوڑتا تھا، کچھ عرصے کے لیے دب تو گیا، لیکن سرے سے مٹ نہ سکا۔ ٹھیک اس وقت بھی جب ترکی میں کمال اتاترک کی آمریت اپنے شباب پر تھی اور بیرونی دنیا یہ سمجھ رہی تھی کہ اب ترکی میں شاید اسلامی شعور کا کوئی نشان باقی نہ رہا ہو۔ مظلوم ومقہور ترکی عوام کے اس دینی جذبے کی جھلکیاں اس وقت بھی اپنی مثال نظر آتی تھیں اور حالات کا حقیقت پسندانہ جائزہ لینے والے اس بات سے بے خبر نہ تھے، ترکی کی معروف خاتون خالدہ ادیب خانم نے (جو خود بھی بڑی حد تک تجدد پسندی کی طرف مائل تھیں) ۱۹۳۵ء کے لگ بھگ اپنی کتاب Conflict of cast and wast in Jurkey میں لکھا تھا کہ

> ''فی الحال ترکی میں سطح پر تو یہی نظر آتا ہے کہ مغرب کو وہاں فتح نصیب ہوئی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ ترکوں کی روح میں اسلام اب بھی ایک اندر اندر بہتے ہوئے دھارے کی طرح موجود ہے۔''
>
> (ص ۲،۲ طبع دوم ۱۹۶۳ء)

''یہ اندر اندر بہتا ہوا دھارا'' اب رفتہ رفتہ پھر سطح پر آرہا ہے۔ ۱۹۵۰ء میں جو پہلے انتخابات ہوئے ان میں کمال اتاترک اور عصمت انونو کی پارٹی کو سخت شکست کا سامنا کرنا پڑا اور اس کی جگہ عدنان مندریس کی ڈیموکریٹک پارٹی برسر اقتدار آئی جس نے اسلامی سرگرمیوں پر لگی ہوئی پابندیوں کو رفتہ رفتہ اٹھا دیا اس کے بعد ایک مختصر عرصے کے لیے عصمت انواو کی ری پبلکن پارٹی پھر زبردستی ملک پر قابض ہوئی اور اس نے عدنان مندریس جیسے قائد کو تختہ دار پر لٹکایا، لیکن اب پھر وہاں جسٹس پارٹی کی حکومت ہے جو اسلام کے معاملے میں عدنان مندریس کی پیروی کر کے عوام کے دل کی دھڑکنوں کی ترجمانی کر رہی ہے۔ ترکی کے موجودہ صدر جناب جودت صونائی نے حال ہی میں اپنے عوام کو عیدالضحیٰ کے موقعہ پر پیغام دیتے ہوئے کہا تھا کہ:

''حالات کا تقاضا ہے کہ ہم تمام غیر اسلامی نظریات اور باطل

تحریکات کے سامنے سینہ سپر ہو جائیں، صرف دین اسلام دین و حدت ہے، امت اسلامیہ کا دستور صرف قرآن کریم ہے، حالات ہمیں مجبور کر رہے ہیں کہ ہم سب قرآن کریم کو مضبوطی سے تھام لیں اور ترکی قوم خدا کے فضل سے اسلام کی سچی دعوت کی پوری طرح حفاظت کرنے کی اہل ہے''۔

(ماہنامہ الحق اکوڑہ خٹک صفر ۸۸ھ بحوالہ، روزنامہ البلاد مکہ مہ شمارہ ۲۰ ذی الحجہ ۱۳۸۷ھ)

حال ہی میں ترکی کے ایک معروف عالم دین دار العلوم تشریف لائے تو انہوں نے بتایا کہ جس ملک میں کبھی کمال اتاترک نے قرآن کریم کو اٹھا کر شیخ الاسلام کے سر پر دے مارا تھا، آج اسی ملک میں قرآن وسنت کی تعلیم کے لیے ہزاروں کی تعداد میں مدارس قائم ہیں، یہاں تک کہ نئی نسل کی وہ نوجوان جو کبھی ضیاء گوک الپ کی تحریروں سے متاثر تھے آج وہ بھی یہ محسوس کر رہے ہیں کہ ''جدت'' کے نام پر ان کی ساتھ کتنا بڑا فراڈ کھیلا گیا ہے۔

ترکی کے یہ بدلتے ہوئے حالات جہاں ہمارے لیے مسرت انگیز اور امید افزا ہیں وہاں ہمیں اپنے طرز عمل کو متعین کرنے کے لیے گہرے غور وفکر کی دعوت بھی دیتے ہیں ترکی عالم اسلام کی وہ پہلی تجربہ گاہ تھی جہاں مغربی افکار کا سب سے پہلا تجربہ کیا گیا، وہاں مغربیت کی تحریک کو نظری میدان میں ضیاء گوک الپ جیسے فکری رہنما بھی میسر آئے اور سیاسی میدان میں کمال اتاترک جیسے انتہا پسند ڈکٹیٹر بھی اور اس طرح افہام وتفہیم سے لے کر جبر واستبداد تک کوئی طریقہ ایسا نہیں ہے جو مغربی تجدد کی تحریک نے اس ملک میں اختیار نہ کیا ہو اور چونکہ یہ ملک ایک طرف تمام عالم اسلام کے لیے نہ صرف سیاسی بلکہ جذباتی حیثیت سے بھی ایک مرکز کی حیثیت رکھتا تھا اور دوسری طرف یورپ سے جغرافیائی اعتبار سے بالکل ملا ہوا تھا، اس لیے اہل مغرب نے یہاں تجدد کی تحریک کو پروان چڑھانے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی، پھر کم وبیش تیس سال تک یہاں اسلامی شعور کو فنا کرنے کا ہر طریقہ آزمایا گیا اور بقول پروفیسر ٹائن بی:

''ہٹلر کے ہم عصر مصطفےٰ کمال اتاترک نے ایک زیادہ موزوں طریقہ اختیار کیا، ترکی ڈکٹیٹر کا مقصد اپنے ہم وطنوں کے ذہن

کو زبردستی مغربی تمدن کے سانچے میں ڈھالنا تھا اور انہوں نے کتابیں سوخت کرنے کے بجائے حروف تہجی کو بدل ڈالنے پر قناعت کرلی......اب کتابوں کے جلانے کی ضرورت ہی باقی نہیں ہی تھی کیونکہ وہ حروف تہجی جوان کی کنجی کی حیثیت رکھتے تھے وہی منسوخ کر دیئے گئے تھے، اب یہ ذخائر اطمینان کے ساتھ الماریوں میں بند پڑے رہ سکتے تھے، علاوہ چند سن رسیدہ علماء کے ان کو ہاتھ لگانے والا اب کوئی نہ تھا۔"

(مطالعہ تاریخ ص ۵۱۸، ۵۱۹، بحوالہ مولانا ابوالحسن علی ندوی: اسلامیت اور مغربیت ص ۶۷)

اس طرز عمل کے ذریعہ ترکی میں عرصہ دراز تک اسلام کی اصلی تعبیر کو (جسے ہمارے اہل تجدد رجعت پسندی کے نام سے یاد کرتے ہیں، کم از کم میدان عمل سے بالکل ہٹا دیا گیا تھا، چنانچہ چند سال پہلے تک وہاں تجدد کی بلاشرکت غیرے حکمرانی رہی اور اسے کسی رکاوٹ کے بغیر اپنے پورے حوصلے نکالنے کا موقعہ ملا۔

سوال یہ ہے کہ اس طویل عرصے میں تجدد کی بلاشرکت غیرے حکمرانی نے ترکی کو کیا دیا؟ کیا ترکی کے باشندوں کو پہلے سے زیادہ نہیں، پہلے جیسا امن وسکون اور سکھ چین نصیب ہوسکا؟

کیا اس عرصے میں وہاں کوئی نمایاں سائنسداں پیدا ہوا، کسی دوسرے علم وفن میں کوئی ایسی شخصیت ابھری جس نے فکر اور فلسفہ کے میدان میں کوئی نئی راہ نکالی ہو؟ کوئی ایسا مفکر سامنے آیا جس نے اس تہذیب میں کسی قابل قدر چیز کا اضافہ کیا ہو؟ کوئی ایسا صاحب دل پیدا ہوا جس نے اسے قبرص ہی کے مسئلے سے نجات دلادی ہو، کوئی ایسا قائد اسے میسر ہوا جس نے اسے اقوام عالم کی صف میں کوئی ممتاز جگہ عطا کی ہو؟ پھر سب سے بڑھ کر یہ کہ اس ملک کو جس کا سکہ کبھی کم وبیش ایک تہائی دنیا پر چلا کرتا تھا اس کی سابقہ سیاسی عظمت، بین الاقوامی وقار اور عالم اسلام کی قیادت کے منصب کا کوئی بدل نصیب ہوا؟

اگر ان سوالات کا جواب نفی میں ہے اور یقیناً نفی میں ہے، تو اس صورت حال سے اس کے سوا اور کیا نتیجہ نکلتا ہے کہ زندگی کے بنیادی مدائل اسلام اور مغرب کے درمیان

"مصالحت" کا کوئی امکان نہیں ہے۔ جس مصالحت کی تبلیغ تجدد کا مکتب فکر کر رہا ہے، اس نے عالم اسلام کو رکھتے ہوئے زخموں کے سوا کچھ نہیں دیا، وہ مسلمانوں کے حقیقی مسائل کو حل کرنے میں قطعی طور پر ناکام رہی ہے، اور تجدد" کی سب سے پہلی تجربہ گاہ نے اس حقیقت کو خوب اچھی طرح واشگاف کر دیا ہے کہ جو قوم اپنا ذاتی تشخص کھو کر اور اپنی خود داری کو پامال کر کے غیروں کی اندھی نقالی کی روش اختیار کرتی ہے وہ کبھی زندگی کی شاہراہ پر خود اعتمادی کے ساتھ قدم نہیں بڑھا سکتی اور حقیقت یہ ہے کہ اس کو ایک مستقل قوم کی حیثیت سے دنیا میں زندہ رہنے کا بھی حق کیوں رہے جبکہ وہ خود اس حق سے دستبردار ہو چکی ہو۔

اسی حقیقت کا شعور ہے جو آج ترکی کی عوام و حکام کو اپنی زندگی کی لائن تبدیل کر کے حقیقی اسلام کی آغوش میں پناہ لینے پر مجبور کر رہا ہے، ترکی کے یہ اقدامات ہر حقیقت پسند انسان کی طرف سے تحسین و آفرین کے مستحق ہیں اور ساتھ ہی ان کے واسطے سے ترک عوام و حکام کی یہ ہمدردانہ آواز ہمیں سنائی دے رہی ہے کہ ع

من نہ کردم، شما حذر بکنید

لیکن عالم اسلام کے لیے یہ خبریں کتنی مسرت انگیز کیوں نہ ہوں، غیر مسلم اور بالخصوص مغربی دنیا کے تیور اس پر بری طرح بگڑ رہے ہیں اور اسی کی ایک ہلکی سی جھلک مسٹر سام کوھن کے مذکورہ مضمون میں دیکھی جا سکتی ہے، اس مضمون کے ذریعہ آپ اسلام کے بارے میں مغرب کے ذہن کا بھی مطالعہ کر سکتے ہیں، اگر آپ بہ نظر غائر اس مضمون کو پڑھیں گے تو مندرجہ ذیل نتائج پر پہنچے بغیر نہ رہ سکیں گے:

۱۔ ایک طرف مضمون نگار اس بات کو تسلیم کرتا ہے کہ ملک کی اکثریت احیاء اسلام کی حامی ہے، اسی لیے عدنان مندریس کی پارٹی نے اکثریت کے ووٹ حاصل کرنے کے لیے مذہبی تعصب کو گوارا کیا تھا اور دوسری طرف وہ ترکی کو دو کیمپوں میں تقسیم کرنے اور جمہوریت کے لیے خطرہ بننے کا الزام بھی اسی "اکثریت" کو دیتا ہے...... یہ اس مغرب کا ذہن ہے جو "جمہوریت" کو جزو ایمان قرار دیتا ہے۔

۲۔ پھر وہ ۱۹۶۰ء کے انقلاب کے حوالے سے موجودہ حکومت کو عدنان مندریس کا

پیرو قرار سے کر اس پر اپنی ناراضی کا اظہار کرتا ہے کہ وہ ''احیاء اسلام کی وکالت کرنے والوں'' کے ساتھ کیوں رواداری برت رہی ہے؟ یہ اس مغرب کا اعتراض ہے جس کی زبان ''رواداری'' اور عدم ''مداخلت'' کی تبلیغ کرنے سے نہیں سوکھتی۔

۳۔ پھر اس مضمون کا بڑا ہی دلچسپ جملہ یہ ہے کہ:

''بعض لوگوں نے کھلم کھلا'' شریعت کو دوبارہ نافذ کرنے کا مطالبہ کیا ہے۔'' گویا یہ مطالبہ ایک ایسا جرم ہے جس کا کھلم کھلا' انجام دینا بنیادی حقوق انسانی کی خلاف ورزی ہے یہ اس مغرب کا ذہن ہے جسے ''آزادی تحریر و تقریر'' کی اہمیت کا بڑا احساس ہے۔

۴۔ ایک اور بات جو بہت زیادہ قابل توجہ ہے، مضمون نگار کا یہ ارشاد ہے کہ:

''انہوں نے کمیونزم اور ملک میں بائیں بازو کی بڑھتی ہوئی سرگرمیوں کی خلاف احتجاج کرنے کے بہانے عوامی مظاہرے بھی شروع کر دیئے ہیں .... ان لوگوں نے سبز پرچم ہاتھ میں لے کر مارچ کیا۔''

ملاحظہ فرمایئے کہ ''کمیونزم'' کا یہ حریف اس بات پر کسی مسرت کا اظہار نہیں کرتا کہ ان لوگوں نے کمیونزم کی بڑھتی ہوئی سرگرمیوں کے خلاف احتجاج کیا' اس کے بجائے اسے پریشانی اس بات سے ہے کہ انہوں نے سبز پرچم کیوں اٹھائے ہوئے تھے؟ اس سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ سرمایہ دار دنیا کو اصل خطرہ کمیونزم سے ہے یا اسلام سے .... اس موقعہ پر ہمیں اقبال مرحوم کی نظم ''ابلیس کی مجلس شوریٰ'' یاد آ رہی ہی جس میں ابلیس نے اپنے چیلوں سے بڑے پتہ کی بات کہی تھی کہ ؏

مزدکیت فتنہ فرد نہیں، اسلام ہے

۵۔ آخر میں اس مضمون کے اندر ہمارے تجدد پسند طبقے کے لیے ایک اور بڑا قابل غور پہلو بھی ہے اور وہ یہ کہ اس جیسے مضامین کو دیکھ کر تجدد پسند حضرات کو ایک بار سنجیدگی کے ساتھ یہ ضرور سوچنا چاہیے کہ یہ امریکی یہودی نامہ نگار اور اس جیسے بہت سے غیر مسلم مغربی باشندے عالم اسلام میں ''تجدد'' کے اثرات کو پھیلتا دیکھ کر اس قدر خوش کیوں ہوتے ہیں؟ اور انہیں ''احیاء اسلام'' کی ہر کوشش سے

کیوں ڈر لگتا ہے؟ کیا بعید ہے کہ اگر وہ اسی پہلو سے غور فرمائیں تو انہیں اپنے طرزِ عمل پر نظرِ ثانی کی ضرورت محسوس ہونے لگے۔

صدر پاکستان فیلڈ مارشل محمد ایوب خان اپنی علالت کے بعد پہلی بار لاہور تشریف لائے تو انہوں نے لاہور کے عوام سے خطاب کرتے ہوئے انہیں مشورہ دیا کہ وہ حضرت علی ہجویری رحمۃ اللہ علیہ کی تعلیمات پر عمل کرنے کے لیے ان کی کتاب ''کشف المحجوب'' کا مطالعہ کریں۔ صدر نے بتایا کہ انہوں نے حال ہی میں اس کتاب کا مطالعہ کیا ہے اور اس میں بے نظیر تعلیمات پائی ہیں۔ انہوں نے عوام کو مشورہ دیا ہے کہ وہ حضرت علی ہجویری کے مزار کی صرف زیارت ہی پر اکتفا نہ کریں بلکہ ان کی اور دوسرے اولیاء اللہ کی تعلیمات پر عمل پیرا ہونے کی کوشش کریں جنہوں نے اس خطے کو اسلام کی شمع سے جگمگایا ہے۔

صدر محترم کا یہ ارشاد اس ملک کے کروڑوں مسلمانوں کی دل کی آواز ہے اور ہم اسے پاکستان کے حق میں فال نیک سمجھتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ نفس اور مادے کے گرداب میں پھنسی ہوئی موجودہ دنیا کو اپنی بے چینی سے نجات اگر مل سکتی ہے تو اس کا واحد راستہ اولیاء اللہ کی بتائی ہوئی تعلیمات پر عمل کرنا ہے۔ روح کی پاکیزگی اور طہارت کا سامان مہیا کیے بغیر نرے مادے سے سکون وقرار کی توقع رکھنا ایک ایسی خود فریبی ہے جس کی سزا انسانیت سالہا سال سے بھگت رہی ہے۔

کراچی پولیس نے تنظیم نوجوانان ملی کے نام سے ایک ادارہ خدمت خلق قائم کیا ہے جس میں شہر کے نوجوان مختلف سماجی خدمات انجام دیں گے، اس کے ساتھ ہی ''اوقات کا ایک بینک'' بھی قائم کیا ہے جس میں ہر شعبہ زندگی کے افراد اپنے اوقات میں سے کچھ وقت ان نوجوانوں کی تربیت اور خدمت خلق کے لیے جمع کرائیں گے۔

یہ ایک نہایت مفید اور مستحسن اقدام ہے اور اگر اس سے صحیح انداز میں کام لیا جائے تو اس سے بڑے دور رس نتائج نکل سکتے ہیں۔ ہماری دعا ہے کہ خدا کرے یہ تحریک ملک وملت کے لیے مفید اور بارآور ہو۔ خدمت خلق ایک عظیم الشان عبادت ہے، امید ہے کہ اس عبادت کو اسی جذبے کے ساتھ انجام دیا جائے گا اور مسلمان اس میں گرمجوشی کے ساتھ حصہ لیں گے۔

طریقت بجز خدمت خلق نیست
بہ تسبیح و سجادہ دلق نیست

گزشتہ مہینے میں البلاغ کا اداریہ مجبوری کی وجہ سے شائع نہیں ہو سکا، اس ایک ماہ کی غیر حاضری پر جن احباب نے خطوط کے ذریعہ افسوس...... بلکہ بعض حضرات نے تعزیت کا اظہار فرمایا ان کی محبت وعنایت کے ہم تہہ دل سے ممنون ہیں اور ساتھ ہی ان حضرات کے بھی جنہوں نے ہمیں ان ''تعزیتی خطوط'' کا مخاطب بنایا۔ بہرکیف اس سلسلہ میں متعلقہ ذمہ دار حضرات سے افہام و تفہیم کی کوشش ہو رہی ہے۔ امید ہے کہ ہمارے قارئین کرام پرچے کے تاخیر سے پہنچنے کا شکوہ نہ فرمائیں گے۔

محمد تقی عثمانی

۲۵/ربیع الثانی ۱۳۸۸ھ

مضمون: ۳۳

واشنگٹن ایک سوال نامہ

سوال۔۱: کسی غیر مسلم ملک مثلاً امریکہ یا یورپ کی شہریت اور نیشنلٹی اختیار کرنا کیسا ہے، اس لیے کہ جو مسلمان ان ممالک کی شہریت اختیار کر چکے ہیں، یا حاصل کرنے کی کوشش کر رہے ہیں، ان میں سے بعض حضرات کا تو یہ کہنا ہے کہ انہیں ان کے مسلم ممالک میں بغیر کسی جرم کے سزائیں دی گئیں، انہیں ظلماً جیل میں قید کر دیا گیا، یا ان کی جائیدادوں کو ضبط کر لیا گیا وغیرہ جس کی بناء پر وہ اپنا مسلم ملک چھوڑ کر ایک غیر مسلم ملک کی شہریت اختیار کرنے پر مجبور ہوئے۔

اور دوسرے بعض مسلمانوں کا یہ کہنا ہے کہ جب ہمارے اپنے اسلامی ملک میں اسلامی قانون اور اسلامی حدود نافذ نہیں ہیں تو پھر اس میں اور ایک غیر مسلم ریاست میں کیا فرق ہے؟

اسلامی احکام کے عدم نفاذ میں تو دونوں برابر ہیں۔ جب کہ جس غیر اسلامی ملک کی شہریت ہم نے اختیار کی ہے۔ اس میں ہمارے شخصی حقوق یعنی جان و مال، عزت و آبرو، اسلامی ملک کے مقابلے میں زیادہ محفوظ ہیں اور ان غیر مسلم ممالک میں ہمیں بلا جرم کے جیل کی قید و بند اور سزا کا کوئی ڈر اور خوف نہیں ہے۔ جب کہ ایک اسلامی ملک میں قانون کی خلاف ورزی کیے بغیر بھی قید و بند کی سزا کا خوف سوار رہتا ہے۔

جواب۔۱: کسی غیر مسلم ملک میں مستقل رہائش اختیار کرنا اور اس کی قومیت اختیار کرنا اور اس ملک کے ایک باشندے اور ایک شہری ہونے کی حیثیت سے اس کو اپنا مستقبل مسکن بنالینا، ایک ایسا مسئلہ ہے جس کا حکم زمانہ اور حالات کے اختلاف اور رہائش اختیار کرنے والوں کی اغراض و مقاصد کے اختلاف سے مختلف ہو جاتا ہے۔ مثلاً

۱۔ اگر ایک مسلمان کو اس کے وطن میں کسی جرم کے بغیر تکلیف پہنچائی جا رہی ہو۔ یا اس کو جیل میں ظلماً قید کر لیا جائے یا اس کی جائیداد ضبط کر لی جائے اور کسی غیر

مسلم ملک میں رہائش اختیار کرنے کے علاوہ ان مظالم سے بچنے کی اس کے پاس کوئی صورت نہ ہو۔ ایسی صورت میں اس شخص کے لیے کسی غیر مسلم ملک میں رہائش اختیار کرنا اور اس ملک کا ایک باشندہ بن کر وہاں رہنا بلا کراہت جائز ہے۔ بشرطیکہ وہ اس بات کا اطمینان کرلے کہ وہ وہاں جاکر عملی زندگی میں دین کے احکام پر کاربند رہے گا اور وہاں رائج شدہ منکرات و فواحشات سے اپنے کو محفوظ رکھ سکے گا۔

۲۔ اسی طرح اگر کوئی شخص معاشی مسئلہ سے دوچار ہو جائے اور تلاش بسیار کے باجود اسے اپنے اسلامی ملک میں معاشی وسائل حاصل نہ ہوں حتی کہ وہ نان جویں کا بھی محتاج ہو جائے ان حالات میں اگر اس کو کسی غیر مسلم ملک میں کوئی جائز ملازمت مل جائے، جس کی بناء پر وہ وہاں رہائش اختیار کرلے تو مذکورہ بالا دو شرائط (جن کا بیان نمبر ایک میں گزرا) اس کو وہاں رہائش اختیار کرنا جائز ہے۔ اس لیے کہ حلال کمانا بھی دوسرے فرائض کے بعد ایک فرض ہے۔ جس کے لیے شریعت نے کسی مکان اور جگہ کی قید نہیں لگائی بلکہ عام اجازت دی ہے کہ جہاں چاہو۔ رزق حلال تلاش کرو چنانچہ قرآن کریم کی آیت ہے۔

ھو الذی جعل لکم الارض ذلولاً فامشوافی منا کبھا و کلوا من رزقه والیه النشور ○

''وہ ایسی ذات ہے جس نے تمہاری لیے زمین کو مسخر کردیا۔ اب تم اس کے راستوں میں چلو اور خدا کی روزی میں سی کھاؤ اور اس کے۔''

۳۔ اسی طرح اگر کوئی شخص کسی غیر مسلم ملک میں اس نیت سے رہائش اختیار کرے کہ وہ وہاں کے غیر مسلموں کو اسلام کی دعوت دے گا اور ان کو مسلمان بنائے گا، یا جو مسلمان وہاں مقیم ہیں ان کو شریعت کے صحیح احکام بتائے گا اور ان کو دین اسلام پر جمے رہنے اور احکام شرعیہ پر عمل کرنے کی ترغیب دے گا۔ اس نیت سے وہاں رہائش اختیار کرنا۔ صرف یہ نہیں کہ جائز ہے بلکہ موجب اجر و ثواب ہے، چنانچہ بہت سے صحابہ اور تابعین رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین نے اسی

نیک ارادے اور نیک مقصد کے تحت غیر مسلم ممالک میں رہائش اختیار کی اور جو بعد میں ان کے فضائل ومناقب اور محاسن میں شمار ہونے لگی۔

۴۔ اگر کسی شخص کو اپنے ملک اور شہر میں اس قدر معاشی وسائل حاصل ہیں، جس کے ذریعہ وہ اپنے شہر کے لوگوں کے معیار کے مطابق زندگی گزار سکتا ہے۔ لیکن صرف معیار زندگی بلند کرنے کی غرض سے اور خوشحالی اور عیش وعشرت کی زندگی گزارنے کی غرض سے کسی غیر مسلم ملک کی طرف ہجرت کرتا ہے تو ایسی ہجرت کراہت سے خالی نہیں، اس لیے کہ اس صورت میں دینی یا دنیاوی ضرورت کے بغیر اپنے آپ کو وہاں پر رائج شدہ فواحشات ومنکرات کے طوفان میں ڈالنے کے مترادف ہے اور بلاضرورت اپنی دینی اور اخلاقی حالت کو خطرہ میں ڈالنا کسی طرح بھی درست نہیں اس لیے کہ تجربہ اس پر شاہد ہے کہ جو لوگ صرف عیش وعشرت اور خوشحالی کی زندگی بسر کرنے کے لیے وہاں رہائش اختیار کرتے ہیں، ان میں دینی حمیت کمزور ہو جاتی ہے چنانچہ ایسے لوگ کافرانہ محرکات کے سامنے تیز رفتاری سے پگھل جاتے ہیں۔

اسی وجہ سے حدیث شریف میں شدید ضرورت اور شدید تقاضے کے بغیر مشرکین کے ساتھ رہائش کرنے کی ممانعت آئی ہے۔

چنانچہ ابوداؤد میں حضرت سمرۃ بن جندب رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

من جامع المشرک وسکن معه، فانه مثله،

(ابوداؤد۔ کتاب الضحایا)

”جو شخص مشرک کے ساتھ موافقت کرلے اور اس کے ساتھ رہائش اختیار کرلے وہ اسی کے مثل ہے۔“

حضرت جریر بن عبداللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

انا بریٔ من کل مسلم یقیم بین اظهر المشرکین، قالوا یارسول الله! لم؟ قال: لا تترا

ای نارا ھما.

''میں ہر اس مسلمان سے بری ہوں، جو مشرکین کے درمیان رہائش اختیار کرے، صحابہ رضی اللہ عنہم نے سوال کیا: یا رسول اللہ! اس کی وجہ کیا ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اسلام کی آگ اور کفر کی آگ دونوں ایک ساتھ نہیں رہ سکتی، تم یہ امتیاز نہیں کر سکو گے کہ یہ مسلمان کی آگ ہے یا مشرکین کی آگ ہے۔''

امام خطابی رحمۃ اللہ علیہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے اس قول کے تشریح کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں کہ:

''مختلف اہل علم نے اس قول کی شرح مختلف طریقوں سے کی ہے چنانچہ بعض اہل علم کے نزدیک اس کے معنی یہ ہیں کہ: مسلمان اور مشرک حکم کے اعتبار سے برابر نہیں ہو سکتے، دونوں کے مختلف احکام ہیں اور دوسرے اہل علم فرماتے ہیں کہ اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے دار الاسلام اور دار الکفر دونوں کو علیحدہ علیحدہ کر دیا ہے، لہٰذا کسی مسلمان کے لیے کافروں کے ملک میں ان کے ساتھ رہائش اختیار کرنا جائز نہیں، اس لیے کہ جب مشرکین اپنی آگ روشن کریں گے اور یہ مسلمان ان کے ساتھ سکونت اختیار کیے ہوئے ہوگا تو دیکھنے سے یہی خیال کریں گے یہ بھی انہیں میں سے ہے اور علماء کی اس تشریح سے یہ بھی ظاہر ہو رہا ہے کہ اگر کوئی مسلمان تجارت کی غرض سے بھی دار الکفر جائے تو اس کے لیے وہاں پر ضرورت سے زیادہ قیام کرنا مکروہ ہے۔

(معالم السنن للخطابی: ص ۴۳۷ ج ۳)

اور مراسیل ابوداؤد عن المکحول میں روایت ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔

''اپنی اولاد کو مشرکین کے درمیان مت چھوڑو۔''

(تہذیب السنن لابن قیم۔ ص: ۴۳۷، ج: ۳)

اسی وجہ سے فقہاء فرماتے ہیں کہ صرف ملازمت کی غرض سے کسی مسلمان کا دار الحرب میں رہائش اختیار کرنا اور ان کی تعداد میں اضافہ کا سبب بننا ایسا فعل ہے جس سے اس کی عدالت مجروح ہو جاتی ہے۔ (دیکھیے، تکملہ رد المختار۔ ج:۱،ص:۱۰۱)

۵۔ پانچویں صورت یہ ہے کہ کوئی شخص سوسائٹی میں معزز بننے کے لیے اور دوسرے مسلمانوں پر اپنی بڑائی کے اظہار کے لیے غیر مسلم ممالک میں رہائش اختیار کرتا ہے یا دار الکفر کی شہریت اور قومیت کو دار الاسلام کی قومیت پر فوقیت دیتے ہوئے اور اس کو افضل اور برتر سمجھتے ہوئے ان کی قومیت اختیار کرتا ہے یا اپنی پوری عملی زندگی میں بود و باش میں ان کا طرز اختیار کر کے ظاہری زندگی میں ان کی مشابہت اختیار کرنے کے لیے اور ان جیسا بننے کے لیے وہاں رہائش اختیار کرتا ہے۔ ان تمام مقاصد کے لیے وہاں رہائش اختیار کرنا مطلقاً حرام ہے۔ جس کی حرمت محتاج دلیل نہیں۔

سوال۔۲: جو مسلمان امریکہ اور یورپ وغیرہ جیسے غیر اسلامی ممالک میں رہائش پذیر ہیں ان کی اولاد کا اس ماحول میں پرورش پانے میں اگرچہ کچھ فوائد بھی ہیں۔ لیکن اس کے مقابلے میں بہت سی خرابیاں اور خطرات بھی ہیں خاص کر وہاں کے غیر مسلم یہود و نصاریٰ کی اولاد کے ساتھ میل جول کے نتیجے میں ان کی عادات و اخلاق اختیار کرنے کا قوی احتمال موجود ہے اور یہ احتمال اس وقت اور زیادہ قوی ہو جاتا ہے، جب ان بچوں کے والدین ان کی اخلاقی نگرانی بے اعتنائی اور لاپروائی برتیں یا ان بچوں کے والدین میں سے کسی ایک کا یا دونوں کا انتقال ہو چکا ہو۔

اب سوال یہ ہے کہ مذکورہ بالا خرابی کی وجہ سے ان غیر مسلم ممالک کی طرف ہجرت اور ان کی قومیت اختیار کرنے کے مسئلہ پر کچھ فرق واقع ہوگا؟ جب کہ دوسری طرف وہاں پر رہائش پذیر مسلمانوں کا یہ بھی کہنا ہے کہ ہماری اولاد کو ان مسلم ممالک میں رہائش باقی رکھنے میں وہاں پر موجود کمیونسٹ اور لادینی جماعتوں کے ساتھ میل جول سے ان کے کافر ہو جانے کا خطرہ بھی لاحق ہے خاص کر اگر ان لادینی جماعتوں اور ان کے ملحدانہ افکار اور خیالات کی سرپرستی خود اسلامی حکومت کر رہی ہو اور ان خیالات و افکار کو نصاب تعلیم میں داخل کر کے عوام کے ذہنوں کو خراب کر رہی ہو اور جو شخص ان خیالات کو قبول

کرنے سے انکار کرے اس کو قید و بند کی سزا دے رہی ہو۔ ایسی صورت میں ایک اسلامی ملک میں رہائش اختیار کرنے سے ہماری اولاد کے عقائد کے خراب ہونے اور دین اسلام سے گمراہ ہونے کا احتمال اور قوی ہو جاتا ہے، ان حالات کی وجہ سے مذکورہ بالا مسئلہ میں کوئی فرق آئے گا؟

جواب۔۲: ایک غیر مسلم میں مسلمان اولاد کی اصلاح و تربیت کا مسئلہ بہت حال! ایک سنگین اور نازک مسئلہ ہے، جن صورتوں میں وہاں رہائش اختیار کرنا مکروہ یا حرام ہے (جس کی تفصیل ہم نے سوال نمبر ایک کے جواب میں تفصیل سے بیان کی) ان صورتوں میں وہاں رہائش اختیار کرنے سے بالکل پرہیز کرنا چاہیے۔

البتہ جن صورتوں میں وہاں رہائش اختیار کرنا بلا کراہت جائز ہے۔ ان میں چونکہ وہاں رہائش اختیار کرنے پر ایک واقعی ضرورت داعی ہے۔ اس لیے اس صورت میں اس شخص کو چاہیے کہ اپنی اولاد کی تربیت کی طرف خصوصی توجہ دے اور جو مسلمان وہاں پر مقیم ہیں ان کو چاہیے کہ وہ وہاں ایسی تربیتی فضا اور ایک پاکیزہ ماحول قائم کریں۔ جس میں آنے والے نئے مسلمان اپنے اور اپنی اولاد کے عقائد اور اعمال و اخلاق کی بہتر طور پر نگہداشت اور حفاظت کر سکیں۔

واللہ اعلم بالصواب.

مسلمان عورت کا غیر مسلم مرد سے نکاح:

سوال نمبر۔۳: کسی مسلمان عورت کا کسی غیر مسلم مرد سے نکاح کرنا کیسا ہے؟ اگر اس عورت کو یہ امید ہو کہ اس شادی کے نتیجے میں وہ مرد مسلمان ہو جائے گا تو کیا اس شخص کے مسلمان ہو جانے کی امید اور لالچ میں اس سے نکاح کرنا درست ہے؟ جب کہ دوسری طرف اس مسلمان عورت کو مسلمانوں میں کوئی برابری کا رشتہ نہ مل رہا ہو اور معاشی تنگی کی وجہ سے خود عورت کے دین سے منحرف ہونے کا امکان بھی ہو تو کیا ایسی صورت میں نکاح کے جواز میں کچھ گنجائش نکل سکتی ہے؟

سوال نمبر۔۴: اگر کوئی عورت مسلمان ہو جائے اور اس کا شوہر کافر ہو، تو کیا اس عورت کو اپنے شوہر سے علاقہ زوجیت برقرار رکھنے کی گنجائش ہے جب کہ اس عورت کو یہ

امید ہے کہ علاقہ زوجیت باقی رکھنے کی صورت میں وہ اپنے شوہر کو اسلام کی دعوت دے کر مسلمان کرلے گی جب کہ دوسری طرف اس عورت کی اپنے شوہر سے اولاد بھی ہے اور علاقہ زوجیت ختم کرنے کی صورت میں ان کے ضائع ہوجانے اور دین سے منحرف ہوجانے کا قوی احتمال موجود ہے کیا ان حالات میں اس عورت کے لیے اپنے شوہر سے رشتہ زوجیت برقرار رکھنے کی کچھ گنجائش ہے؟

اور اگر اس عورت کو اپنے شوہر کے اسلام لانے کی امید تو نہیں ہے۔ لیکن اس کا شوہر اس کے ساتھ اچھے اخلاق اور بہترین معاشرت کے ساتھ حق زوجیت ادا کر رہا ہے اور اس عورت کو یہ بھی ڈر ہے کہ اگر اس نے اپنے شوہر سے جدائی اختیار کر لی تو کوئی مسلمان مرد اس سے شادی کرنے پر تیار نہیں ہوگا۔ کیا اس صورت میں مسئلے کے جواز پر کوئی فرق واقع ہوگا؟

الجواب۔ ۳و۴:

کسی مسلمان عورت کے لیے کسی غیر مسلم مرد سے نکاح کرنا کسی حال میں بھی جائز نہیں قرآن کریم کا واضح ارشاد موجود ہے:

ولا تنکحوا المشرکین حتیٰ یؤمنوا، ولعبد مومن خیر من مشرک ولو اعجبکم. (بقرہ:۲۲۱)

"اور مشرکین سے نکاح نہ کرو جب تک وہ ایمان نہ لے آئیں اور البتہ مسلمان غلام بہتر ہے مشرک سے، اگرچہ تم کو بھلا لگے۔"

دوسری جگہ ارشاد ہے:

لا ھن حل لھم ولا ھم یحلون لھن. (الممتحنۃ:۱۰)

"نہ وہ عورتیں ان کافروں کے لیے حلال ہیں اور نہ وہ کافران عورتوں کے لیے حلال ہیں۔"

اور کسی کافر کے مسلمان ہوجانے کی صرف امید اور لالچ کسی مسلمان عورت کے لیے اس سے نکاح کرنے کی وجہ جواز نہیں بن سکتی ہے اور نہ ہی اس قسم کا خیال امید اور لالچ کسی حرام کام کو حلال کر سکتی ہے۔

اسی طرح اگر کوئی عورت مسلمان ہو جائے تو جمہور علماء کے نزدیک اس کے صرف اسلام لانے سے بھی نکاح ختم ہو جائے گا۔ البتہ امام ابو حنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کے نزدیک صرف اسلام لانے سے نکاح نہیں ٹوٹے گا۔ بلکہ عورت کے اسلام لانے کے بعد مرد کو اسلام کی دعوت دی جائے گی۔ اگر وہ بھی اسلام قبول کر لے تب تو نکاح باقی رہے گا اور اگر اسلام لانے سے انکار کر دے تو نکاح ٹوٹ جائے گا۔

اور اگر شوہر بعد میں مسلمان ہو جائے تو یہ دیکھا جائے گا کہ اس عورت کی عدت گذر چکی ہے یا نہیں؟ اگر وہ عورت ابھی عدت میں ہے تو شوہر کے اسلام لانے سے پہلے کا نکاح دوبارہ لوٹ آئے گا اور اگر اس کی عدت گذر چکی تھی تو اس صورت میں دونوں کے درمیان نکاح جدید کرنا ضروری ہوگا۔ نکاح کے بعد وہ دونوں بحیثیت میاں بیوی کے رہ سکتے ہیں۔ اس مسئلے میں تمام فقہاء متفق ہیں۔ لہٰذا شوہر کے اسلام لانے کی موہوم امید اور لالچ کی بنیاد پر شریعت کا قطعی حکم نہیں بدلا جا سکتا۔

مسلمان میت کو غیر مسلموں کے قبرستان میں دفن کرنا:

سوال نمبر۔۵: امریکہ اور یورپ کے تمام ممالک میں مسلمانوں کے لیے کوئی ایسا مخصوص قبرستان نہیں ہوتا۔ جس میں وہ اپنے مردوں کو دفن کر سکیں، جو عام قبرستان ہوتے ہیں ان میں عیسائی اور یہودی وغیرہ سب اپنے مردوں کو دفن کرتے ہیں اور مسلمانوں کو ان قبرستان سے باہر کسی دوسری جگہ دفن کرنے کی اجازت نہیں ہوتی۔ ان حالات میں کیا مسلمان اپنے مردوں کو غیر مسلموں کے ساتھ ان کے قبرستان میں دفن کر سکتے ہیں؟

الجواب۔۵: عام حالات میں تو مسلمان میت کو غیر مسلموں کے قبرستان میں دفن کرنا جائز نہیں، البتہ ان مخصوص حالات میں جو سوال میں مذکورہ ہیں کہ مسلمانوں کے لیے نہ تو مخصوص قبرستان ہے اور نہ ہی قبرستان سے باہر کسی اور جگہ دفن کرنے کی اجازت ہے۔ ان حالات میں ضرورت کے پیش نظر مسلمان میت کو غیر مسلم کے قبرستان میں دفن کرنا جائز ہے۔

مسجد کو بیچنے کا حکم:

سوال نمبر۔۶: اگر امریکہ اور یورپ کے کسی علاقے کے مسلمان اپنے علاقے کو چھوڑ کر کسی دوسرے علاقے میں منتقل ہو جائیں اور پہلے علاقے میں جو مسجد ہو، اس کے ویران ہو جانے یا اس پر غیر مسلموں کا تسلط اور قبضہ ہو جانے کا خطرہ ہو تو کیا اس صورت میں اس مسجد کو بیچنا جائز ہے؟ اس لیے کہ عام طور پر مسلمان مسجد کے لیے کوئی مکان خرید کر اس کو مسجد بنا لیتے ہیں اور پھر حالات کے پیش نظر اکثر مسلمان جب اس علاقے کو چھوڑ کر دوسرے علاقے میں منتقل ہو جاتے ہیں اور مسجد کو یونہی مہمل اور بیکار چھوڑ دیتے ہیں تو دوسرے غیر مسلم اس مسجد پر قبضہ کر کے اس کو اپنے تصرف میں لے آتے ہیں۔ جب کہ یہ ممکن ہے کہ اس مسجد کو بیچ کر دوسرے علاقے میں جہاں مسلمان آباد ہوں اسی رقم سے کوئی مکان خرید کر مسجد بنائی جائے اس طرح مسجد بیچ کر دوسری مسجد میں تبدیل کرنا شرعاً جائز ہے؟

الجواب۔۶: مغربی ممالک میں جن جگہوں پر مسلمان نماز ادا کرتے ہیں۔ وہ دو قسم کی ہوتی ہیں۔

۱۔ بعض جگہیں تو ایسی ہوتی ہیں جن کو مسلمان نماز پڑھنے اور دینی اجتماعات کے لیے مخصوص کر دیتے ہیں۔ لیکن ان جگہوں کو شرعی طور پر دوسری مساجد کی طرح وقف کر کے شرعی مسجد نہیں بناتے۔ یہی وجہ ہے کہ ان جگہوں کا نام بھی مسجد کے بجائے دوسرے نام مثلاً ''اسلامی مرکز'' یا ''دارالصلاۃ'' یا ''دارالجماعت'' رکھ دیتے ہیں۔

اس قسم کے مکانات کا معاملہ تو بہت آسان ہے، اس لیے کہ ان مکانات کو اگرچہ نماز کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ لیکن جب ان کے مالکوں نے ان کو مسجد نہیں بنایا اور نہ ان کو وقف کیا ہے تو وہ شرعاً مسجد ہی نہیں۔ لہٰذا ان مکانات کے مالک مسلمانوں کے مصالح کے پیش نظر ان کو بیچنا چاہیں تو شرعاً بالکل اجازت ہے۔ اس پر تمام فقہاء کا اتفاق ہے۔

۲۔ دوسرے بعض مقامات ایسے ہوتے ہیں جن کو مسلمان عام مساجد کی طرح وقف کر کے شرعی مسجد بنا لیتے ہیں۔ جمہور فقہاء کے نزدیک اس قسم کی جگہوں کا حکم یہ

ہے کہ وہ مکان اب قیامت تک کے لیے مسجد بن گیا۔ اس کو کسی صورت میں بھی بیچنا جائز نہیں اور نہ وہ مکان اب وقف کرنے والے کی ملکیت میں داخل ہو سکتا ہے۔ امام مالک، امام شافعی، امام ابو حنیفہ اور امام ابو یوسف رحمہم اللہ کا یہی مسلک ہے۔

چنانچہ مسلک شافعی کے امام خطیب شربینی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

ولو انهدم مسجد، وتعذرت اعادته، او تعطل لخراب البلد مثلاً، لم يعد ملك اولم يبع بحال، كا لعبداذا عتق، ثم زمن ولم ينقض ان لم يخف عليه لا مكان الصلاة فيه، ولا مكان عوده كما كان...... فان خيف عليه نقض، وبنى الحاكم بنقضه مسجدا آخر ان راى زالك، والا حفظه، وبنائوه بقربه اولى، ولا يبنى به بئراً (مغنی المحتاج: ص ۳۹۲ ج ۲)

"اگر مسجد منہدم ہو جائے، اور اس کو دوبارہ درست کرنا ممکن نہ ہو، یا اس بستی کے اجڑ جانے سے وہ مسجد بھی ویران ہو جائے تب بھی وہ مسجد مالک کی ملکیت میں نہیں آئے گی اور نہ اس کو بیچنا جائز ہوگا۔ جیسا کہ غلام کو آزاد کر دینے کے بعد اس کی بیع حرام ہو جاتی ہے پھر اگر اس مسجد پر غیر مسلموں کے قبضے کا خوف نہ ہو تو اس کو منہدم نہ کیا جائے، بلکہ اس کو اپنی حالت پر برقرار رکھا جائے، اس لیے کہ اس بات کا امکان موجود ہے کہ مسلمان دوبارہ یہاں آ کر آباد ہو جائیں اور اس مسجد کو دوبارہ زندہ کر دیں ...... البتہ اگر غیر مسلموں کے تسلط اور قبضہ کا خوف ہو تو اس صورت میں حاکم وقت مناسب سمجھے تو اس مسجد کو ختم کر دے اور اس کے بدلے میں دوسری جگہ مسجد بنا دے اور اس دوسری مسجد کا پہلی مسجد کے قریب ہونا زیادہ بہتر ہے اور اگر حاکم وقت اس مسجد کو توڑنا اور مسمار کرنا مناسب نہ سمجھے تو پھر اس کی حفاظت کرے۔

اور فقہاء مالکیہ میں سے علامہ مواق رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں:

ابن عرفة من المدونة وغيرها، يمنع بيع ماخرب من ربع الحبس مطلقاً،...... وعبارة الرسالة: ولا يباع الحبس وان خرب...... وفي الطررعن ابن عبدالغفور: لا يجوز بيع مواضع المساجد الخربة، لا نها وقف، ولا بائس ببيع نقضها

(التاج والاکلیل للمواق، حاشیہ خطاب، ص ۴۲ ج ۶)

''ابن عرفہ مدونہ وغیرہ سے نقل کرتے ہیں کہ وقف مکان کی بیع مطلقاً جائز نہیں، اگرچہ وہ ویران ہوجائے ...... اور رسالہ میں یہ عبارت درج ہے کہ: وقف کی بیع جائز نہیں اگرچہ وہ ویران ہوجائے...... طرر میں ابن عبدالغفور سے یہ عبارت منقول ہے کہ: ویران مساجد کی جگہوں کو بیچنا وقف ہونے کی بناء پر جائز نہیں۔ البتہ ان کا ملبہ بیچنا جائز ہے۔''

ومن اتخذ ارضه مسجداً لم يكن له ان يرجع فيه، ولا يبيعه، ولا يورث عنه، لانه تجرد عن حق العباد، وصار خالصاً لله، وهذا لان الا شياء كلها لله تعالىٰ، واذا اسقط العبد ماثبت له من الحق رجع الىٰ اصل ، فانقطع تصرفه عنه كما في الا عتقاق، ولو خرب ماحول المسجد. واستغنى عنه يبقى مسجداً عندابي يوسف، لانه اسقاط منه، فلا يعود الى ملكم (ہدایہ مع فتح القدیر۔ ص: ۴۴۶، ج: ۵)

''اگر کسی شخص نے اپنی زمین مسجد کے لیے وقف کردی تو اب وہ شخص نہ تو اس وقف سے رجوع کرسکتا ہے اور نہ اس کو بیچ سکتا ہے اور نہ اس میں وراثت جاری ہوگی اس لیے کہ وہ جگہ بندہ کی ملکیت سے نکل کر خالص اللہ کے لیے ہوگئی وجہ اس کی یہ ہے کہ ہر چیز حقیقتاً

اللہ کی ملکیت ہے اور اللہ تعالیٰ نے بندہ کو تصرف کا حق عطا فرمایا ہے۔ جب بندہ نے اپنا حق تصرف ساقط کر دیا تو وہ چیز ملکیت اصلی یعنی اللہ کی ملکیت میں داخل ہو جائے گی لہٰذا اب بندہ کا اس میں تصرف کرنے کا حق ختم ہو جائے گا۔ جیسا کہ آزاد کردہ غلام میں (بندہ کا حق تصرف ختم ہو جاتا ہے۔)

اور اگر مسجد کے اطراف کا علاقہ ویران ہو جائے اور مسجد کی ضرورت باقی نہ رہے تب بھی امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک مسجد ہی رہے گی۔ اس لیے کہ اس کو مسجد بنانا اپنا حق ساقط کرتا ہے۔ لہٰذا بندہ کا اپنا حق ساقط کرنے کے بعد دوبارہ وہ حق اس کی ملکیت میں واپس نہیں آئے گا۔"

البتہ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کا یہ مسلک ہے کہ اگر مسجد کے اطراف کی آبادی ختم ہو جائے اور مسجد کی ضرورت بالکلیہ ختم ہو جائے تو اس صورت میں مسجد کو بیچنا جائز ہے، چنانچہ المغنی لابن قدامہ میں یہ عبارت منقول ہے:

ان الوقف اذا خرب، وتعطلت منافعه، كدار انهدمت، او ارض خربت، وعادت مواتاً، ولم تكن عمارتها، او مسجد انتقل اهل القرية عنه، وصار في موضع لا يصلي فيه، او ضاق باهله، ولم يمكن توسيعه، في موضعه، او تشعب جميعه، فلم تمكن عمارته، ولا عمارة بعضه الا ببيع بعضه، جاز بيع بعضه لتعمر به بقيته، وان لم يمكن الانتفاع بشيئي منه بيع جميعه.

(المغنی لابن قدامہ مع الشرح الکبیر ص ۲۲۵ ج ۶)

"اگر وقف کی زمین ویران ہو جائے اور اس کے منافع ختم ہو جائیں۔ مثلاً کوئی مکان تھا وہ منہدم ہو گیا، یا کوئی زمین تھی جو ویران ہو کر ارض موات بن جائے۔ یا کسی مسجد کے اطراف میں جو

آبادی تھی وہ کسی دوسری جگہ منتقل ہو جائے اور اب اس مسجد میں کوئی نماز پڑھنے والا بھی نہ رہے، یا وہ مسجد ابادی کی کثرت کی وجہ سے نمازیوں سے تنگ ہو جائے اور مسجد میں توسیع کی بھی گنجائش نہ ہو۔ یا اس مسجد کے اطراف میں رہنے والے لوگ منتشر ہو جائیں اور جو لوگ وہاں آباد ہوں وہ اتنی قلیل تعداد میں ہوں کہ ان کے لیے اس مسجد کی تعمیر اور درست کرنا ممکن نہ ہو تو اس صورت میں اس مسجد کے کچھ حصے کو فروخت کر کے اس کی رقم سے دوسرے حصے کی تعمیر کرنا جائز ہے اور اگر مسجد کے کسی بھی حصے سے انتفاع کا کوئی راستہ نہ ہو تو اس صورت میں پوری مسجد کو بھی جائز ہے۔"

امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کے علاوہ امام محمد بن حسن الشیبانی رحمۃ اللہ علیہ بھی جواز بیع کے قائل ہیں۔ ان کا مسلک یہ ہے کہ اگر وقف زمین کی ضرورت بالکلیہ ختم ہو جائے تو زمین دوبارہ واقف کی ملکیت میں داخل ہو جائے گی اور اگر واقف کا انتقال ہو چکا ہو تو پھر اس کے ورثاء کی طرف منتقل ہو جائے گی۔

چنانچہ صاحب ہدایہ تحریر فرماتے ہیں:

"وعند محمد یعود الی ملک البانی، اوالی وارثه بعد موته لانه عینه لکنوع قربة، وقد انقطعت، فصار کحصید المسجد و حشیشه اذا استغنی عنه. (ہدایہ مع فتح القدیر۔ص:۴۴۶،ج:۵)

"امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک وہ زمین دوبارہ مالک کی ملکیت میں چلی جائے گی اور اگر اس کا انتقال ہو چکا ہے تو اس کے ورثاء کی طرف منتقل ہو جائے گی، اس لیے کہ اس کے مالک نے اس زمین کو ایک مخصوص عبادت کے لیے معین کر دیا تھا اب جب کہ اس جگہ پر وہ مخصوص عبادت کی ادائیگی منقطع ہو گئی۔

تو پھر اس کی ضرورت باقی نہ رہنے کی وجہ سے وہ مالک کی ملکیت میں داخل ہو جائے گی۔ جیسے کہ مسجد کی دری، چٹائی یا گھاس وغیرہ

کی ضرورت ختم ہونے کے بعد وہ مالک کی ملکیت میں واپس لوٹ آتی ہے۔"

لہٰذا جب وہ مالک کی ملکیت میں واپس آ گئی تو اس کے لیے بیچنا بھی جائز ہوگا۔
جمہور فقہاء نے واقف مسجد کی مزین کی بیع ناجائز ہونے اور مالک کی ملکیت میں دوبارہ نہ لوٹنے پر حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے وقف کے واقعہ سے استدلال کیا ہے وہ یہ کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں جب حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے خیبر کی زمین وقف کی تو وقف نامہ میں یہ شرائط درج کیں کہ:

انه لا يباع اصلها، ولا تباع، ولا تورث و لا توهب

"آئندہ وہ زمین نہ تو بیچی جائے گی، نہ اس میں وراثت جاری ہوگی اور نہ کسی کو ہبہ کی جا سکے گی۔"

یہ واقعہ صحیح بخاری اور صحیح مسلم دنوں میں موجود ہے البتہ مندرجہ بالا الفاظ صحیح مسلم کے ہیں۔

امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ نے جمہور کی طرف سے بیت اللہ کو دلیل میں پیش کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ:

"فترۃ (یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان کا عرصہ) کے زمانے میں بیت اللہ کے اندر اور اس کے اطراف میں بت ہی بت تھے اور بیت اللہ کے اطراف میں ان کفار اور مشرکین کا صرف شور مچانے چیخنے اور سیٹیاں بجانے کے علاوہ کوئی کام نہ تھا اس کے باوجود بیت اللہ مقام قربت اور مقام اطاعت وعبادت ہونے سے خارج نہیں ہوا۔ لہٰذا یہی حکم تمام مساجد کا ہوگا۔ (کہ اگر کسی مسجد کے قریب ایک مسلمان بھی باقی نہ رہے۔ جو اس میں عبادت کرے تب بھی وہ مسجد محل عبادت ہونے سے خارج نہیں ہوگی)۔"

امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کے مندرجہ بالا استدلال پر علامہ ابن ہمام رحمۃ اللہ

علیہ نے ایک اعتراض یہ کیا ہے کہ فترۃ کے زمانے میں بیت اللہ کا طواف تو کفار و مشرکین بھی کرتے تھے۔ لہٰذا یہ کہنا درست نہیں کہ اس زمانے میں عبادت مقصودہ بالکلیہ ختم ہوگئی تھیں۔

اس اعتراض کے جواب میں حضرت مولانا ظفر احمد عثمانی رحمۃ علیہ فرماتے ہیں کہ بیت اللہ کے قیام کا مقصد صرف اس کا طواف کرنا نہیں ہے بلکہ بیت اللہ کے قیام کا بڑا مقصد اس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنا ہے یہی وجہ ہے کہ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بیت اللہ کے جوار میں اپنی اولاد کے قیام کا ذکر فرمایا تو اس کی وجہ یہ بیان فرمائی کہ:

ربنا لقیموا الصلاۃ

''اے میرے رب! (میں نے ان کو یہاں اس لیے ٹھہرایا ہے)
تا کہ یہ لوگ یہاں نماز قائم کریں۔''

یہاں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے نماز کا تو ذکر فرمایا۔ طواف کا ذکر نہیں فرمایا۔
اس کے علاوہ خود اللہ جل شانہ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو حکم دیتے ہوئے فرمایا:

اَنْ طَهِّرَا بَیْتِیَ لِلطَّآئِفِیْنَ وَالْعٰکِفِیْنَ

''میرے گھر کو مسافروں اور مقیمین کے لیے پاک کردو۔''

یہ استدلال اس وقت ہے جب ''طائفین'' اور ''عاکفین'' کی تفسیر مسافر اور مقیم سے کی جائے، جیسا کہ قرآن کریم کی دوسری آیت: ''**سَوَآءَ نِ الْعَاکِفُ فیه والباد**'' میں لفظ ''**عاکف**'' مقیم کے معنی ہی میں استعمال ہوا ہے۔ (اعلاء السنن۔ ص: ۲۱۲، ج: ۱۳)

اس کے علاوہ جمہور کی سب سے مضبوط دلیل قرآن کریم کا یہ ارشاد ہے:

وان المساجد لله فلا تدعوا مع الله احداً

(سورۃ جن: ۱۸)

''اور تمام مسجدیں اللہ کا حق ہیں، سو اللہ کے ساتھ کسی کی عبادت مت کرو۔''

چنانچہ اس آیت کے تحت علامہ ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ احکام القرآن میں تحریر فرماتے ہیں:

اذ تعینت للہ اھلاً وعینت لہ عقداً فصارت عتیقۃ من التملک، مشترکۃ بین الخلیقۃ فی العبادۃ

(احکام القرآن لابن عربی ص ۱۸۶۹ ج ۴)

''کہ جب وہ مسجدیں خالص اللہ کے لیے ہوگئیں، تو بندہ کی ملکیت سے آزاد ہوگئیں اور صرف عبادت ادا کرنے کی حد تک تمام مخلوق کے درمیان مشترکہ ہوگئیں۔''

اور علامہ ابن جریر طبری رحمۃ اللہ علیہ حضرت عکرمہ کا قول نقل کرتے ہیں:

وان المساجد للہ قال: المساجد کلھا

(تفسیر ابن جریر: ص ۷۳۔ پارہ ۲۰)

''بے شک مسجدیں اللہ کے لیے ہیں، حضرت عکرمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں: کہ تمام جدیں اس میں داخل ہیں۔ کسی کی تفریق نہیں ہے۔''

علامہ ابن قدامہ، امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کے مسلک کی تائید میں حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا وہ مکتوب پیش کرتے ہیں جو انہوں نے حضرت سعد رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو لکھا تھا کہ وہ کوفہ کے بیت المال میں چوری ہوگئی اور اس کی اطلاع حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو ہوئی تو آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے لکھا کہ موضع تمارین کی مسجد منتقل کرکے بیت المال اس طرح بناؤ کہ بیت المال مسجد کے قبلہ کی سمت میں ہو جائے۔ اس لیے کہ مسجد میں ہر وقت کوئی نہ کوئی نمازی موجود ہی ہوتا ہے۔ (اس طرح بیت المال کی بھی حفاظت ہو جائے گی۔) (المغنی لابن قدامہ، ۶: ۲۲۶)

اس استدلال کا جواب دیتے ہوئے علامہ ابن ہمام رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ: ممکن ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا مقصد اصل مسجد کو منتقل کرنا نہ ہو۔ بلکہ بیت المال کو منتقل کرکے مسجد کے سامنے بنانے کا حکم دیا ہو۔ (فتح القدیر۔ ج: ۵، ص: ۴۴۶)

بہر حال! مندرجہ بالا تفصیل سے یہ بات واضح ہوگئی کہ اس سلسلے میں جمہور کا مسلک راجح ہے۔ لہٰذا کسی مسجد کے شرعی مسجد بن جانے کے بعد اس کو بیچنا جائز نہیں اگر مسجد کو بیچنے کی اجازت دے دی جائے تو پھر لوگ مسجدوں کو بھی گرجا گھر کی طرح جب

چاہیں گے بیچ دیں گے اور مسجدیں ایک تجارتی سامان کی حیثیت اختیار کرلیں گی۔

لیکن فقہاء کے مندرجہ بالا اختلاف کی وجہ سے چونکہ یہ مسئلہ مجتہد فیہ ہے اور دونوں طرف قرآن وسنت کے دلائل موجود ہیں؟ لہٰذا اگر کسی غیر مسلم ملک میں مسجد کے اطراف سے تمام مسلمان ہجرت کر کے جا چکے ہوں اور اس مسجد پر کفار کے قبضہ اور تسلط کے بعد اس کے ساتھ بے حرمتی کا معاملہ کرنے کا اندیشہ ہو اور مسلمانوں کے دوبارہ وہاں آ کر آباد ہونے کا کوئی امکان نہ ہو تو اس ضرورت شدیدہ کے وقت امام احمد اور امام محمد بن حسن رحمہم اللہ کے مسلک کو اختیار کرتے ہوئے اس مسجد کو بیچنے اور اس کی قیمت سے کسی دوسری جگہ مسجد بنانے کی گنجائش معلوم ہوتی ہے۔ البتہ اس کو مسجد کے سوا کسی اور مصرف میں خرچ کرنا جائز نہیں۔ جب کہ ایک اور مسئلے کے سلسلے میں علامہ ابن قدامہ رحمۃ اللہ علیہ کے اس جملے سے معلوم ہوتا ہے:

ویجعل بدلہ مسجد فی مواضع اخر.

"اور اس کے بدلے کسی دوسری جگہ کوئی مسجد بنادی جائے۔"

(المغنی لابن قدارص ۲۲۸ ج ۶)

بہر حال! امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کے مسلک پر عمل کرتے ہوئے جہاں مسجد کی بیع کی اجازت دی گئی ہے وہ اس وقت ہے جب تمام مسلمان اس مسجد کے پاس سے دوسری جگہ منتقل ہو جائیں اور دوبارہ جگہ اس واپس آنے کا بھی کوئی امکان نہ ہو۔ لیکن اگر تمام مسلمان تو وہاں سے منتقل نہ ہوئے ہوں بلکہ مسلمانوں کی اکثریت وہاں سے دوسری جگہ منتقل ہوگئی ہو، لیکن بعض مسلمان اب بھی وہاں رہائش پذیر ہوں اس صورت میں اس مسجد کی بیع کسی حال میں بھی جائز نہیں۔ حتیٰ کہ فقہاء حنابلہ بھی عدم جواز کے قائل ہیں۔

(تفصیل کے لیے معارف القرآن۔ ج نمبر: ۷، ص: ۳۱ ملاحظہ فرمائیں)

اسی طرح حضرت نوح علیہ السلام نے اپنے ٭کو طوفان نوح کے انے کے بعد آخر وقت تک نصیحت فرمائی جس کو قرآن حکیم نے اس طرح ذکر فرمایا ہے۔

وھی تجری بھم فی موج کالجبال ونادی نوح ابنہ وکان فی معزل یابنی ارکب معنا ولا تکن مع الکافرین O (سورہ ہود: ۴۲)

"اور وہ کشتی ان کی پہاڑ جیسی موجوں میں چلنے لگے اور نوح (علیہ السلام) نے اپنے بیٹے کو پکارا اور وہ علیحدہ مقام پر تھا کہ اے میرے پیارے بیٹے ہمارے ساتھ سوار ہو جا اور (عقیدہ میں) کافروں کے ساتھ مت ہو (یعنی کفر کو چھوڑ دے کہ غرق سے بچ جاوے۔" (تفسیر معارف القرآن ج ۴ ص ۲۲۴)

شرعی محرم کے بغیر سفر کرنا:

سوال نمبر۔ ۷: بہت سی مسلمان عورتیں کسب معاش کے لیے تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے تنہا دور دراز کے ممالک کا سفر کرتی ہیں۔ سفر میں نہ تو شرعی محرم ان کے ساتھ ہوتا ہے اور نہ ان کے ساتھ جان پہچان والی عورتیں ہوتیں ہیں اس صورت میں ان کے لیے شرعاً کیا حکم ہے؟ کیا ان کے لیے اس طرح تنہا سفر کرنا جائز ہے؟

جواب۔ ۷: مسلم شریف میں حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔

"کوئی عورت تین روز (یعنی شرعی مسافت ۴۸ میل) سے زیادہ سفر نہ کرے الا یہ کہ اس کے ساتھ اس کا شوہر یا اس کا محرم ہو۔"

مندرجہ بالا حدیث میں صراحت کے ساتھ عورت کو تنہا سفر کرنے سے ممانعت فرمادی گئی ہے اور جمہور فقہاء نے اسی حدیث سے استدلال کرتے ہوئے فرض حج کے لیے بھی شرعی محرم کے بغیر سفر کرنے کو ناجائز کہا ہے۔ جب کہ اس کے مقابلے میں تعلیم اور کسب معاش تو بہت کم درجہ کی چیزیں ہیں جن کی مسلمان عورتوں کو ضرورت ہی نہیں ہے اس لیے خود شریعت اسلامی نے اس کی کفالت کی ذمہ داری شادی سے پہلے اس کے باپ پر اور شادی کے بعد شوہر پر ڈالی ہے اور عورت کو اس کی اجازت نہیں دی کہ وہ شدید ضرورت کے بغیر گھر سے نکلے۔ لہٰذا کسب معاش اور حصول تعلیم کے لیے اس طرح بغیر محرم کے سفر کرنا جائز نہیں۔

ہاں! اگر کوئی عورت ایسی ہے جس کا نہ تو شوہر اور نہ باپ ہے اور نہ ہی کوئی دوسرا ایسا رشتہ دار ہے جو اس کی معاشی کفالت کر سکے اور نہ خود اس عورت کے پاس اتنا مال ہے

جس کے ذریعے وہ اپنی ضروریات پوری کرسکے۔ اس صورت میں اس عورت کے لیے بقدرِ ضرورت کسب معاش کے لیے شرعی پردہ کی پابندی کے ساتھ گھر سے نکلنا جائز ہے اور جب یہ مقصد اپنے وطن اور اپنے شہر میں رہ کر بھی بآسانی پورا ہوسکتا ہے تو اس کے لیے کسی غیر مسلم ملک کی طرف سفر کرنے کی ضرورت نہیں۔

(دیکھیے: مغنی لابن قدامہ۔ ص: ۱۹۰، ج: ۳) واللہ اعلم۔

غیر مسلم ملک میں عورت کا تنہا قیام کرنا:

سوال۔۸: بعض مسلمان عورتیں اور نوجوان لڑکیاں جدید تعلیم کے حصول کے لیے یا کسب معاش کے لیے غیر مسلم ممالک مس بعض اوقات تنہا اور بعض اوقات غیر مسلم عورتوں کے ساتھ رہائش اختیار کرلیتی ہیں ان عورتوں کا اس طرح تنہا یا غیر مسلم عورتوں کے ساتھ رہائش اختیار کرنا کیسا ہے؟ شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

جواب: جیسا کہ ہم نے اوپر ساتویں سوال کے جواب میں عرض کیا کہ ایک مسلمان عورت کو حصول معاش کے لیے یا حصول تعلیم کے لیے محرم کے بغیر تنہا غیر مسلم ممالک کا سفر کرنا جائز نہیں۔ اسی طرح قیام کرنا بھی جائز نہیں۔ ہاں! اگر کسی عورت نے محرم کے ساتھ کسی غیر مسلم ملک کا سفر کیا تھا اور وہاں رہائش پذیر ہوکر اس کو اپنا وطن بنالیا تھا پھر یا تو اس عورت کے محرم کا وہاں انتقال ہوگیا۔ یا کسی وجہ سے وہ محرم وہاں سے سفر کر کے کسی اور جگہ چلا گیا اور وہ عورت وہاں تنہا رہ گئی، اس صورت میں اس عورت کے تنہا قیام کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ بشرطیکہ وہ عورت وہاں رہ کر شرعی پردہ کی پابندی کرے۔ واللہ اعلم۔

جن ہوٹلوں میں شراب اور خنزیر کی خرید و فروخت ہوتی ہو۔ ان میں ملازمت کرنے کا حکم:

سوال۔۹: وہ مسلمان طلبہ جو حصول تعلیم کے لیے غیر مسلم ممالک کا سفر کر کے وہاں تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ ان کے معاشی اخراجات اور تعلیمی اخراجات کے لیے وہ رقوم ناکافی ہوتی ہیں۔ جو ان کے والدین وغیرہ کی طرف سے ان کے لیے بھیجی جاتی ہیں۔

چنانچہ وہ طلبہ مجبوراً معاشی اور تعلیمی اخراجات پورنے کرنے کے لیے حصول تعلیم کے ساتھ ساتھ وہاں ملازمت بھی اختیار کر لیتے ہیں اور بعض اوقات ان طلبہ کو وہاں پر ایسے ہوٹلوں میں ملازمت ملتی ہے جن میں شراب اور خنزیر کی خرید وفروخت ہوتی ہے۔ کیا ان طلبہ کے لیے ایسے ہوٹلوں میں ملازمت اختیار کرنا جائز ہے؟

سوال۔۱۰: بعض مسلمان غیر مسلم ممالک میں شراب بنا کر بیچنے کا پیشہ اختیار کر لیتے ہیں۔ کیا اس طرح غیر مسلموں کے لیے شراب بنا کر بیچنا یا خنزیر بیچنا جائز ہے؟

جواب: ایک مسلمان کے لیے غیر مسلم کے ہوٹل میں ملازمت اختیار کرنا جائز ہے۔ بشرطیکہ وہ مسلمان شراب پلانے یا خنزیر یا دوسرے محرمات کو غیر مسلموں کے سامنے پیش کرنے کا عمل نہ کرے اس لیے کہ شراب پلانا اس کو دوسروں کے سامنے پیش کرنا حرام ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

لعن الله الخمر وشاربها وساقيها وبائعها ومبتاعها وعاصرها وحاملها والمحمولة اليه.

(ابوداود، کتاب الاشربہ، باب العنب یعصر للخمرہ۔ حدیث نمبر:۳۶۷۴، ص:۳۲۶، ج:۳)

''اللہ جل شانہ، نے شراب پر، اس کے پینے والے، اس کے پلانے والے، اس کے بیچنے والے، اس کے خریدنے والے، اس کو نچوڑنے والے اور جس کے لیے وہ نچوڑی جائے اور اور اس کے اٹھانے والے اور جس کی طرف اٹھا کر لے جائے اور ان سب پر لعنت فرمائی ہے۔''

ترمذی شریف میں حضرت انس بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے:

لعن رسول الله صلى الله عليه وسلم فى الخمر عشرة: عاصرها ومعتصرها وشاربها وحاملها والمحمولة اليه وساقيها وبايعها واكل ثمنها والمشترى لها والمشتر له.

(ترمذی شریف کتاب البیوع باب ماجاء فی بیع الخمر۔ حدیث نمبر:۱۲۱۳، ص:۳۸۰، ج:۲)

''حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے شراب سے متعلق دس اشخاص پر لعنت فرمائی ہے شراب نچوڑنے والا اور جس کے لیے نچوڑا جائے، اس کو پینے والا، اٹھانے والا جس کے لیے اٹھائی جائے۔ پلانے والا، بیچنے والا، شراب بیچ کر اس کی قیمت کھانے والا، خریدنے والا جس کے لیے خریدی جائے۔''

ابن ماجہ میں بھی حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث کے الفاظ اس طرح

عاصرها، ومعتصرها او المعصرة له وحاملها والمحمولة له وبائعها والمبيوعة له وسقيها والمستقاة له.

(ابن ماجہ۔ ص: ۱۱۲۲، ج: ۲، کتاب الاشربۃ، باب لعنت الخمر علی عشرۃ اوجہ۔ حدیث نمبر: ۳۳۸۱)

''شراب نچوڑنے والا، جس کے لیے نچوڑی جائے، اس کو اٹھانے والا، جس کے لیے اٹھائی جائے۔ اس کو فروخت کرنے والا جس کو فروخت کی جائے پلانے والا جس کو پلائی جائے۔''

امام بخاری اور امام مسلم رحمہم اللہ نے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی یہ حدیث روایت کی ہے۔

قالت: لما نزلت الايات من آخر سورة البقرة خرج رسول صلى الله عليه وسلم فقراء هن على الناس، ثم نهى عن التجارة فى الخمر.

(بخاری شریف، کتاب البیوع، کتاب المساجد و کتاب التفسیر سورۃ البقرہ، مسلم شریف کتاب البیوع، باب تحریم بیع الخمر)

''حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ جب سورہ بقرہ کی آخری آیات نازل ہوئیں تو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم گھر سے باہر تشریف لے گئے اور وہ آیات لوگوں کو پڑھ کر سنائیں اور پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے شراب کی تجارت اور خرید و فروخت کی ممانعت کر دی۔''

امام مسلم رحمتہ اللہ علیہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کا یہ قول مرفوعاً نقل کیا ہے کہ:

ان الذی حرم شربها حرم بیعها

''جس ذات نے شراب پینے کو حرام قرار دیا ہے، اسی ذات نے اس کی خرید و فروخت بھی حرام قرار دی ہے۔''

اور امام احمد رحمتہ اللہ علیہ نے اپنی مسند میں یہ روایت نقل کی ہے کہ:

عن عبدالرحمن بن وعلة، قال: سالت ابن عباس نقلت: ان بارض لنا بها الکروم وان اکثر غلاتها الخمر، فذکر ابن عباس ان رجلا اهدی الی النبی صلی اللہ علیه وسلم روایة خمر، فقال له رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم: ان الذی حرم شربها حرم بیعها (مسند احمدؒ۔ ج:۱، ص:۲۴۴)

''عبدالرحمٰن بن وعلہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ میں نے ایک مرتبہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے سوال کیا کہ ہم ایسے علاقے میں رہتے ہیں جہاں ہمارے پاس انگور کے باغات ہیں اور ہماری آمدنی کا بڑا ذریعہ شراب ہی ہے اس کے جواب میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ایک شخص نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر شراب کی ایک مشک بطور ہدیہ کے پیش کی۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شخص سے فرمایا: جس ذات نے اس کے پینے کو حرام قرار دیا ہے، اس کی خرید و فروخت کو بھی حرام قرار دیا ہے۔''

مندرجہ بالا احادیث سے یہ مسئلہ بالکل واضح ہو جاتا ہے کہ شراب کی تجارت بھی حرام ہے اور اجرت پر اس کو ایک جگہ سے دوسری جگہ اٹھا کر لیجانا، یا پلانا سب حرام ہے اور حضرات ابن عباس رضی اللہ عنہ کے فتویٰ سے یہ بات بھی واضح ہوگئی کہ اگر کسی علاقے میں شراب بنانے اور اس کی خرید و فروخت کا عام رواج ہو۔ وہاں بھی کسی

مسلمان کے لیے حصول معاش کے طور پر شراب کا پیشہ اختیار کرنا حلال نہیں۔ اور میرے علم کے مطابق فقہاء میں سے کسی فقیہ نے بھی اس کی اجازت نہیں دی۔ واللہ اعلم بالصواب

ایک حدیث میں ہے کہ:

''اہل جنت میں سے خاص نوجوان پانچ ہیں، حسن حسین، عبداللہ بن عمر، عمر سعد بن معاذ اور ابی بن کعب (رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین)۔'' (فردوس دیلمی عن انس)

ایک حدیث میں ارشاد ہے کہ:

''حبشیوں کے سردار چار ہیں۔ لقمان حبشی، نجاشی، بلال اور مہیجع۔''

(ابن عساکر عن عبداللہ بن یزدی مرسلا)

ایک حدیث میں ہے کہ جب حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے انتقال کا وقت قریب آیا، تو لوگوں نے کہا کہ ہمیں کچھ نصیحت فرما دیجیے، آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا۔ مجھے اٹھا کر بٹھاؤ۔ چنانچہ آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو بٹھا دیا گیا پھر آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا۔ علم اور ایمان اپنی جگہ ہیں جو بھی انہیں ڈھونڈے گا پالے گا۔ (اس کو تین مرتبہ فرمایا) پھر فرمایا کہ علم کو چار شخصوں کے پاس تلاش کرو، عویمر یعنی ابو درداء، سلمان فارسی، عبداللہ بن مسعود اور عبداللہ بن سلام (ترمذی عن یزید بن عمیرہ)

ایک حدیث میں حضرت خثمہ بن سبرہ اپنا واقعہ سناتے ہیں کہ جب میں مدینہ آیا تو اللہ سے دعا مانگی کہ وہ مجھے کوئی صالح ہمنشین میسر فرمائے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ عطا فرما دیئے ہیں ان کے پاس آ کر بیٹھ گیا اور عرض کیا کہ میں نے اللہ سے دعا کی تھی کہ وہ مجھے کوئی صالح ہمنشین میسر فرما دے تو آپ میرے حصے میں آئے ہیں۔ انہوں نے مجھ سے پوچھا۔ تم کس شہر سے آئے ہو۔ میں نے عرض کیا کوفہ سے اور دین کی تلاش اور جستجو میں یہاں آیا ہوں فرمایا کیا تمہارے ہاں سعد بن مالک نہیں ہیں جو مستجاب الدعوات ہیں اور کیا عبداللہ بن مسعود نہیں ہیں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا برتن وضو اور پاپوش رکھا کرتے تھے اور کیا حذیفہ نہیں ہیں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے راز دار ہیں اور کیا عمار بن یاسر نہیں ہیں جن کو حق تعالیٰ

نے بزبان پیغمبر شیطان سے مامون قرار دیا ہے اور کیا سلمان فارسی نہیں ہیں جو دو کتابوں والے ہیں۔ (بخاری، مسلم، ترمذی عن خیثمہ بن سبرہ)

دو کتابوں سے مراد انجیل اور قرآن ہیں۔ نیز اور افراد کو شمار کرانے سے مقصد حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ کا یہ تھا کہ کوفہ شہر میں بھی بڑے بڑے اکابر رہتے ہیں۔

ایک حدیث میں حضرت ابوموسیٰ اشعری بیان کرتے ہیں، کہ جعرانہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس تھے اور حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ آپ کے ساتھ تھے، اتنے میں ایک بدو آیا اور کہنے لگا۔ محمد۔ تم نے مجھ سے جو وعدہ کیا تھا اس کو پورا نہیں کرتے ''آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، بشارت لو'' اس نے کہا۔ بشارت لو تو بارہا کہہ چکے، مجھے تو مال چاہیے پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم غصہ میں میرے اور بلال کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا۔ اس نے بشارت کو رد کیا ہے لہٰذا تم دونوں بشارت لے لو ہم نے عرض کیا۔ ''ہم نے لے لی، اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پیالہ منگایا جس میں پانی تھا اور اس میں ہاتھ منہ دھو کر کلی ڈال دی پھر فرمایا۔ اس کو پی لو اور منہ اور سینے پر بھی ڈال لو۔ پس ہم نے پیالہ لے کر حسب ارشاد عمل کیا تو ام المومنین حضرت ام سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے پردے کے پیچھے سے پکارا کہ ''اپنی ماں کے لیے بھی برتن میں کچھ بچا کر رکھنا۔ چنانچہ ہم نے ان کے لیے اس میں سے کچھ بچا رکھا۔ (مسلم)

مضمون: ۳۴

سفارش ضرور کیجیے مگر..........؟

سفارش کرنا بڑے اجر وثواب کا کام ہے، بشرطیکہ اس سے کسی اللہ کے بندے کو فائدہ پہنچانا اور ثواب حاصل کرنا مقصود ہو۔ احسان جتلانا مقصود نہ ہو کہ فلاں وقت میں میں نے تمہارا کام بنایا دیا تھا۔ بلکہ اللہ تعالیٰ کو راضی کرنا مقصود ہو کہ اللہ کے ایک بندے کے کام میں، میں نے تھوڑی سی مدد کردی۔ تو اللہ تعالیٰ سے امید ہے کہ اس پر مجھے اجر وثواب عطا فرمائیں گے۔ اس نقطہ نظر سے جو سفارش کی جائے۔ وہ بہت باعث اجر وثواب ہے۔

سفارش کے احکام:

لیکن سفارش کرنے کے کچھ احکام ہیں۔ کس موقع پر سفارش کرنا جائز ہے اور کس موقع پر سفارش کرنا جائز نہیں؟ سفارش کا مطلب کیا ہے؟ سفارش کا نتیجہ کیا ہونا چاہیے؟ کس طرح سفارش کرنی چاہیے؟ یہ ساری باتیں سمجھنے کی ہیں، اور ان کے نہ سمجھنے کی وجہ سے سفارش، جو بہت اچھی چیز بھی تھی۔ فائدہ مند اور باعث اجر وثواب چیز تھی۔ الٹی باعث گناہ بن رہی ہے اور اس سے معاشرے میں فساد پھیل رہا ہے اس لیے ان کو سمجھنا ضروری ہے۔

نااہل کے لیے منصب کی سفارش:

پہلی بات یہ ہے کہ سفارش ہمیشہ ایسے کام کی ہونی چاہیے جو جائز اور برحق ہو۔ کسی ناجائز کام کے لیے یا ناحق کام کے لیے سفارش کسی حالت میں بھی جائز نہیں۔ ایک شخص کے بارے میں آپ جانتے ہیں کہ وہ فلاں منصب اور فلاں عہدہ کا اہل نہیں ہے اور اس نے اس عہدہ کے حصول کے لیے درخواست دے رکھی ہے۔ اور آپ کے پاس سفارش

کے لیے آتا ہے۔ لیکن آپ نے صرف یہ دیکھ کر کہ یہ ضرورت مند ہے۔ سفارش لکھ دی کہ فلاں منصب پر اس کو فائز کر دیا جائے یا فلاں ملازمت اس کو دے دی جائے تو یہ سفارش ناجائز ہے۔

سفارش، شہادت اور گواہی ہے:

اس لیے کہ سفارش جس طرح اس شخص کی حاجت براری کا ایک ذریعہ ہے وہاں ساتھ ساتھ ایک شہادت اور گواہی بھی ہے۔ جب آپ کسی شخص کے حق میں سفارش کرتے ہیں تو آپ اس بات کی گواہی دیتے ہیں کہ میری نظر میں یہ شخص اس کام کے کرنے کا اہل ہے، لہٰذا میں آپ سے یہ سفارش کرتا ہوں کہ اس کو یہ دے دیا جائے۔ تو یہ ایک گواہی ہے، اور گواہی کے اندر اس بات کا لحاظ رکھنا ضروری ہے کہ وہ واقعہ کے خلاف نہ ہو، اگر آپ نے اس شخص کے بارے میں لکھ دیا اور حقیقت میں وہ نا اہل ہے تو گواہی حرام ہوئی۔ اور باعث ثواب ہونے کے بجائے الٹا باعث گناہ بن گئی، اور وہ ایسا گناہ ہے کہ اگر اس کی نا اہلی کے باوجود آپ کی سفارش کی بنیاد پر اس کو اس عہدہ پر رکھ لیا گیا، اور اپنی نا اہلی کی وجہ سے اس نے لوگوں کو نقصان پہنچایا، یا کوئی غلط کام کیا تو سارے نقصان اور غلط کاموں کے وبال کا ایک ایک حصہ سفارش کرنے والے پر ہے۔ لہٰذا یہ سفارش بھی ہے اور گواہی بھی ہے۔ اور ناجائز کام کے لیے سفارش کرنا اور گواہی دینا کسی طرح بھی جائز نہیں۔

ممتحن سے سفارش کرنا:

کسی زمانے میں میرے پاس یونیورسٹی سے ایم اے اسلامک اسٹڈیز کے پرچے جانچنے کے لیے آجایا کرتے تھے اور میں لے بھی لیا کرتا تھا، لیکن لینے کیا شروع کیے کہ اس کے نتیجے میں لوگوں کی قطار لگ گئی۔ کبھی ٹیلیفون آرہا ہے کبھی کوئی شخص آرہا ہے اور آدمی بھی ایسے جو بظاہر بڑے دیانتدار، اور ثقہ قسم کے لوگ باقاعدہ میرے پاس اسی مقصد کے لیے آتے اور ان کے ہاتھوں میں نمبروں کی ایک فہرست ہوتی اور آکر کہتے کہ ان نمبر والوں کا ذرا خاص خیال رکھئے گا۔

سفارش کا ایک عجیب واقعہ:

ایک مرتبہ ایک بڑے عالم شخص بھی اسی طرح نمبروں کی فہرست لے کر آ گئے میں نے ان سے عرض کی کہ حضرت! یہ تو بڑی غلط اور ناجائز بات ہے کہ آپ یہ سفارش لے کر آ گئے ہیں۔ انشاء اللہ حق و انصاف کے مطابق جو جتنے نمبر کا مستحق ہوگا اتنے نمبر لگائے جائیں گے۔ جواباً انہوں نے فوراً قرآن کریم کی آیت پڑھ دی۔

مَنْ يَشْفَعْ شَفَاعَةً حَسَنَةً يَكُنْ لَهُ نَصِيبٌ مِنْهَا

(سورۃ النساء: ۸۵)

مولوی کا شیطان بھی مولوی:

ہمارے والد حضرت مفتی محمد شفیع صاحب قدس اللہ سرہ فرمایا کرتے تھے کہ مولوی کا شیطان بھی مولوی ہوتا ہے عام آدمی کا شیطان تو دوسرے طریقوں سے بہکاتا ہے اور جو شیطان مولوی کو بہکاتا ہے وہ مولوی بن کر بہکاتا ہے۔

ان عالم صاحب نے اس آیت سے استدلال کیا کہ قرآن کریم میں ہے کہ سفارش کرو۔ اس لیے کہ سفارش بڑے اجر و ثواب کا کام ہے۔ اس لیے میں سفارش لے کر آیا ہوں۔ خوب سمجھے کہ یہ سفارش جائز نہیں۔

سفارش سے منصب کا ذہن خراب نہ کریں:

کسی قاضی اور جج کے پاس تصفیہ کے لیے فیصلہ درپیش ہے اور اس کے سامنے فریقین کی طرف سے گواہیاں پیش ہو رہی ہیں۔ اس وقت میں اگر کوئی یہ سفارش کرے کہ فلاں کا ذرا خیال رکھئے گا۔ یا فلاں کے حق میں فیصلہ کر دیجیے گا تو یہ سفارش جائز نہیں اور جو ممتحن امتحان لے رہا ہے اس کے پاس بھی سفارش لے کر جانا جائز نہیں۔ اس واسطے کہ اس سفارش کے نتیجے میں اس کا ذہن خراب ہو سکتا ہے اور وہ قاضی تو اسی کام کے لیے بیٹھا ہے کہ دونوں طرف کے معاملات کو تول کر پھر اپنا فیصلہ دے کہ کون حق پر ہے اور کون ناحق پر ہے۔

عدالت کے جج سے سفارش کرنا:

اس لیے شریعت میں اس کا بہت اہتمام کیا گیا کہ جب ایک قاضی کے سامنے کوئی مقدمہ درپیش ہو، تو اس قاضی کے لیے حکم یہ ہے کہ اس مقدمہ سے متعلق کسی ایک فریق کی غیر موجودگی میں نہ سنے، جب تک دونوں فریق موجود نہ ہوں کہیں ایسا نہ ہو کہ ایک شخص نے آکر آپ کو تنہائی میں معاملہ بتادیا اور دوسرا آدمی اس سے بے خبر ہے۔ وہ اس کا جواب نہیں دے سکتا، اور وہ بات آپ کے ذہن پر مسلط ہوگئی اور آپ کا ذہن اس سے متاثر ہوگیا تو یہ انصاف کے خلاف ہے اس واسطے جب معاملہ قاضی کے پاس چلا جائے تو اس کے بعد سفارش کا دروازہ بند۔

تو ایسے موقع پر یہ کہنا کہ قرآن کریم میں ہے کہ:

مَنْ يَّشْفَعْ شَفَاعَةً حَسَنَةً يَّكُنْ لَّهٗ نَصِيْبٌ مِّنْهَا

(سورۃ النساء: ۸۵)

کسی طرح بھی جائز نہیں چونکہ ہمارے یہاں عرصہ دراز سے اسلام کا نظام قضاء ختم ہوگیا ہے۔ اس لیے یہ مسائل بھی لوگوں کو یاد نہیں رہے۔ اچھے اچھے پڑھے لکھے علماء بھی بھول جاتے ہیں کہ ایسا کرنا جائز نہیں ان کی طرف سے بھی سفارش آجاتی ہے۔ سب سے پہلی بات یہ ہوئی کہ سفارش ایسی جگہ کرنی چاہیے جہاں سفارش جائز ہے۔

بری سفارش گناہ ہے:

دوسری بات یہ ہے کہ سفارش ایسے کام کے لیے ہونی چاہیے جو کام شرعاً جائز ہو، لہٰذا ناجائز کام کرانے کے لیے سفارش کرنا کسی حال میں جائز نہیں۔ مثلاً آپ کا دوست کہیں افسر لگا ہوا ہے۔ اور اس کے ہاتھ میں اختیارات ہیں اور آپ نے اس سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے کسی نااہل کو بھرتی کرادیا تو یہ جائز نہیں، بلکہ حرام ہے، اس لیے قرآن کریم میں جہاں اچھی سفارش کو باعث اجر قرار دیا گیا ہے وہاں بری سفارش کو باعث گناہ قرار دیا گیا ہے فرمایا:

مَنْ يَّشْفَعْ شَفَاعَةً سَيِّئَةً يَّكُنْ لَّهٗ كِفْلٌ مِّنْهَا ط

(سورۃ النساء: ۸۵)

”جو شخص بری سفارش کرے گا تو اس سفارش کرنے والے کو بھی اس گناہ میں سے حصہ ملے گا۔“

سفارش کا مقصد صرف توجہ دلانا:

یہ بات تو اہم ہے ہی، اور لوگ اعتقادی طور پر اس کو جانتے بھی ہیں کہ ناجائز سفارش نہیں کرنی چاہیئے .... لیکن اس سے بھی آگے ایک اور مسئلہ ہے۔ جس کی طرف عموماً دھیان نہیں اور آج کل لوگ اس کا بالکل خیال نہیں کرتے۔ وہ یہ ہے کہ لوگ آج کل سفارش کی حقیقت نہیں سمجھتے سفارش کی حقیقت یہ ہے کہ جس کے پاس سفارش کی جا رہی ہے اس کو صرف توجہ دلانا ہے۔ آپ نے اپنی سفارش کے ذریعے یہ توجہ دلا دی کہ اگر تم کرنا چاہو تو کر لو، سفارش کا مقصد یہ نہیں ہے کہ اس پر دباؤ اور پریشر ڈالا جائے کہ وہ یہ کام ضرور کرے، اس لیے کہ ہر انسان کے اپنے کچھ حالات ہوتے ہیں، اور اس کے کچھ قواعد اور ضوابط اور اصول ہوتے ہیں، اور وہ آدمی ان اصولوں کے تحت رہ کر کام کرنا چاہتا ہے۔ اب آپ نے سفارش کر کے اس پر دباؤ ڈالنا شروع کر دیا، اور دباؤ ڈال کر اس سے کام کرانا چاہا تو یہ سفارش نہیں، زبردستی ہے اور کسی بھی مسلمان کے اوپر زبردستی کرنا جائز نہیں، اس کا عام طور پر لوگ خیال نہیں کرتے۔

ایسے آدمی کی سفارش لے کر جائیں گے جس کے بارے میں یہ خیال ہو کہ جب اس کی سفارش کی جائے گی تو وہ انکار نہ کر سکے گا یہ تو دباؤ ڈالا جا رہا ہے اور شخصیت کا وزن ڈالا جا رہا ہے یہ سفارش نہیں ہے۔

یہ تو دباؤ ڈالنا ہے:

کئی لوگ میرے پاس بھی سفارش کرانے آئے ایک صاحب آئے اور آ کر کہا کہ حضرت! آپ سے ایک کام کے لیے کہنا ہے، لیکن پہلے یہ بتایئے کہ آپ انکار تو نہیں کریں گے؟ گویا اس کا اقرار پہلے لینا چاہتے ہیں کہ انکار مت کیجیے گا میں نے کہا بھائی! پہلے بتاؤ تو سہی کہ کیا کام ہے؟ وہ کام میری قدرت میں ہے یا نہیں؟ میری استطاعت میں ہے یا نہیں؟ میں اس کو کر سکوں گا یا نہیں؟ جائز ہو گا یا ناجائز ہو گا؟ پہلے یہ بتاؤ تو سہی۔

لیکن پہلے یہ اقرار لینا چاہتے ہیں کہ آپ پہلے یہ طے کرلیں کہ اس کام کو ضرور کریں گے۔ یہ سفارش نہیں ہے۔ بلکہ یہ دباؤ ڈالنا ہے جو جائز نہیں ہے۔

سفارش کے بارے میں

حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی کا فرمان:

ہمارے حضرت حکیم الامت قدس اللہ سرہٗ .... اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائے۔ آمین

حقیقت یہ ہے کہ دین کی صحیح فہم اللہ تعالیٰ نے ان کو عطا فرمائی اور ملفوظات میں جگہ جگہ اس پر تنبیہ فرمائی۔ فرماتے ہیں کہ سفارش اس طرح نہ کراؤ جس سے دوسرا آدمی مغلوب ہوجائے۔ جس سے دباؤ پڑے۔ یہ سفارش جائز نہیں، اس لیے کہ سفارش کی حقیقت ''توجہ دلانا'' ہے کہ میرے نزدیک یہ شخص حاجت مند ہے اور میں آپ کو متوجہ کررہا ہوں کہ یہ اچھا مصرف ہے۔ اس پر اگر آپ کچھ خرچ کردیں تو انشاء اللہ اجر و ثواب ہوگا یہ نہیں کہ اس کام کو ضرور کرو، اگر تم نہیں کروگے تو میں ناراض ہوجاؤں گا، خفا ہوجاؤں گا یہ سفارش نہیں ہے دباؤ ہے۔

سفارش کے الفاظ کیا ہوں؟:

یہ بات خوب اچھی طرح سمجھ لینی چاہیئے کہ سفارش کا انداز دباؤ ڈالنے والا نہ ہو۔ اسی لیے حضرت حکیم الامت قدس اللہ سرہٗ جب کسی کے نام سفارش لکھتے تو اکثر و بیشتر یہ الفاظ لکھتے کہ ''میرے خیال میں یہ صاحب اس کام کے لیے موزوں ہیں اگر آپ کے اختیار میں ہو اور آپ کی مصلحت اور اصول کے خلاف نہ ہو تو ان کا کام کردیجیے۔ اور میرے والد ماجد رحمہ اللہ تعالیٰ علیہ بھی انہی الفاظ میں سفارش لکھتے تھے۔

بشکریہ

ماہنامہ تدریس القرآن (کراچی)

جون ۱۹۹۵ء

مضمون: ۳۵

دُہرے پیمانے

قرآن کریم نے ناپ تول میں کمی کرنے کو جرم عظیم قرار دے کر جس طرح صحیح صحیح ناپنے اور تولنے کا حکم دیا ہے، اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ یہ حکم صرف ایک جگہ بیان کرنے پر اکتفا نہیں کیا گیا بلکہ اسے بار بار مختلف انداز اور اسلوب سے انتہائی تاکید کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر مندرجہ ذیل آیات کریم کا ترجمہ ملاحظہ فرمایئے:

''اور انصاف کے ساتھ پورا پورا ناپو اور تولو۔'' (انعام:۱۵۲)

''پس پورا پورا ناپو اور تولو اور لوگوں کی چیزوں میں کمی نہ کرو۔''

(الاعراف:۸۵)

''اور ناپ تول انصاف کے ساتھ پورا پورا رکھو۔'' (ہود:۸۵)

''جب کوئی چیز ناپ کر دو تو پورا پورا ناپو اور ٹھیک ٹھیک ترازو سے تولو۔'' (بنی اسرائیل:۳۵)

''پورا پورا ناپو اور (دوسروں کو) نقصان پہنچانے والے نہ بنو اور ٹھیک ٹھیک ترازو سے تولو۔'' (الشعراء:۱۸۱)

''اور اللہ نے آسمان کو بلند کیا اور ترازو بنایا، تاکہ تم تولنے میں حد سے تجاوز نہ کرو اور وزن کو انصاف کے ساتھ قائم رکھو اور ترازو کو گھٹاؤ نہیں۔'' (الرحمٰن:۷)

قرآن کریم نے جس صراحت اور جس تاکید کے ساتھ بار بار ناپ تول میں انصاف سے کام لینے پر زور دیا ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ناپ تول میں بے انصافی قرآن کریم کے نزدیک ان بنیادی بیماریوں میں سے ہے جو معاشرتی خرابیوں کی جڑ کی حیثیت رکھتی ہیں اور جنہیں مٹانے کے لیے انبیاء کرام علیہم السلام دنیا میں بھیجے گئے

ہیں۔

سوال یہ ہے کہ کیا ناپ تول میں کمی کا مطلب صرف یہ ہے کہ جو شخص ترازو سے تول کر یا پیمانے سے ناپ کر کوئی چیز بیچ رہا ہو وہ ڈنڈی مار کر سودا کم دے؟ یقیناً ناپ تول میں کمی کرنے کا براہ راست مفہوم یہی ہے لیکن جس اسلوب و انداز سے قرآن کریم نے اس برائی کا ذکر فرمایا ہے اس پر غور کیا جائے تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ یہ برائی صرف اسی ایک صورت میں منحصر نہیں ہے بلکہ اس میں ہر وہ اقدام شامل ہے جس کے ذریعہ کوئی شخص دوسرے کا کسی بھی قسم کا حق پامال کرے یا انصاف کے مطابق اس کا حق پورا پورا نہ دے۔

دراصل قرآن کریم نے ''ترازو'' کا لفظ عدل و انصاف اور ایفائے حقوق کی ایک علامت کے طور پر استعمال فرمایا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سورۃ الشوریٰ اور سورۃ الحدید میں ''ترازو'' کو ''آسمانی کتب'' کے ساتھ ملا کر ذکر کیا گیا ہے۔ سورۃ الشوریٰ میں پہلے ہے:

> ''اللہ وہ ہے جس نے حق پر مشتمل کتاب اتاری اور ترازو (نازل کی)۔'' (الشوریٰ:۱۷)

اور سورۃ الحدید میں اس بات کو مزید واضح کر کے فرمایا گیا:

> ''اور ہم نے ان (پیغمبروں) کے ساتھ کتاب اور ترازو اتاری تاکہ لوگ انصاف قائم کریں۔'' (الحدید:۲۵)

اب ظاہر ہے کہ کوئی بھی پیغمبر اپنے ہاتھ میں وہ ترازو لے کر نہیں آئے جس سے سودا تولا جاتا ہے۔ لہٰذا یہاں ''ترازو'' کا واضح مطلب ''عدل و انصاف'' اور ''ادائے حقوق'' کی معنوی ترازو ہے اور ''کتاب'' کے ساتھ ملا کر ''ترازو'' کا ذکر کر کے اس طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ اگر آسمانی کتاب نظریاتی ہدایت فراہم کرتی ہے۔ تو پیغمبر کا قول و فعل لوگوں کے سامنے وہ بچا تلا امتیاز کھینچ دیتا ہے جو حق اور ناحق کے درمیان واضح خط امتیاز کھینچ دیتا ہے اور جس کی روشنی میں حقوق کی رتی رتی کا حساب رکھا جا سکتا ہے۔

اس سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ ناپ تول میں کمی کا لفظ ایک بہت وسیع مفہوم رکھتا ہے۔ جس میں ہر قسم کی حق تلفی داخل ہے۔ جب بھی کوئی شخص دوسرے کا کوئی حق ٹھیک ٹھیک ادا نہ کرے تو وہ ''ناپ تول'' میں کمی کا مرتکب ہے۔ اور اس کا یہ فعل اتنا ہی

قابل نفرت وملامت ہے جتنا سودا بیچتے وقت ڈنڈی مارنے کا عمل، جسے ہر شخص ذلالت اور کمینگی کی علامت سمجھتا ہے۔ لہٰذا ''ناپ تول'' کے سلسلے میں قرآن کریم کے جو ارشادات اوپر بیان کیے گئے ہیں ان کا مخاطب ہر وہ شخص ہے جس کے ذمہ دوسرے کا کوئی حق ہو۔ شوہر کے لیے ان ارشادات کا مطلب یہ ہے کہ ''بیوی کا حق پورا پورا ادا کیا کرو'' اور بیوی کے لیے ان کا مطلب یہ ہے کہ شوہر کا حق پورا پورا ادا کرو۔'' حکومت کے لیے ان کا مطلب یہ ہے کہ ''عوام کا حق پورا پورا دو۔'' اور عوام کے لیے ان کا تقاضا یہ ہے کہ ''حکومت کا حق پورا پورا ادا کرو۔'' ملازم کے لیے ان ارشادات میں یہ ہدایت ہے کہ انتظامیہ کی طرف سے جو فرائض تمہارے سپرد کیے گئے ہیں اور جن کے معاوضے میں تمہیں تنخواہ دیا، اجرت دی جارہی ہے۔ وہ ٹھیک ٹھیک دیانت داری کے ساتھ بجالاؤ اور انتظامیہ کے لیے ان ارشادات میں یہ تاکید ہے کہ ملازم کے وہ تمام حقوق اسے پورے پورے پہنچاؤ جن کے معاوضے میں تم اس کی محنت سے استفادہ کررہے ہو۔ غرض دنیا میں دوطرفہ تعلقات کا کوئی شعبہ ایسا نہیں ہے جس کے لیے ان آیات کریمہ میں جامع رہنمائی موجود نہ ہو۔

پھر قرآن کریم نے مزید آگے بڑھ کر یہ بھی واضح کیا ہے کہ ''ناپ تول میں کمی'' کی بدترین شکل یہ ہے کہ انسان اپنے اور دوسرے کے لیے الگ الگ پیمانے بنالے یعنی جب کسی کو دینے کا وقت آئے تو ناپ تول میں ڈنڈی ماری جائے۔ لیکن جب خود اپنا حق وصول کرنے کا وقت آئے تو ایک رتی چھوڑنے کو تیار نہ ہو، ایسے لوگوں کے لیے قرآن کریم نے انتہائی مؤثر انداز میں وعید بیان فرمائی ہے کہ:

> براہوان ناپ تول میں کمی والوں کا جو لوگوں سے ناپ کر لیتے ہیں تو پورا پورا لیتے ہیں اور جب انہیں ناپ کر یا تول کر دیتے ہیں تو کمی کرتے ہیں۔ کیا ایسے لوگوں کو ذرا خیال نہیں کہ وہ ایک زبردست دن میں اٹھائے جائیں گے۔ اس دن جب تمام انسان رب العالمین کے حضور کھڑے ہوں گے؟'' (التطفیف: ۱۔۳)

یہاں پھر اگرچہ لفظ ''ناپ تول میں کمی'' کا استعمال کیا گیا ہے، لیکن اس کے وسیع مفہوم میں ہر قسم کی حق تلفی داخل ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ اس

آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ:

"پورا تولنا اور کم تولنا ہر کام میں ہو سکتا ہے۔"

لہٰذا اس آیت میں اصولی مذمت ان لوگوں کی بیان کی گئی ہے جنہوں نے زندگی کے معاملات میں دہرے پیمانے بنا رکھے ہیں، جن کے لینے کا پیمانہ کچھ اور ہے، دینے کا کچھ اور، جو اپنا مفاد حاصل کرنے میں بڑے تیز طرار اور دوسرے کا حق دینے میں بڑے بخیل اور خسیس ہیں اور جو دن رات عدل وانصاف کا خون کر کے اپنی دولت کی گنتی میں اضافہ کرتے ہیں، لیکن اس بات کی ذرا پروا نہیں کرتے کہ اللہ تعالیٰ کے سامنے پیشی کے وقت دولت کا یہ ظاہری اضافہ ان کے لیے کس ذلت و رسوائی اور کس عذاب کا سبب بنے گا؟

مقام حسرت ہے کہ آج ہم نے حقوق وفرائض کی ناپ تول میں اللہ کی اتاری ہوئی ترازو کے بجائے زندگی کے تقریباً ہر شعبے میں ان خود ساختہ "دہرے پیمانوں" کو اختیار کیا ہوا ہے اور اپنے آپ کو قرآن کریم کی اس سنگین وعید کا مستحق بنا رکھا ہے۔

اگر ایک آجر اپنے مزدور سے اس کی آزاد مرضی کے بغیر مقررہ وقت سے زیادہ کام لیتا ہے اور اس اضافی محنت کا اسے الگ معاوضہ دینے کو تیار نہیں ہوتا تو وہ اپنے اس "دہرے پیمانے" کی وجہ سے قرآن کریم کی اس وعید میں داخل ہے اور اس طرح اس نے مزدور سے زائد خدمت لے کر جو فائدہ حاصل کیا ہے وہ اس کے لیے حرام ہے۔

اسی طرح اگر ایک مزدور یا غلام اپنی ڈیوٹی کے مقررہ اوقات میں اپنے فرائض انجام دینے کے بجائے کام چوری کا مظاہرہ کرتا ہے یا اس وقت میں کوئی ذاتی کام انجام دیتا ہے، لیکن تنخواہ پوری وصول کرتا ہے، تو وہ بھی اس قرآنی وعید کا مصداق ہے اور اس کی تنخواہ کا وہ حصہ حرام ہے، جو ذاتی کام میں خرچ کیے ہوئے وقت کے مقابل ہو۔ یہاں تک کہ ایک ملازم کے لیے اپنی ڈیوٹی کے اوقات میں جب کہ اس کے پاس اپنی ڈیوٹی سے متعلق کرنے کا کام موجود ہو، کوئی نفلی عبادت مثلاً نماز یا تلاوت وغیرہ جیسی عبادت کرنا بھی جائز نہیں، اس کے ذمے اس وقت کا فریضہ یہ ہے کہ وہ اپنے فرائض منصبی تندہی اور دیانت داری سے ادا کرے۔

یہ بات قلم پر آئی تو یہ بھی ذکر کر دینا مناسب ہے کہ اس معاملہ میں بھی ہمارے

یہاں افراط و تفریط پائی جاتی ہے۔ بعض ملازمین ڈیوٹی کے اوقات میں نفلی عبادتیں شروع کر دیتے ہیں، حالاں کہ اس کے ذمے کام پڑا ہوا ہوتا ہے۔ لیکن دوسری طرف انتظامیہ کے بعض افراد اپنے ملازمین کو پانچ وقت کی فرض نمازوں کی ادائیگی کا بھی موقع نہیں دیتے۔ حالاں کہ فرض نماز کی ادائیگی بہر صورت ضروری ہے اور انتظامیہ کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے ملازمین کے لیے اس کا انتظام کرے۔ یہ درست ہے کہ ملازم آٹھ گھنٹے ڈیوٹی دینے کا پابند ہے۔ لیکن طبعی ضروریات کی انجام دہی خود بخود اس مدت سے مستثنیٰ ہے۔ فرض نماز بھی اتنی ہی ضروری ہے جتنی انسان کی طبعی ضروریات لہٰذا اس کی ادائیگی کا وقت بھی ڈیوٹی سے خود بخود مستثنیٰ ہوگا۔ البتہ ملازم کا فریضہ یہ ہے کہ وہ اعتدال کے ساتھ نماز فرض (سنتوں سمیت) ادا کرنے پر اکتفا کرے اور اس میں ناواجبی دیر نہ لگائے، نہ کسی اور نفلی عبادت میں مشغول ہو۔

یہ بات تو ضمنی طور پر بیچ میں آ گئی۔ کہنا یہ تھا کہ ہم میں سے ہر شخص کو اپنے حالات کا جائزہ لے کر یہ دیکھنا چاہیے کہ ہم اپنا حق پورا لے کر دوسرے کے حق میں کوتاہی کرنے کے مرتکب تو نہیں ہو رہے؟ ہم نے اپنے اور دوسروں کے لیے الگ الگ پیمانے تو نہیں بنا رکھے؟ ہم دوسروں سے اس چیز کا مطالبہ تو نہیں کر رہے جو ان کی جگہ ہونے کی صورت میں انہیں دینے کے لیے تیار نہ ہوتے؟ جب تک یہ فکر ہمارے دلوں میں پیدا نہیں ہوگی اور ہم قرآن کریم کی اس وعید میں داخل ہونے سے ڈرنے نہیں لگیں گے، اس وقت تک ان حق تلفیوں اور بدعنوانیوں میں کمی نہیں آئے گی۔ جنہوں نے زندگی کو اجیرن بنا رکھا ہے اور جن کی وجہ سے ہر انسان خوف و ہراس، تشویش اور بے چینی کا شکار ہے، کیوں کہ جب معاشرے میں حق تلفیوں کا بازار گرم ہوتا ہے تو اس کا لازمی نتیجہ سب کی پریشانی کے سوا کچھ نہیں ہوتا ہے۔ ایک شخص اگر دس آدمیوں کی حق تلفی کرتا ہے تو دوسرے دس آدمی اس کا حق اڑا لے جاتے ہیں اور آخر میں فتح صرف شیطان کی ہوتی ہے۔

مضمون:۳۶

تجارت جنت یا جہنم کا راستہ

جو تاجر تجارت کے اندر سچائی اور امانت کو اختیار کرے تو وہ قیامت کے دن انبیاء، صدیقین رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین اور شہداء رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ ہوگا۔ یہ تجارت جس کو ہم اور آپ دنیا کا ایک کام سمجھتے ہیں اور دل میں یہ خیال رہتا ہے کہ یہ تجارت ہم اپنے پیٹ کی خاطر کر رہے ہیں اور اس کا بظاہر دین سے کوئی تعلق نہیں ہے، لیکن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرما رہے ہیں کہ:

> ''اگر تاجر میں دو باتیں پائی جائیں۔ ایک یہ کہ وہ صدوق ہو اور امین ہو۔ (صدوق کے لفظی معنی ہیں ''سچا'' اور امین کے معنی ہیں ''امانت دار'') اگر یہ دو صفتیں اس میں پائی جائیں تو قیامت کے دن وہ انبیاء علیہ السلام کے ساتھ اٹھایا جائے گا۔ ایک سچائی اور ایک امانت۔''

تاجروں کا حشر فاجروں کے ساتھ:

دوسری حدیث جو بظاہر اس کے متضاد ہے۔ اس میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں:

> ''تجار'' قیامت کے دن فجار بنا کر اٹھائے جائیں گے (''فجار'' فاجر کی جمع ہے۔ یعنی فاسق وفاجر اور گناہ گار جو اللہ تعالیٰ کی نافرمانیوں کا ارتکاب کرنے والا ہے) سوائے اس شخص کے جو تقویٰ اختیار کرے اور نیکی اختیار کرے اور سچائی اختیار کرے۔

تاجروں کی دو قسمیں:

یہ دونوں حدیثیں انجام کے لحاظ سے بظاہر متضاد نظر آتی ہیں کہ پہلی حدیث میں

فرمایا کہ نبیوں کے ساتھ ہوں گے۔ صدیق اور شہداء کے ساتھ ہوں گے۔ اور دوسری حدیث میں فرمایا کہ فساق اور فجار کے ساتھ ہوں گے۔ لیکن الفاظ کے ترجمہ ہی سے آپ نے سمجھ لیا ہوگا کہ حقیقت میں دونوں حدیثوں میں کوئی متضاد نہیں ہے۔ بلکہ تاجروں کی دو قسمیں بیان کی ہیں۔ ایک قسم وہ ہے جو انبیاء علیہ السلام اور صدیقین رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کے ساتھ ہوگی، اور ایک قسم وہ ہے جو فاجروں اور فاسقوں کے ساتھ ہوگی۔ اور دونوں قسموں میں فرق بیان کرنے کے لیے جو شرائط بیان فرمائیں وہ یہ ہیں کہ سچائی ہو، امانت ہو، تقویٰ ہو، نیکی ہو، تو پھر وہ تاجر پہلی قسم میں داخل ہے اور اس کو انبیاء کے ساتھ اٹھایا جائے گا۔ اور یہ شرائط جس تاجر کے اندر نہ ہوں بلکہ صرف پیسہ حاصل کرنا مقصود ہو جس طرح بھی ممکن ہو۔ چاہے دوسرے کی جیب پر ڈاکہ ڈال کر ہو، دھوکہ دے کر ہو، جھوٹ بول کر ہو، دغا دے کر ہو، کسی بھی طریقے سے ہو تو پھر وہ تاجر دوسری قسم میں داخل ہے کہ اس کو فاسقوں اور فاجروں کے ساتھ اٹھایا جائے گا۔

تجارت، جنت کا سبب یا جہنم کا سبب:

اگر دونوں حدیثوں کو ہم ملا کر دیکھیں تو بات واضح ہو جاتی ہے کہ تجارت تو ہم کر رہے ہیں۔ لیکن اگر ہم چاہیں تو اس تجارت کو جنت تک پہنچنے کا راستہ بنالیں۔ انبیاء علیہ السلام کے ساتھ حشر ہونے کا ذریعہ بنالیں اور اگر چاہیں تو اسی تجارت کو جہنم کا راستہ بنالیں اور فساق فجار کے ساتھ حشر ہونے کا ذریعہ بنالیں اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے اس دوسرے انجام سے ہمیں محفوظ رکھے۔

ہر کام میں دو زاویے:

اور یہ بات صرف تجارت کے ساتھ خاص نہیں ہے۔ بلکہ دنیا کے جتنے کام ہیں۔ خواہ وہ ملازمت ہو یا تجارت، زراعت ہو یا کوئی اور دنیا کا کام۔ ان سب میں یہی بات ہے کہ اگر اس کو انسان ایک زاویئے سے اور ایک طریقے سے دیکھے تو وہ دنیا ہے اور اگر دوسرے زاویئے سے دیکھے تو وہی دین بھی ہے۔

زاویہ نگاہ بدل دیں:

دین درحقیقت صرف زاویہ نگاہ کی تبدیلی کا نام ہے۔ اگر آپ وہی کام دوسرے زاویہ سے کریں۔ دوسری نیت سے کریں، دوسرے ارادے سے کریں۔ دوسرے نقطۂ نظر سے کریں تو وہی چیز جو بظاہر ٹھیٹ دنیاوی چیز نظر آرہی ہے وہی دین بن جاتی ہے۔

کھانا کھانا عبادت ہے:

اگر انسان کھانا کھا رہا ہے۔ تو بظاہر انسان اپنی بھوک دور کرنے کے لیے کھانا کھا رہا ہے۔ لیکن اگر کھانا کھاتے وقت یہ نیت ہو میرے نفس کا مجھ پر حق ہے۔ میری ذات کا میرے وجود کا مجھ پر حق ہے اور اس حق کی ادائیگی کے لیے میں یہ کھانا کھا رہا ہوں اور اس لیے کھا رہا ہوں کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی ایک نعمت ہے اور اس نعمت کا حق یہ ہے کہ میں اس کی طرف اشتیاق کا اظہار کروں اور اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کر کے اس کو استعمال کروں تو وہی کھانا جو بظاہر لذت حاصل کرنے کا ذریعہ تھا اور بظاہر بھوک دور کرنے کا ذریعہ تھا پورا کھانا دین اور عبادت بن جائے گا۔

حضرت ایوب علیہ السلام اور سونے کی تتلیاں:

لوگ سمجھتے ہیں دین یہ ہے کہ دنیا چھوڑ کر کسی گوشے میں بیٹھ جاؤ اور ''اللہ اللہ'' کرو۔ بس یہی دین ہے۔ حضرت ایوب علیہ السلام کا نام آپ نے سنا ہوگا۔ کون مسلمان ہے جو ان کے نام سے واقف نہیں ہے۔ بڑے بڑے اولوالعزم پیغمبر امتحانات اور آزمائش سے گزرے ہیں۔ ان کا ایک واقعہ صحیح بخاری میں مروی ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ایک مرتبہ وہ غسل (نہا رہے) کر رہے تھے۔ اور غسل کے دوران آسمان سے ان پر سونے کی تتلیوں کی بارش شروع ہوگئی۔ حضرت ایوب علیہ السلام غسل کو چھوڑ چھاڑ کر ان تتلیوں کو پکڑنے اور جمع کرنے میں لگ گئے۔ اس وقت اللہ تبارک و تعالیٰ نے حضرت ایوب علیہ السلام سے پوچھا اے ایوب! کیا ہم نے تم کو پہلے ہی سے بیشمار نعمتیں نہیں دے رکھی ہیں؟ تمہاری ضروریات کا سارا انتظام کر رکھا ہے۔ ساری کفالت کر رکھی ہے۔ پھر بھی تمہیں حرص ہے اور تتلیوں کو جمع کرنے کی طرف بھاگ رہے

ہو؟ حضرت ایوب علیہ السلام نے کیا عجیب جواب دیا۔ اے پروردگار جب آپ میرے اوپر کوئی نعمت نازل فرمائیں تو یہ بات ادب کے خلاف ہے کہ میں اس سے بے نیازی کا اظہار کروں۔ جب آپ خود اپنے فضل سے یہ نعمت عطا فرما رہے ہیں تو اب اگر میں بیٹھا رہوں اور یہ کہوں کہ مجھے تو یہ سونا چاندی نہیں چاہیے۔ میں تو اس پر ٹھوکر مارتا ہوں تو یہ بے ادبی کی بات ہے۔ آپ کی عطا پر میرا یہ فرض ہے کہ میں اشتیاق کے ساتھ اس کو لوں، اس کی قدر پہچانوں اور اس کا شکریہ ادا کروں۔ اس لیے میں آگے بڑھ کر ان کو جمع کر رہا ہوں۔ یہ ایک پیغمبر کی آزمائش تھی۔ ورنہ اگر کوئی خود ساختہ قسم کا خشک دیندار ہوتا تو وہ یہ کہتا کہ مجھے اس کی ضرورت نہیں۔ میں تو اس دنیا کو ٹھوکر مارتا ہوں۔ لیکن وہ چوں کہ حقیقت سے واقف تھے اور جانتے تھے کہ یہی چیز اگر اس نقطۂ نظر سے حاصل کی جائے کہ میرے پروردگار کی دی ہوئی ہے اور اس کی نعمت ہے۔ میں اس کی قدر پہچانوں، اس کا شکر ادا کروں، تو پھر یہ دنیا نہیں ہے بلکہ یہ دین ہے۔ (صحیح بخاری)

نگاہ نعمت دینے والے کی طرف ہو:

ہم لوگ پانچ بھائی تھے اور سب برسر روزگار اپنے اپنے کام میں لگے ہوئے تھے۔ کبھی کبھی عید وغیرہ کے موقع پر جب ہم اکٹھے ہوتے تو حضرت والد صاحب ہمیں بعض اوقات عیدی دیا کرتے تھے۔ وہ عیدی کبھی ۲۰ روپے، کبھی ۲۵ روپے اور کبھی ۳۰ روپے ہوتی۔ مجھے یاد ہے کہ جب والد صاحب ۲۵ روپے دیتے تھے تو ہم کہتے کہ نہیں۔ ہم ۳۰ روپے لیں گے اور جب وہ ۳۰ روپے دیتے تھے تو ہم کہتے کہ نہیں ہم ۳۵ روپے لیں گے اور تقریباً یہ صورت ہر گھر میں ہوتی ہے کہ اولاد چاہے جوان ہوگئی ہو، برسر روزگار ہوگئی ہو کمارہی ہو لیکن اگر باپ دے رہا ہو تو اس سے مچل مچل کر مانگتے ہیں کہ اور دے دیں اور اب وہ باپ کی طرف سے جو ۳۰ روپے دیئے گئے اس کی کوئی حیثیت نہیں تھی۔ اس لیے کہ ہم میں سے ہر بھائی ہزاروں روپے کمانے والا تھا لیکن پھر اس ۳۰ روپے کا شوق، رغبت، اشتیاق اور اس کو حاصل کرنے کے لیے بار بار مچلنا یہ سب کیوں تھا؟ بات دراصل یہ ہے کہ نگاہ اس روپے پر نہیں تھی کہ ۳۰ روپے مل رہے ہیں بلکہ نگاہ اس دینے والے ہاتھ کی طرف تھی کہ وہ ۳۰ روپے کس دینے والے ہاتھ سے مل رہے ہیں۔ یہ ایک

باپ کی طرف سے مل رہے ہیں اور یہ ایک محبت کا اظہار ہے، یہ ایک شفقت کا اظہار ہے۔ یہ ایک نعمت کا اظہار ہے۔ لہٰذا اس کا ادب یہ ہے کہ اس کو اشتیاق و محبت کے ساتھ لیا جائے۔ اس کی قدر پہچانی جائے۔ چناں چہ اس کو خرچ نہیں کرتے تھے۔ بلکہ اٹھا کر لفافے میں بند کر کے رکھ دیتے کہ یہ میرے والد کے دیئے ہوئے ہیں۔ اگر وہی ۳۰ روپے کسی دوسرے آدمی کی طرف سے ملیں اور انسان اس میں لالچ اور رغبت کا اظہار کرے اور اس سے کہے مجھے ۳۰ روپے کے بجائے ۳۵ روپے دو تو یہ شرافت اور مروت کے خلاف ہے۔

اسی کا نام تقویٰ ہے:

دین درحقیقت زاویہ نگاہ کی تبدیلی کا نام ہے اور یہی زاویہ نگاہ جب بدل جاتا ہے تو قرآن کریم کی اصطلاح میں اس کا نام تقویٰ ہے۔ یعنی میں دنیا کے اندر جو کچھ کر رہا ہوں۔ چاہے کھا رہا ہوں، چاہے سو رہا ہوں، چاہے کما رہا ہوں، چاہے ملازمت کر رہا ہوں، چاہے تجارت کر رہا ہوں، جو کچھ کر رہا ہوں، اللہ کے لیے کر رہا ہوں۔ اللہ کے احکام کے مطابق کر رہے ہوں۔ یہی چیز اگر حاصل ہو جائے تو اسی کو تقویٰ کہتے ہیں۔ یہ تقویٰ اگر پیدا ہو جائے اور پھر اس تقویٰ کے ساتھ تجارت کریں تو یہ تجارت دنیا نہیں یہ دین ہے اور یہ جنت تک پہنچانے والی ہے اور نبیوں کے ساتھ حشر کرنے والی ہے۔

صحبت سے تقویٰ حاصل ہوتا ہے:

عموماً دل میں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ تقویٰ کس طرح حاصل ہو؟ یہ زاویہ نگاہ کس طرح بدلا جائے؟ تو اس کے جواب کے لیے قرآن کریم کی یہ آیت واضح ہے۔ اے ایمان والو! تقویٰ اختیار کرو۔ اور قرآن کریم کا اصول یہ ہے کہ جب وہ کسی کام کے کرنے کا حکم دیتا ہے تو اس پر عمل کرنے کا راستہ بھی بتاتا ہے۔ اور ایسا راستہ بتاتا ہے کہ جو ہمارے اور آپ کے لیے آسان ہوتا ہے اور یہ اللہ تعالیٰ کی رحمت ہے کہ وہ محض کسی کام کا حکم نہیں دیتے۔ بلکہ ساتھ میں ہماری ضروریات، ہماری حاجتیں، اور ہماری کمزوریوں کا احساس فرما کر ہمارے لیے آسان راستہ بتاتے ہیں۔ تو تقویٰ حاصل

کرنے کا آسان راستہ بتادیا۔ سچے لوگوں کی صحبت اختیار کرو۔ یہ صحبت جب تمہیں حاصل ہوگی تو اس کا بالآخر نتیجہ یہ ہوگا کہ تمہارے اندر خود تقوی پیدا ہو جائے گا۔ ویسے کتاب میں تقوی کی شرائط پڑھ کر تقوئی اختیار کرنے کی کوشش کرو گے تو یہ راستہ بہت مشکل نظر آئے گا۔ لیکن قرآن نے اس کے حاصل کرنے کا آسان طریقہ یہ بتلادیا کہ جس شخص کو اللہ تعالیٰ نے تقوئی کی دولت عطا فرمائی ہو۔ دوسرے لفظوں میں جس کو "صدق" حاصل ہو اس کی صحبت اختیار کرلو۔ کیوں کہ صحبت کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جس شخص کی صحبت اختیار کی جاتی ہے اس کا رنگ رفتہ رفتہ انسان پر غالب آنے لگتا ہے۔

ہدایت کے لیے صرف کتاب کافی نہیں ہوتی:

دین کو حاصل کرنے اور دین کو سمجھنے کا بھی یہی راستہ ہے۔ نبی کریم سرور دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم اسی لیے تشریف لائے۔ ورنہ سیدھی بات تو یہ تھی کہ صرف کتاب اور قرآن کریم نازل کردیا جاتا اور مشرکین مکہ کا مطالبہ بھی یہی تھا کہ ہمارے اوپر قرآن کریم کیوں نازل نہیں ہوتا؟ اللہ تعالیٰ کے لیے کوئی مشکل نہیں تھا کہ وہ کتاب اس طرح نازل کردیتے کہ جب لوگ صبح بیدار ہوتے تو ہر شخص بہت اچھا اور خوبصورت بائنڈنگ شدہ قرآن کریم اپنے سرہانے موجود پاتا اور آسمان سے آواز آجاتی کہ یہ کتاب تمہارے لیے بھیج دی گئی ہے۔ اس پر عمل کرو لیکن اللہ تعالیٰ نے کوئی کتاب رسول کے بغیر نہیں بھیجی۔ ہر کتاب کے ساتھ ایک رسول بھیجا ہے۔ رسول تو کتاب کے بغیر آئے ہیں لیکن کتاب بغیر رسول کے نہیں آئی، کیوں؟ اس لیے کہ انسان کی ہدایت رہنمائی کے لیے اور اسے کسی خاص رنگ پر ڈھالنے کے لیے صرف کتاب کبھی کافی نہیں ہوتی۔

صرف کتابیں پڑھ کر ڈاکٹر بننے کا نتیجہ:

اگر کوئی شخص چاہے کہ میں میڈیکل سائنس کی کتاب پڑھ کر ڈاکٹر بن جاؤں اور پھر اس نے وہ کتاب پڑھ لی اور اس کو سمجھ بھی لیا اور اس کے بعد اس نے ڈاکٹری اور علاج شروع کردیا تو سوائے قبرستان آباد کرنے کے وہ کوئی خدمت انجام نہیں دے سکتا جب تک کہ وہ کسی ماہر ڈاکٹر کی صحبت اختیار نہ کرے اور اس کے ساتھ کچھ مدت رہ کر کام

نہ کرے اور میں تو آگے بڑھ کر کہتا ہوں کہ بازار میں کھانا پکانے کی کتابیں موجود ہیں جس میں کھانا پکانے کی ترکیبیں لکھی ہوئی ہیں۔ پلاؤ اس طرح بنتا ہے، بریانی اس طرح بنتی ہے، قورمہ ایسے بنتا ہے، اب اگر ایک شخص صرف وہ کتاب اپنے سامنے رکھ کر بریانی بنانا چاہے گا تو خدا جانے وہ کیا ملغوبہ تیار کرے گا۔ بریانی تیار نہیں کر سکتا جب تک کہ کسی ماہر کے ساتھ رہ کر اس کی ٹریننگ حاصل نہ کی ہو اور اس کو سمجھا نہ ہو۔ اس وقت تک وہ تیار نہیں کر سکتا۔

متقی کی صحبت اختیار کرو:

یہی معاملہ دین کا ہے کہ صرف کتاب انسان کو دینی رنگ میں ڈھالنے کے لیے کافی نہیں ہوتی۔ جب تک کہ کوئی معلم اور مربی اس کے ساتھ نہ ہو۔ اس واسطے انبیاء علیہم السلام کو بھیجا گیا اور انبیاء علیہم السلام کے بعد صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کو یہ مرتبہ حاصل ہوا۔ صحابہ کے کیا معنی ہیں؟ صحابہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت اٹھائی۔ انہوں نے جو کچھ حاصل کیا۔ وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت سے حاصل کیا پھر اسی طرح تابعین نے صحابہ کی صحبت سے تبع تابعین نے تابعین کی صحبت سے حاصل کیا۔ تو جو کچھ دین ہم تک پہنچا ہے وہ صحبت کے ذریعہ پہنچا ہے۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ نے بھی تقویٰ حاصل کرنے کا راستہ یہ بتا دیا کہ اگر تقویٰ حاصل کرنا چاہتے ہو تو اس کا آسان راستہ یہ ہے کہ کسی متقی کی صحبت اختیار کرو اور پھر اس صحبت کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ تمہارے اندر بھی وہ تقویٰ پیدا فرما دیں گے۔

بشکریہ روزنامہ جنگ
مورخہ ۴ر جنوری ۱۹۹۴ء

مضمون: ۳۷

قرآن کریم کی اعجازی خصوصیات

یہاں ہم مختصراً ان اہم خصوصیات کو بیان کرنا چاہتے ہیں جن کی بناء پر قرآن کریم کا کلام معجز ہے۔ ظاہر ہے کہ ان خصوصیات کا احاطہ تو بشری طاقت سے باہر ہے تاہم انسان کی محدود بصیرت کے مطابق ان خصوصیات کو چار عنوانات پر تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

۱۔ الفاظ کا اعجاز

۲۔ ترکیب کا اعجاز

۳۔ اسلوب کا اعجاز

۴۔ نظم کا اعجاز

۱۔ الفاظ کا اعجاز:

کسی زبان کا کوئی شاعر یا ادیب، خواہ اپنے فن میں کمال کے کتنے بلند مرتبے کو پہنچا ہوا ہو۔ یہ دعویٰ نہیں کرسکتا کہ اس کے کلام میں کہیں بھی کوئی لفظ غیر فصیح استعمال نہیں ہوا۔ کیوں کہ بسا اوقات انسان اپنے مفہوم کو ادا کرنے کے لیے کسی نہ کسی غیر فصیح لفظ کے استعمال پر مجبور ہو جاتا ہے لیکن پورے قرآن کریم میں ''الحمد سے لے کر والناس'' تک نہ صرف یہ کہ کہیں کوئی ایک لفظ بھی غیر فصیح نہیں ہے بلکہ ہر لفظ جس مقام پر آیا ہے وہاں فصاحت و بلاغت کے اعتبار سے ایسا اٹل ہے کہ اسے بدل کر اسی فصاحت و بلاغت کے ساتھ دوسرا لفظ لانا ممکن ہی نہیں ہے۔ عربی زبان ایک انتہائی وسیع زبان ہے جو اپنے ذخیرۂ الفاظ کے اعتبار سے دنیا کی دولت مند ترین زبانوں میں سے ایک ہے، چنانچہ اس میں ایک مفہوم کے لیے معمولی فرق سے بہت سے الفاظ پائے جاتے ہیں۔ قرآن کریم الفاظ کے اس وسیع ذخیرے میں سے اپنے مقصد کی ادائیگی اور اسلوب کے بہاؤ کے لحاظ سے موزوں ترین ہے۔ یہ بات چند مثالوں سے واضح ہوسکے گی:

(۱) زمانۂ جاہلیت میں ''موت'' کے مفہوم کو ادا کرنے کے لیے بہت سے عربی الفاظ مستعمل تھے۔ مثلاً: ۱۔ موت، ۲۔ ہلاک، ۳۔ فنا، ۴۔ حتف، ۵۔ شعوب، ۶۔ حمام، ۷۔ منون، ۸۔ سام، ۹۔ قاضیہ، ۱۰۔ ہمیغ، ۱۱۔ نیط، ۱۲۔ فود، ۱۳۔ مقدار، ۱۴۔ جباز، ۱۵۔ حلاق، ۱۶۔ طلاطل، ۱۷۔ طلاطلۃ، ۱۸۔ غول، ۱۹۔ ذام، ۲۰۔ کفت، ۲۱۔ جداع، ۲۲۔ حزرۃ، ۲۳۔ خالج، (۱) لیکن ان میں سے اکثر الفاظ کے پس منظر میں اہل عرب کا یہ قدیم نظریہ جھلکتا تھا کہ موت کے ذریعہ انسان کے تمام اجزاء ہمیشہ کے لیے فناء ہو جاتے ہیں اور ان کا دوبارہ زندہ ہونا ممکن نہیں چوں کہ وہ لوگ معاد و آخرت اور حساب و کتاب کے قائل نہیں تھے، اس لیے انہوں نے موت کے لیے جتنے نام تجویز کیے ان سب میں اس نظریہ کی جھلک موجود ہے۔ اگر قرآن کریم اہل عرب کی انہی قدیم تعبیرات پر اکتفا کرتا تو موت کے بارے میں ان کے باطل نظریہ سے کسی درجہ میں موافقت کا شبہ ہوسکتا تھا۔ چناں چہ جس جگہ موت کی حقیقت بیان کرنی تھی وہاں موت کے مفہوم کے لیے قرآن نے مذکورہ تیئس الفاظ کو چھوڑ کر ایک نیا لفظ اختیار کیا ہے اور عربی زبان کو ایک ایسا خوبصورت مختصر، جامع اور فصیح لفظ عطا کیا جس سے موت کی حقیقت بھی واضح ہو جائے اور وہ لفظ ہے، ''توفی'' جس لغوی معنی ہیں۔ ''کسی چیز کو پورا پورا وصول کر لینا'' اس لفظ نے یہ بھی واضح کر دیا کہ موت ابدی فناء کا نام نہیں۔ بلکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے روح قبض کرنے کا نام ہے۔ چناں چہ جب اللہ تعالیٰ چاہے وہ جسم کے منتشر اجزاء کو یکجا کر کے ان میں دوبارہ روح کو لوٹا سکتا ہے۔ ''موت'' کے لیے یہ لفظ قرآن کریم سے پہلے کسی نے استعمال نہیں کیا تھا۔ چناں چہ ابن سیدہ رحمۃ اللہ علیہ نے المخصص میں ''موت'' کے دوسرے الفاظ کے لیے تو اہل عرب کے اشعار سے مثالیں پیش کی ہیں، لیکن ''توفی'' کے لیے قرآن کریم کے سوا کوئی استشہاد پیش نہیں کیا۔

(۲) ہر زبان کے بعض الفاظ ایسے ہوتے ہیں جو صوتی اعتبار سے فصیح اور پسندیدہ نہیں سمجھے جاتے لیکن چوں کہ ان کے مفہوم کی ادائیگی کے لیے کوئی اور متبادل لفظ نہیں ہوتا، اس لیے اہل زبان انہیں استعمال کرنے پر مجبور ہوتے ہیں، لیکن

قرآن کریم ایسے مواقع پر ایسی خوبصورت تعبیر اختیار کرتا ہے کہ ذوق سلیم وجد کر اٹھتا ہے مثلاً عربی میں تعمیر مکان کے لیے پکی اینٹوں کے لیے جتنے الفاظ مستعمل ہیں وہ سب ثقیل متبذل اور ناپسندیدہ سمجھے جاتے ہیں۔ مثلاً **اجُر**"، **قرمد**" اور **طوب**" اب قرآن کریم میں یہ بیان کرنا مقصود تھا کہ فرعون نے اپنے وزیر ہامان کو حکم دیا میرے لیے ایک اونچا محل تعمیر کرنے کے لیے اینٹیں پکاؤ۔ اس واقعے کو ذکر کرنے کے لیے اینٹ کا لفظ استعمال کرنا ناگزیر تھا لیکن قرآن کریم نے اس مفہوم کو ایسے معجزانہ انداز سے ذکر فرمایا ہے کہ مفہوم بھی نہایت حسن کے ساتھ ادا ہو گیا اور ثقیل الفاظ کے استعمال کی قباحت پیدا نہیں ہوئی چناں چہ ارشاد فرمایا:

وَقَالَ فِرعَونُ یَاۤاَیُّهَا الْمَلَاُ مَاعَلِمتُ لَکُم مِّن اِلٰهٍ غَیرِی فَاَوقِدلِی یَاهَامَانُ عَلَی الطِّینِ فَاجعَل لِّی صَرحًا......

"اور فرعون نے کہا کہ اے سرداران قوم! مجھے اپنے سوا تمہارا کوئی معبود معلوم نہیں۔ پس اے ہامان گیلی مٹی پر آگ روشن کر کے میرے لیے ایک محل تعمیر کرو۔" (بحوالہ المثل السائر لابن الاثیر" صفحہ ۱۷)

(۳) عربی میں بعض الفاظ ایسے ہیں جو مفرد ہونے کی حالت میں تو سبک اور فصیح ہیں لیکن ان کی جمع ثقیل سمجھی جاتی ہے، مثلاً زمین کے معنی میں لفظ "ارض" ایک سبک لفظ ہے۔ اس کی دو جمعیں عربی میں مستعمل ہیں، ارضون اور اراضی، یہ دونوں ثقیل سمجھی جاتی ہیں اور ان کی وجہ سے کلام کی سلاست میں فرق واقع ہو جاتا ہے، لیکن جہاں جمع کا مفہوم ادا کرنا ضروری ہوتا ہے وہاں ادبائے عرب انہی کے استعمال پر مجبور ہوتے ہیں۔ اس کے برخلاف قرآن کریم نے بیشتر مقامات پر "سمٰوات" کو بصیغۂ جمع اور اس کے ساتھ ارض کو مفرد استعمال کیا ہے اور کہیں بھی ارض کو بصیغۂ جمع استعمال نہیں فرمایا، البتہ ایک جگہ سات زمینوں کا ذکر کرنا تھا جس کے لیے جمع کا صیغہ لانا ضروری تھا لیکن قرآن نے اس صیغۂ جمع سے احتراز کر کے ایسی خوبصورت تعبیر اختیار کی کہ مفہوم بھی ٹھیک ادا ہو گیا اور نہ

صرف یہ کہ کلام میں کوئی ثقل پیدا ہوا بلکہ اس کے حسن میں چند در چند اضافہ ہو گیا چناں چہ ارشاد ہے:

اَللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ وَّمِنَ الْاَرْضِ مِثْلَهُنَّ

''اللہ وہ ہے جس نے سات آسمان پیدا کیے اور زمین میں سے بھی اتنی ہی۔''

دیکھیے، یہاں سماء (آسمان) کی جمع تو لائی گئی، لیکن قرآن نے ارض کو جمع لانے کے بجائے اس کے مفہوم کو ادا کرنے کے لیے وَّمِنَ الْاَرْضِ مِثْلَهُنَّ کی تعبیر اختیار فرمائی جس کے اسرار و نکات پر جس قدر غور کیجیے معجزانہ بلاغت کا دریا موجزن نظر آتا ہے۔

(۴) قرآن کریم کے بعض الفاظ پر بعض ملحدوں نے ثقیل ہونے کا اعتراض کیا ہے مثلاً لفظ ''ضِیْزٰی'' لیکن وہ یہ بات بھول جاتے ہیں کہ بعض الفاظ اپنی ذات میں ثقیل ہوتے ہیں لیکن ادیب انہیں ایسے سلیقے سے استعمال کرتا ہے کہ اس جگہ اس سے بہتر لفظ نہیں لایا جا سکتا۔ اردو میں اس کی مثال یہ ہے کہ ''دھول دھپا'' ایک مبتذل لفظ سمجھا جاتا ہے جسے فصیح و بلیغ عبارتوں میں عموماً استعمال نہیں کیا جاتا لیکن غالب کا یہ شعر دیکھیے:

دھول دھپا اس سراپا ناز کا شیوہ نہیں
ہم ہی کر بیٹھے تھے غالب پیش دستی ایک دن

یہاں یہ لفظ ایسے سلیقے کے ساتھ آیا ہے کہ اگر اس کی جگہ کوئی دوسرا لفظ رکھ دیا جائے تو حسن بیان پر پانی پھر جائے گا۔

عربی میں اس کی مثال یہ ہے کہ گردن کی ایک رگ کا نام ''اخدع'' ہے، عربی کے دو شاعروں نے اس لفظ کو اپنے کلام میں استعمال کیا ہے، لیکن دونوں میں حسن و سلاست کے اعتبار سے زمین و آسمان کا فرق ہے۔ ابو تمام کہتا ہے:

یادھر قوم عن اخدعیک فقد
اضججت ھذا الانام عن خرقک

یہاں یہ لفظ بڑا ثقیل اور بوجھل معلوم ہو رہا ہے، لیکن اس کے بعد حماسہ کے ایک

شاعر عبداللہ بن الصمہ کا یہ شعر پڑھیے:

تلفت نحو الحی حتی وجد تنی
وجعت من الا صغاء لیتاً و اخدعا

اس میں وہی ثقیل لفظ اتنی روانی اور خوبصورتی سے آیا ہے کہ ذوق سلیم پر کوئی گرانی نہیں ہوتی، بلکہ شعر میں مجموعی طور پر جو سوز و گداز پایا جاتا ہے، یہ ثقیل لفظ اس میں پوری طرح فٹ ہو جاتا ہے۔ قرآن کریم میں لفظ ضِیزیٰ بھی ایسے حسن کے ساتھ آیا ہے کہ اس کی جگہ کوئی خوبصورت سے خوبصورت لفظ بھی اس کی ہمسری نہیں کر سکتا ہے:

اَلَکُمُ الذَّکَرُ وَلَهُ الْاُنْثٰی ۝ تِلْکَ اِذًا قِسْمَةٌ ضِیْزٰی ۝

اگر انفرادی طور سے دیکھا جائے تو **"قِسْمَةٌ جَائِرَةٌ" یا "قِسْمَةٌ ظَالِمَةٌ"** کے الفاظ ضیزی کے مقابلہ میں بہتر معلوم ہوتے ہیں لیکن جس سیاق میں لفظ **ضِیْزٰی** قرآن میں آیا ہے وہاں اگر **"جَائِرَةٌ"** یا **"ظَالِمَةٌ"** کے الفاظ رکھ دیئے جائیں تو کلام کی ساری روانی ختم ہو جائے گی۔ (۲)

۲۔ ترکیب کا اعجاز:

الفاظ کے بعد جملوں کی ترکیب، اور نشست کا نمبر آتا ہے۔ اس معاملے میں بھی قرآن کریم کا اعجاز اوجِ کمال پر ہے۔ قرآن کریم کے جملوں کے دروبست میں وہ شوکت، سلاست، اور شیرینی ہے کہ اس کی نظیر پیش نہیں کی جا سکتی۔ یہاں میں صرف ایک مثال پر اکتفا کرتا ہوں۔

قاتل سے قصاص لینا اہل عرب میں بڑی قابل تعریف بات تھی اور اس کے فوائد کو ظاہر کرنے کے لیے عربی میں کئی مقولے مشہور تھے۔ مثلاً:

القتل احیاء للجمیع

"قتل اجتماعی زندگی ہے۔"

اور

القتل انفیٰ القتل

"قتل سے قتل کی روک تھام ہوتی ہے۔"

اور

اکثروا القتل لیقل القتل

''قتل زیادہ کرو تا کہ قتل کم ہو جائے۔''

ان جملوں کو اتنی مقبولیت حاصل تھی کہ یہ زبان زد عام ہو گئے اور فصیح سمجھے جاتے تھے۔ قرآن کریم نے بھی اسی مفہوم کو ادا فرمایا، لیکن کس شان سے؟ ارشاد ہے:

وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ

''اور تمہارے لیے قصاص سے زندگی ہے۔''

جس پہلو سے دیکھئے، بلاغت کا معجز شاہکار معلوم ہوتا ہے، اور پہلے کے تمام جملے اس کے آگے سجدہ ریز دکھائی دیتے ہیں۔

۳۔ اسلوب کا اعجاز:

قرآن کریم کے اعجاز کا سب سے زیادہ روشن مظاہرہ اس کے اسلوب میں ہوتا ہے اور یہ وہ چیز ہے جس کا مشاہدہ ہر کس و ناکس کر سکتا ہے اس کے اسلوب کی اہم معجزانہ خصوصیات مندرجہ ذیل ہیں۔

(۱) قرآن کریم ایک ایسی نثر پر مشتمل ہے جس میں شعر کے قواعد و ضوابط ملحوظ نہ ہونے کے باوجود ایک ایسا لذیذ اور شیریں آہنگ پایا جاتا ہے جو شعر سے کہیں زیادہ حلاوت اور لطافت کا حامل ہے۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ انسان کا جمالیاتی ذوق نظم اور شعر میں ایک ایسی لذت اور حلاوت محسوس کرتا ہے جو نثر میں محسوس نہیں ہوتی۔ اگر آپ اس لذت اور حلاوت کے سبب پر غور فرمائینگے تو معلوم ہوگا کہ اس کا راز درحقیقت لفظوں کی اس ترتیب میں مضمر ہے جو ایک خاص صوتی آہنگ پیدا کرتی ہے۔ عربی، فارسی اور اردو کی قدیم شاعری میں اس آہنگ کی لذت شعر کے خاص اوزان کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے۔ جب ایک ہی صوتی وزن کے الفاظ بار بار کانوں میں پڑتے ہیں تو اس سے ذوق سلیم کو ایک خاص لذت حاصل ہوتی ہے اور پھر جب وزن کے ساتھ قافیہ بھی مل جاتا ہے تو اس کی لذت دو چند ہو جاتی ہے اور جب اس کے ساتھ ردیف کی یکسانیت بھی شامل

ہوجاتی ہے تو لذت میں اور اضافہ ہوجاتا ہے اور اگر مصرعوں کے بیچ بیچ میں عروضی اوزان کے ساتھ صرفی اوزان اور قوافی کی یکسانیت بھی شامل ہوجائے (جیسا کہ مرصّع اشعار میں ہوتا ہے) تو یہ لذت اور بڑھ جاتی ہے۔

لیکن اوزان اور قوافی کے اصول ہر خطے اور ہر زبان میں یکساں نہیں ہوتے، بلکہ ہر زبان کے لوگ اپنے اپنے ذوق اور مزاج کے لحاظ سے اس کے لیے مختلف قواعد مقرر کرتے ہیں۔ مثلاً اہلِ عرب نے اپنی شاعری کو وزن اور قافیہ کے ان سانچوں تک محدود رکھا ہے جو خلیل بن احمد وغیرہ نے وضع کیے ہیں۔ فارسی شاعری میں اوزان کا دائرہ کچھ اور وسیع کیا گیا اور نئی نئی بحریں اختیار کی گئیں، لیکن قافیہ اور ردیف کی پابندی میں زیادہ کڑی شرائط عائد کردی گئیں۔

چناں چہ عربی شاعری میں کبور اور کبیر کو ہم قافیہ سمجھا جاتا ہے اور اگر ایک شعر میں کبور اور دوسرے میں کبیر آرہا ہو تو اسے کوئی عیب نہیں سمجھا جاتا، جب کہ فارسی میں یہ ممکن نہیں، اسی طرح عربی میں اگر ایک ہی کلمہ کا آدھا حصہ پہلے مصرعہ میں اور آدھا دوسرے مصرعے میں ہو تو اسے معیوب نہیں سمجھتے، جب کہ فارسی میں یہ زبردست عیب ہے، بلکہ ایسا شعر، شعر ہی نہیں سمجھا جاتا۔ نیز عربی شاعری میں زحافات اتنے زیادہ ہوتے ہیں کہ بسا اوقات اصلی بحر کچھ سے کچھ بن جاتی ہے جب کہ فارسی میں ایسا نہیں ہوتا۔ اسی طرح عربی شاعری میں ردیف کا کوئی تصور نہیں، جب کہ فارسی میں ردیف کے بغیر غزل پھیکی سمجھی جاتی ہے۔ مزید یہ کہ اصل عربی شاعری میں فارسی کی طرح مثنوی، مستزاد، مخمس، مسدس، رباعی اور قطعہ بند نظموں جیسی اصناف کا وجود نہیں تھا، جب کہ فارسی ان اصناف سے مالا مال رہی ہے اور پھر اسی کے اثر سے اندلس وغیرہ میں موشحات اور ازجال وغیرہ کی اصناف رائج ہوئیں۔

عربی اور فارسی میں ان اختلاف کے باوجود اوزان میں بڑی حد تک اشتراک پایا جاتا ہے لیکن قدیم ہندی شاعری کو دیکھئے تو اس میں معروف عروضی اوزان کے بجائے صرف حروف کی تعداد کا لحاظ ہوتا ہے اور اگر دو لفظوں کے حروف کی تعداد ایک ہو تو انہیں ہم وزن سمجھا جاتا ہے خواہ ان کی حرکات وسکنات میں بڑا فرق ہو۔ بلکہ بعض اوقات ہندی دو لفظوں میں معروف عروضی اوزان وقوافی قافیہ یا ردیف کے قواعد، بلکہ

تعداد حروف تک میں بڑا فرق ہوتا ہے اس کے باوجود انہیں بڑے لطف کے ساتھ پڑھا اور گایا جاتا ہے اور ان کی تاثیر ناقابل انکار ہوتی ہے اور اس معاملے میں انگریزی شاعری کا مزاج شاید سبھی سے زیادہ آزاد واقع ہوا ہے کہ اس میں عروضی اوزان تو کجا، مصرعوں کے طول وعرض میں بھی بسا اوقات زمین وآسمان کا فرق ہوتا ہے، اکثر قافیے کی بھی کوئی خاص رعایت نہیں ہوتی، بلکہ صرف تلفظ کے کھٹکوں (Syllables) سے ایک خاص آہنگ (Rythm) پیدا کیا جاتا ہے اور وہی آہنگ اہل زبان کے لیے ایک خاص لذت وکیف کا سبب بن جاتا ہے۔

اس تفصیل سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ شعر کی لذت وحلاوت میں اوزان وقوافی کے لگے بندھے قواعد کوئی عالمگیر حیثیت نہیں رکھتے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ قواعد مختلف زبانوں اور خطوں میں بدلتے رہتے ہیں، لیکن ایک چیز ہے جو ان سب زبانوں اور تمام قوموں میں قدرِ مشترک کی حیثیت رکھتی ہے اور وہ ہے ایک ''متوازن صوتی آہنگ'' یعنی الفاظ کو اس طرح ترتیب دینا کہ ان کے تلفظ سے اور ان کو سن کر انسان کا جمالیاتی ذوق حظ محسوس کرے لیکن انسان چوں کہ اس قدر مشترک کو اوزان وقوافی معروف کے سانچوں سے الگ کرنے پر قادر نہیں۔ اس لیے جب وہ شاعری کا لطف پیدا کرنا چاہتا ہے تو اسے لازماً اپنے ماحول کے بنائے ہوئے قواعد وضوابط کی پابندی کرنی پڑتی ہے۔

یہ صرف قرآن کریم کا اعجاز ہے کہ اس نے دنیا کے مختلف خطوں میں مقرر کیے ہوئے شعری قواعد میں سے کسی قاعدے کی پابندی نہیں کی بلکہ صرف ''متوازن صوتی آہنگ'' کی اس قدر مشترک کو اختیار کرلیا ہے۔ جو ان سارے قواعد کا اصل مقصود ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نثر ہونے کے باوجود شعر سے زیادہ لطافت اور حلاوت کا حامل ہے اور صرف اہل عرب ہی نہیں بلکہ دنیا کی ہر زبان کے لوگ اسے سن کر غیر معمولی لذت اور تاثیر محسوس کرتے ہیں۔

یہیں سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ بعض کفار عرب نے قرآن کریم کو کس بناء پر شعر قرار دیا تھا؟ ظاہر ہے کہ شعر کی معروف تعریف کسی بھی طرح قرآن کریم پر صادق نہیں آتی اور کفار عرب اپنی ہزار گمراہیوں کے باوجود اتنی حس ضرور رکھتے تھے کہ نثر اور نظم میں تمیز کرسکیں۔ وہ اس بات سے بے خبر نہیں تھے کہ شعر کے لیے وزن اور قافیہ کی پابندی

ضروری ہے جو قرآن کریم میں مفقود ہے۔اس کے باوجود انہوں نے قرآن کریم کو شعر اس بناء پر قرار دیا کہ اس کے اسلوب اور آہنگ میں انہوں نے شعر سے زیادہ حلاوت اور تاثیر محسوس کی تھی اور وہ سمجھ رہے تھے کہ وزن وقافیہ کی پابندی کے بغیر اس کلام میں شعری ذوق اور وجدان کے لیے وہ جمالیاتی لذت بدرجۂ اتم موجود ہے جو اوزان وقوافی کی جکڑ بندیوں سے بھی حاصل نہیں ہوتی۔

قرآن کریم نے ''متوازن صوتی آہنگ'' کی یہ تاثیر پیدا کرنے کے لیے کون سے نئے اصولوں کی رعایت رکھی ہے؟ اس بات کو بیان کرنا انسانی قدرت سے باہر ہے، کیوں کہ مروجہ الفاظ ومصطلحات اس کیفیت کو ٹھیک بیان نہیں کر سکتے جو قرآنی اسلوب میں رواں دواں نظر آتی ہے۔ہاں! جس شخص کو ادبی ذوق اور جمالیاتی حسن کا کچھ حصہ ملا ہو وہ ہمارے مذکورہ بالا بیان کی صداقت کو تلاوت قرآن کے دوران خود بخود محسوس کر سکتا ہے۔(۳)

(۲) علمائے بلاغت نے اسلوب کی تین قسمیں قرار دی ہیں۔(۱) خطابی، (۲) ادبی، (۳) علمی۔ان تینوں قسموں کے دائرے الگ الگ ہیں ہر ایک کی خصوصیات جدا اور مواقع مختلف ہیں اور ایک ہی عبارت میں ان تینوں اسالیب کو جمع کر دینا ممکن نہیں ہے۔آپ جب تقریر کرتے ہیں تو آپ کا انداز اور ہوتا ہے۔اور جب کوئی ادبی نثر لکھتے ہیں تو اس کا اسلوب بالکل جدا ہوتا ہے، اور جب کوئی علمی مقالہ لکھتے ہیں تو اس کا اسلوب کچھ اور اختیار کرتے ہیں لیکن قرآن کریم کا اعجاز یہ ہے کہ وہ ان تینوں اسالیب کو ساتھ لے کر چلتا ہے۔اس میں خطابت کا زور ادب کی شگفتگی اور علم کی متانت ساتھ ساتھ چلتی ہے اور کسی چیز میں کوئی کمی نہیں آنے پاتی۔

(۳) قرآن کریم کے مخاطب الھڑ دیہاتی بھی ہیں، پڑھے لکھے لوگ بھی اور اعلیٰ درجے کے علماء اور ماہرین فنون بھی لیکن اس کا اسلوب بیک وقت ان تینوں طبقوں کو متاثر کرتا ہے۔ایک طرف ان پڑھ آدمی کو اس میں سادہ حقائق ملتے ہیں اور وہ سمجھتا ہے کہ قرآن میرے ہی لیے اُترا ہے، لیکن دوسری طرف علماء اور محققین جب اسے گہری نظر سے پڑھتے ہیں تو انہیں قرآن کریم میں علمی نکات

نظر آتے ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتاب علم وفن کی ایسی باریکیوں پر مشتمل ہے کہ معمولی واقفیت کا آدمی انہیں سمجھ ہی نہیں سکتا۔

ایک عام آدمی کے ذہن کے پیش نظر قرآن کریم کا طریق استدلال بہت سادہ اور زیادہ تر مشاہدہ کی دلیلوں پر مبنی ہے۔ توحید، رسالت، آخرت، آفرینش حیات اور وجود باری جیسے دقیق فلسفیانہ مسائل کو اس نے بالکل سامنے کی دلیلوں سے ثابت کیا ہے اور مظاہر فطرت کی طرف اشارہ کر کے وہ حقائق بیان فرمائے جو آسانی کے ساتھ ایک ادنیٰ معیار کے آدمی کی سمجھ میں آسکیں۔ لیکن انہیں سادہ حقائق کی تہہ میں اتر کر دیکھے تو اس میں خالص عقلی اور منطقی دلائل بھی ملیں گے جو فلسفیانہ موشگافیوں کے مریض کو شفا بخشتے ہیں۔

باتوں باتوں میں اس نے فلسفہ اور سائنس کے وہ دقیق مسائل بھی حل کر دیئے ہیں جن کی تحقیق کے لیے بڑے بڑے فلسفی آخر تک پیچ وتاب کھاتے رہے۔

(۴) اگر ایک ہی بات کو بار بار دہرایا جائے تو کہنے والا ادب وانشاء میں خواہ کتنا بلند پایہ مقام رکھتا ہو، ایک مرحلے پر پہنچ کر سننے والے اکتا جاتے ہیں، کلام کا زور ٹوٹ جاتا ہے اور اس کی تاثیر کم ہو جاتی ہے لیکن قرآن کریم کا معاملہ یہ ہے کہ اس میں ایک ہی بات بعض اوقات بیسیوں مرتبہ کہی گئی ہے۔ ایک ہی واقعہ بار بار مذکور ہوا ہے لیکن ہر مرتبہ نیا کیف نئی لذت اور نئی تاثیر محسوس ہوتی ہے۔

(۵) کلام کی شوکت اور اس کی نزاکت وشیرینی دو متضاد صفتیں ہیں۔ دونوں کے لیے الگ اسلوب اختیار کرنا پڑتا ہے۔ ان دونوں صفتوں کو ایک عبارت میں جمع کر دینا انسانی قدرت سے باہر ہے لیکن یہ صرف قرآنی اسلوب کا اعجاز ہے کہ اس میں دونوں اوصاف بدرجہ کمال یکجا پائے جاتے ہیں۔

(۶) قرآن کریم نے بعض ان مضامین میں بلاغت کو اوج کمال تک پہنچا کر دکھایا ہے جن میں کوئی بشری ذہن ہزار کوشش کے بعد بھی کوئی ادبی چاشنی پیدا نہیں کر سکتا۔ مثلاً قانون وراثت کو لے لیجیے یہ ایک ایسا خشک اور سنگلاخ موضوع ہے کہ اس میں دنیا کے تمام ادیب وشاعر مل کر ادبیت اور عبارت کا حسن پیدا نہیں کر سکتے لیکن اس کے بعد سورۃ النساء میں **یوصیکم اللہ فی اولاد**

کم الخ والے رکوع کی تلاوت کیجیے، آپ بیساختہ پکار اٹھیں گے کہ یہ کوئی غیر معمولی نہیں کلام ہے۔ اس پورے رکوع میں قانون وراثت بیان کیا گیا ہے، لیکن اس حسن و جمال کے ساتھ کہ ایک ایک جملے پر ذوق سلیم وجد کرتا ہے۔

(۷) ہر شاعر اور ادیب کی فصاحت و بلاغت کا ایک مخصوص میدان ہوتا ہے، جس سے ہٹ کر اس کا کلام پھیکا پڑ جاتا ہے۔ عربی میں امرؤ القیس نسیب وغزل کا امام ہے، نابغہ خوف وہیت کے بیان اعشیٰ، حسن طلب اور وصف میں اور زہیر رغبت وامید میں بے نظیر ہے۔ یہی حال ہر زبان کا ہے لیکن قرآن کریم میں اس قدر مختلف الانواع مضامین بیان کیے گئے ہیں کہ ان کا احاطہ دشوار ہے، لیکن ترغیب ہو یا ترہیب، وعد ہو یا وعید، وعظ ونصیحت ہو یا امثال وقصص، عقائد کا بیان ہو یا احکام کا ہر جگہ اس کا بیان بلاغت کے اعلیٰ ترین معیار کو پہنچا ہوا ہے۔

(۸) اختصار اور ایجاز قرآن کریم کے اسلوب کا امتیازی وصف ہے اور اس وصف میں اس کا اعجاز نہایت نمایاں ہے، قرآن کریم چوں کہ قیامت تک کے ہر زمانے کی رہنمائی کے لیے آیا ہے اس لیے اس نے مختصر جملوں میں وہ وسیع مضامین سمیٹ دیئے ہیں کہ ہر دور اور ہر زمانے میں اس سے ہدایات حاصل کی جاسکتی ہیں۔ چودہ سو سال گزر جانے پر بھی اس کے مضامین پرانے نہیں ہوئے۔ اس عرصے میں انسانی زندگی نے کتنے پلٹے کھائے، کیسے کیسے عظیم انقلابات رونما ہوئے لیکن قرآن کریم سدابہار رہا اور رہے گا۔

وہ تاریخ کی کتاب نہیں لیکن تاریخ کا مستند ترین ماخذ ہے۔ وہ سیاست وقانون کی کتاب نہیں لیکن اس نے چند مختصر جملوں میں سیاست اور جہاں بانی کے وہ اصول بیان فرمادیئے ہیں، جو رہتی دنیا تک انسانیت کی رہنمائی کریں گے، وہ فلسفہ اور سائنس کی کتاب نہیں لیکن اس نے فلسفہ اور سائنس کے بہت سے عقدے کھول دیئے ہیں، وہ معاشیات اور عمرانیات کی کتاب نہیں، لیکن دونوں موضوعات پر اس نے اختصار کے ساتھ ایسی جامع ہدایات دے دی ہیں کہ دنیا کے علوم وفنون سینکڑوں ٹھوکریں کھانے کے بعد آج ان کے قریب پہنچ رہے ہیں۔

۴۔ نظم کا اعجاز:

قرآن کریم کا ایک دقیق اعجاز اس کی آیات کے باہمی ربط وتعلق اور نظم وترتیب میں ہے۔ آپ سرسری نظر سے قرآن کریم کی تلاوت فرمائیں۔ تو بظاہر یہ محسوس ہوتا کہ اس کی ہر آیت جدا مضمون کی حامل ہے اور ان کے درمیان کوئی ربط نہیں ہے۔ اسی وجہ سے نظم قرآن کریم چوں کہ تیئیس ۲۳ سال میں تھوڑا تھوڑا کر کے نازل ہوا ہے اس لیے اس میں کوئی ربط وترتیب تلاش کرنے کی ضرورت نہیں اس کی ہر آیت ایک مستقل مضمون کی حامل ہے اس کے برخلاف دوسرے گروہ کا نقطہ نظر یہ ہے کہ قرآن کریم ایک مکمل کتاب ہے۔ وہ شروع سے آخر تک باہم مربوط ہے اور اسی نقطہ نظر سے اس کا مطالعہ ضروری ہے۔ اس دوسرے گروہ کی دلیل یہ ہے کہ کسی کتاب کا بے ربط ہونا اس کے نقص کی دلیل ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ کا کلام لازماً اس نقصان سے بری ہے۔ مگر پہلا گروہ اس کے جواب میں یہ کہتا ہے کہ جس طرح قدرتی مناظر میں کوئی ربط اور ترتیب نہیں ہوتی بلکہ اس کا حسن ہی اس کی بے ترتیبی میں ہوتا ہے کہ کہیں بل کھاتا ہوا دریا ہے، کہیں ناہموار پہاڑ ہے۔ کہیں اونچی اونچی وادیاں ہیں، اسی طرح قرآن کریم کا حسن بھی اس کی اس مستقل حیثیت میں ہے۔ غزل کے ہر شعر کا موضوع جدا ہوتا ہے اور اس کو کوئی عیب نہیں سمجھتا۔ بس تو بلا تشبیہ اسی طرح قرآن کریم، میں بھی بے ترتیبی کوئی عیب نہیں۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ قرآن کریم کی آیات کے درمیان نہایت لطیف ربط پایا جاتا ہے اور اس کا انکار نہیں کیا جا سکتا ورنہ اگر کوئی ترتیب ملحوظ نہ ہوتی تو ترتیب نزول اور ترتیب کتابت میں فرق رکھنے کی چنداں ضرورت نہ تھی۔ جس ترتیب سے قرآن کریم نازل ہوا تھا، اسی ترتیب سے لکھ لیا جاتا۔ یہ جو کتابت میں آنحضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک الگ ترتیب قائم فرمائی اور وہ اس بات کی بڑی واضح دلیل ہے کہ قرآنی آیات میں باہمی ربط ہے، البتہ یہ ربط قدرے دقیق ہوتا ہے اور اس تک پہنچنے کے لیے بڑے غور وفکر کی ضرورت ہے۔

اس ربط کو اتنا دقیق اور غامض رکھنے کی حکمت بظاہر یہ معلوم ہوتی ہے۔ واللہ اعلم۔ کہ ہر آیت کی مستقل حیثیت باقی رہے اور اس کے الفاظ کا عموم ختم نہ ہونے پائے تاکہ **العبرۃ العموم اللفظ** پر عمل کرنا آسان ہو، اس کے علاوہ اس زمانے میں اہل عرب

کے خطبات وقصائد کا اسلوب عموماً یہی ہوتا تھا کہ ان کے مضامین مرتب اور مربوط ہونے کے بجائے مستقل حیثیت رکھتے تھے۔ لہٰذا یہ طریقہ اس دور کے ادبی مزاق کے عین مطابق تھا چنانچہ اگر سرسری نظر سے دیکھا جائے تو قرآن کریم کی ہر آیت مستقل معلوم ہوگی لیکن جب آپ ذرا غور کی نظر سے دیکھیں گے تو معلوم ہوگا کہ یہ پورا کلام مسلسل اور مربوط ہے۔

اسی طرح قرآن کریم نے اپنے نظم میں جو اسلوب اختیار فرمایا ہے وہ اس کا دقیق ترین اعجاز ہے، اور اس کی تقلید بشری طاقت سے بالکل باہر ہے بہت سے علماء نے قرآن کریم کے نظم کی توضیح کے لیے مستقل کتابیں لکھی ہیں اور بعض مفسرین نے اپنی تفسیروں کے ضمن میں اسے بیان کرنے کا خاص اہتمام کیا ہے۔ اس معاملہ میں امام فخر الدین رازی رحمتہ اللہ علیہ کی تفسیر کبیر شاید سب سے زیادہ قابل تعریف کاوش ہے۔ انہیں اللہ نے نظم قرآن کی تشریح کا خاص سلیقہ اور خاص توفیق عطا فرمائی ہے۔ ان کے بعد قاضی ابوالسعود رحمتہ اللہ علیہ نے بھی نظم قرآن کی خصوصیات کو بیان فرمانے کا خاص اہتمام فرمایا ہے۔ بعد کے بیشتر مفسرین اس معاملہ میں انہیں دو حضرات کے خوشہ چیں ہیں۔

نظم قرآن کی ایک ہلکی سی جھلک اس مثال میں دیکھی جا سکتی ہے۔

سورۂ حجر میں ایک جگہ ارشاد ہے:

نَبِّئْ عِبَادِيْٓ اَنِّيْٓ اَنَا الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ۙ وَاَنَّ عَذَابِيْ هُوَ الْعَذَابُ الْاَلِيْمُ ۝

”میرے بندوں کو خبر دے دو کہ میں غفور اور رحیم ہوں اور میرا عذاب (بھی) بڑا دردناک ہے۔“

اس کے فوراً بعد ارشاد ہے۔

وَنَبِّئْهُمْ عَنْ ضَيْفِ اِبْرٰهِيْمَ ۝

”اور انہیں ابراہیم کے مہمانوں کی بھی خبر دیدو۔“

اور اس کے بعد فرشتوں کے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس آنے کا مشہور واقعہ بیان کیا گیا ہے۔ بظاہر ان دونوں باتوں میں کوئی جوڑ معلوم نہیں ہوتا۔ لیکن ذرا غور

سے دیکھئے تو درحقیقت ابراہیم علیہ السلام کا واقعہ پہلے جملے کی تائید ہے اس لیے کہ فرشتے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس آئے تھے انہوں نے دو کام کیے، ایک یہ کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو حضرت اسحاق علیہ السلام جیسے صالح بیٹے کی ولادت کی خوشخبری دی۔ دوسرے ان ہی فرشتوں نے حضرت لوط علیہ السلام کی بستی پر جا کر عذاب نازل کیا۔ پہلا کام "**انا الغفور الرحیم**" کا مظاہرہ تھا اور دوسرا کام "**عذابی ھو العذاب الالیم**" کا اس طرح یہ دونوں جملے باہم نہایت گہرا تعلق رکھتے ہیں، لیکن الگ الگ دیکھئے تو ان کی مستقل حیثیت بھی ہے۔ (۴)

قرآن اس لحاظ سے عظیم ہے کہ دنیا کی کوئی کتاب اس کے مقابلے میں نہیں لائی جاسکتی۔ اپنی زبان اور ادب کے لحاظ سے بھی وہ معجزہ ہے اور اپنی تعلیم اور حکمت کے لحاظ سے بھی معجزہ جس وقت نازل ہوا تھا اس وقت انسان اس کے مانند کلام بنا کر لانے سے عاجز تھے اور آج بھی عاجز ہیں۔ اس کی کوئی بات کسی زمانے میں غلط ثابت نہیں کی جاسکی ہے نہ کی جاسکتی ہے۔ باطل نہ سامنے سے اس کا مقابلہ کرسکتا ہے نہ پیچھے سے حملہ آور ہو کر اسے شکست دے سکتا ہے اور اس لحاظ سے وہ کریم ہے کہ انسان جس قدر زیادہ اس سے رہنمائی حاصل کرنے کی کوشش کرے اسی قدر زیادہ وہ اس کو رہنمائی دیتا ہے اور جتنی زیادہ اس کی پیروی کرے اتنی ہی زیادہ اسے دنیا اور آخرت کی بھلائیاں حاصل ہوتی چلی جاتی ہیں۔ جو لوگ قرآن کو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنا تصنیف کردہ کلام کہتے ہیں خود ان کا دل یہ جانتا ہے کہ یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا کلام نہیں ہوسکتا۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ سرے سے انسانی کلام ہی نہیں ہے اور یہ بات انسان کی قدرت سے باہر ہے کہ ایسا کلام تصنیف کرسکے۔

بشکریہ البلاغ کراچی

جون ۱۹۷۵ء

حواشی:

(۱)۔ ابن سیدہ اندلسیؒ نے یہ تمام شمار کرائے ہیں اور اہل عرب کے اشعار سے اس کی مثالیں پیش کی ہیں۔ (المخصص لابن سیدہ۔ جلد: ۶، صفحہ: ۱۱۵)

یتیمۃ البیان لمشکلات القرآن، شیخ البنوری حفظہ اللہ۔ صفحہ: ۵۶، مجلس علمی ڈابھیل ۱۳۵۷ھ

(۲) (۱) یہ چاروں مثالیں بنیادی طور پر مولانا محمد یوسف بنوریؒ کی کتاب یتیمۃ البیان سے ماخوذ ہیں جو حضرت علامہ انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کی ''مشکلات القران'' کے مقدمہ کے طور پر شائع ہوئی ہیں۔ موصوف نے یہ مثالیں حضرت شاہ صاحبؒ اور علامہ ابن اثیرؒ کی ''المثل السائر فی ادب الکاتب والشاعر کے حوالے سے پیش کی ہیں۔

(۳) (۱) یہ پوری بحث حضرت شاہ ولی اللہ صاحب دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب ''الفوز الکبیر'' سے تشریحی اضافوں کے ساتھ ماخوذ ہے، مزید تفصیل کے لیے اس کے باب ۳، فصل ۲، کا مطالعہ کیا جائے۔

(۳) یہاں ہم نے اعجاز قرآن کی صرف چند اہم وجوہ بیان کرنے پر اکتفا کیا ہے۔ مزید تفصیلات کے لیے دیکھیے ''بائبل سے قرآن تک'' از مولانا رحمت اللہ کیرانوی مرتبہ احقر۔ ج: ۲، صفحہ ۳۵۷، نیز علامہ شبیر احمد عثمانیؒ کا رسالہ ''اعجاز قرآن''

مضمون: ۳۸

ہماری روزمرّہ کی گفتگو میں
انگریزی زبان کا استعمال

ہماری روز مرہ کی بول چال میں انگریزی الفاظ، بلکہ پورے پورے جملوں کا استعمال جس تیز رفتاری سے بڑھ رہا ہے وہ ایک ایسا لمحہ فکریہ بن چکا ہے کہ اگر اس پر ابھی سے توجہ نہ دی گئی تو ہماری زبان اور اس کے پس منظر میں ہماری ثقافت اور ہمارے دینی، علمی اور ادبی سرمائے کا نہ جانے کیا حشر بنے گا؟ میں جب اپنے بھائیوں کو عام گفتگو میں انگریزی الفاظ کا بے محابا استعمال کرتے اور اپنی زبان کو اردو انگریزی کا ایک مضحکہ خیز ملغوبہ بناتے دیکھتا ہوں تو واقعتاً یہ تشویش لاحق ہوتی ہے کہ ہم اپنی زبان کو تباہی کے کس غار کی طرف لے جا رہے ہیں؟

ابھی کچھ عرصے پہلے کی بات ہے، اسلام آباد کے ایک سفر کے دوران جہاز میں میری سیٹ کے قریب دو اعلیٰ سرکاری افسر سفر کر رہے تھے، ان میں سے ایک صاحب پہلے سے سیٹ پر بیٹھے تھے دوسرے صاحب ان کے برابر کی سیٹ کا بورڈنگ کارڈ لیے ہوئے قریب آئے اور پہلے صاحب کو اپنی سیٹ کے برابر میں بیٹھا دیکھا تو بہت خوش ہوئے اور ان کے پاس بیٹھتے ہوئے ان سے گفتگو شروع کر دی۔ دونوں کے درمیان جو بات چیت ہوئی وہ کچھ اس قسم کی تھی۔

”اوہو مسٹر! السلام علیکم وہاٹ اے پلیز نٹ سرپرائز! کیا حال چال ہیں؟ ہاؤ آر یو؟

”فائن تھینکس! دیکھو، قسمت اس کو کہتے ہیں مجھے کل اسلام آباد جانا تھا، بٹ آئی ہیڈ تو کینسل مائی سیٹ فار سم ریزنس۔ آج تمہاری کمپنی انجوائے کرنا مقدر میں تھا، وہاٹ اے لک!“

”اسلام آباد کیسے جا رہے ہو؟“

''آئی ہیو بین اپائنٹڈ ایز۔''

ریلی (Really)؟

''یس، یس، بس اللہ کی مہربانی ہے۔'' کانگریچولیشن! یہ تو بڑی خوشی کی بات ہے۔ سو کائنڈ آف یو، لیکن نیا نیا معاملہ ہے، اس لیے کچھ فکر بھی ہے۔

''ڈونٹ وری اباؤٹ دیٹ، ماشاء اللہ تم بڑے انٹیلی جنٹ آدمی ہو، اینڈ آئی تھنک کہ تمہارا سلیکشن بہت مناسب ہے۔ اٹ از گوئینگ ٹو بی آل رائٹ۔''

یہ اس گفتگو کے چند ابتدائی جملے تھے۔ پھر سارے، راستے اسی اسلوب میں گفتگو جاری رہی جس میں کم از کم پچھتر فیصد الفاظ انگریزی کے تھے۔ اور پچیس فیصد اردو کے۔ ان صاحبان کی گفتگو کا حوالہ تو میں نے محض نمونے کے طور پر دے دیا، ورنہ ہمارے تو تعلیم یافتہ حلقوں میں بیشتر جگہوں پر اب بات چیت اسی انداز کی ہوتی ہے پہلے اصل گفتگو اردو یا کسی اور مقامی زبان میں ہوتی تھی اور بیچ بیچ میں انگریزی الفاظ یا فقرے آجایا کرتے تھے۔ اب معاملہ الٹ گیا ہے اب اکثریت انگریزی الفاظ اور فقروں کی ہوتی ہے البتہ بیچ بیچ میں کہیں کہیں اردو، پنجابی یا کسی اور دیسی زبان کے فقرے فٹ کر دیئے جاتے ہیں، بلکہ ایسا بھی بکثرت ہوتا ہے کہ ایک ہی فقرے کا کچھ حصہ انگریزی میں اور کچھ حصہ اپنی اردو زبان میں ہوتا ہے چوں کہ اونچے تعلیم یافتہ حلقوں میں اس قسم کی ملی جلی زبان کا استعمال اب ایک فیشن بن گیا ہے، اس لیے جو لوگ اپنی تعلیم یا عہدہ و منصب کے لحاظ سے اس مقام پر نہیں ہیں وہ بھی اپنے تعلیم یافتہ ہونے کا اظہار کرنے کے لیے اپنی بساط کی حد تک انگریزی کے استعمال کی باقاعدہ کوشش کرتے ہیں اور نتیجہ یہ ہے کہ جو شخص جتنے انگریزی الفاظ بول سکتا ہے ان کے لیے بولنے میں کسر نہیں چھوڑتا۔ یہاں تک کہ غلط اور بے محل الفاظ بولنے سے بھی گریز نہیں کیا جاتا۔

انگریزی بلاشبہ اس وقت بین الاقوامی زبان ہے اور دنیا کے مختلف باشندوں کے درمیان رابطے کا واحد مشترک ذریعہ بھی۔ اس کے علاوہ اس زبان کے پاس جدید علوم وفنون کا بھی ذخیرہ ہے۔ اس لیے اس کو زبان کی حیثیت سے سیکھنا آج کی دنیا میں ناگزیر جیسا ہو گیا ہے اور اگر اس غرض سے ہمارے یہاں انگریزی پڑھی اور پڑھائی جاتی ہے تو اس میں ہرگز کوئی عیب کی بات نہیں۔ لیکن کسی زبان کو ضرورتاً سیکھنا اور بات ہے

اور زبان کا غلام بن کر اپنی زبان کو اس کے آگے ذبح کر ڈالنا دوسری چیز۔ ہمارا معاملہ یہ ہے کہ جس کام کے لیے واقعتاً انگریزی سیکھنا ضروری ہے۔ اس میدان میں تو ہماری انگریزی دانی کا معیار روز بروز گر رہا ہے۔ انگریزی کی جو صلاحیت پہلے صرف میٹرک پاس لوگوں میں ہوا کرتی تھی اب گریجویٹس تو کیا؟ بعض اوقات ماسٹر کی ڈگری رکھنے والوں میں بھی نہیں ہوتی۔ جدید درس گاہوں کے بہت سے فارغ التحصیل افراد کا حال یہ ہے کہ وہ ایک صفحہ بھی صحیح انگریزی میں نہیں لکھ سکتے۔ نہ کوئی انگریزی کتاب پڑھ کر سمجھنے کی صلاحیت رکھتے ہیں لیکن روزمرہ کی بول چال میں انگریزی کا جابجا استعمال ہے کہ اس میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے اور اسے معیار فضیلت سمجھا جا رہا ہے۔

اس رجحان کا نتیجہ یہ ہے کہ ہماری دیسی زبانیں بیچارگی کا شکار ہیں لوگ اپنی مادری زبان کو بہتر بنانے کے بجائے اس کوشش میں ہیں کہ اس میں زیادہ سے زیادہ انگریزی الفاظ داخل کر کے اپنا علمی قد اونچا کریں۔

اس کوشش سے ناواقفیت اس درجہ عام ہوگئی ہے کہ خدا کی پناہ! لوگوں کو اس بات تک کا احساس نہیں رہا کہ ''تشریف لانا'' کب بولا جاتا ہے اور ''حاضر ہونا'' کب؟ چناں چہ اس قسم کے فقرے عام طور سے سننے میں آتے ہیں کہ میں آپ کے پاس تشریف لایا تھا اور آپ میرے پاس حاضر ہوئے تھے اسی طرح ''عرض کرنے'' اور ''فرمانے'' کے محل استعمال میں بھی اسی قسم کی الٹ پلٹ روزمرہ کا معمول ہے۔ ''آپ نے عرض کیا تھا'' اور ''میں نے فرمایا تھا'' جیسے جملے بعض اوقات اچھے خاصے پڑھے لکھے لوگوں سے بھی سننے میں آجاتے ہیں۔

میرے ایک دوست جو ایک اعلیٰ سرکاری افسر ہیں سنا رہے تھے کہ میں نے ایک مرتبہ اپنے دفتر کے ایک ساتھی سے کہا کہ ''کل میں ایک تقریب میں شرکت کے لیے چلا گیا تھا'' یہ جملہ سن کر میرے ساتھی نے اعتراض کیا کہ ''تم عربی بہت بولنے لگے ہو'' میں نے کہا ''معاف کیجیے، میرا مطلب یہ تھا کہ میں ایک فنکشن اٹینڈ کرنے کے لیے گیا تھا'' انہوں نے فرمایا ''ہاں'' اب تم نے اردو میں بات کی۔ اندازہ کیجیے کہ جس ماحول میں ''تقریب'' اور ''شریک'' جیسے الفاظ استعمال کرنے کو عربی بولنے سے تعبیر کیا جا رہا ہو، وہاں دوسرے علمی اور ادبی الفاظ کو خدا جانے کیا سمجھا جاتا ہوگا؟ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہماری

دینی، علمی، ادبی، اور صحافتی زبان کا تقریباً دو تہائی حصہ، نہ صرف عام لوگوں کے لیے بلکہ ان اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگوں کے لیے بھی اجنبی بن چکا ہے جن کی تربیت انگریزی کے زیر سایہ ہوئی ہے عہد حاضر کے مشہور مورخ ٹائن بی نے اپنی کتاب ''مطالعہ تہذیب'' میں لکھا تھا کہ پہلے زمانے میں کئی بادشاہوں نے اپنے مخالفوں کا ملک فتح کرنے کے بعد ان کے کتب خانے جلا دیئے تھے'' مثلاً اندلس میں عیسائیوں نے مسلمانوں کے عظیم الشان علمی خزانوں کو نذر آتش کیا تھا'' مقصد یہ تھا کہ اس قوم کا رابطہ اپنے ماضی سے کٹ جائے۔ لیکن مصطفی کمال اتاترک نے ترکی میں ایک ایسا آسان راستہ اختیار کیا کہ کتب خانے جلانے کے بدنامی بھی اٹھانی نہیں پڑی۔ وہ آسان راستہ یہ تھا کہ اس نے ترکی قوم کا رسم الخط بدل دیا۔ اب کتب خانے تو جوں کے توں محفوظ رہے لیکن اگلے وقتوں کے چند بوڑھوں کے سوا ان سے استفادہ کرنے والا کوئی باقی نہ رہا۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے ساتھ کمال اتاترک کے راستے سے بھی زیادہ آسان راستہ اختیار کیا جارہا ہے۔ ہمارے کتب خانے بھی جوں کے توں محفوظ ہیں۔ رسم الخط بھی وہی کا وہی ہے۔ لیکن عربی اور فارسی تو کجا، خود اردو زبان کو بھی ہمارے لیے ایسا اجنبی بنایا جارہا ہے کہ اس کے علمی اور ادبی الفاظ ہمارے لیے اچنبھے بن کر رہ جائیں۔ اور ہم اپنے دینی، علمی، ادبی ذخیروں سے استفادہ کے قابل نہ رہیں۔ چناں چہ اس وقت صورتحال یہ ہے کہ ہمارے صرف عام لوگ ہی نہیں بلکہ بہت سے اعلیٰ تعلیم یافتہ حضرات بھی، جو انگریزی اردو کی ملی جلی زبان کے عادی بن گئے ہیں۔ اردو کی علمی کتابوں کے مطالعے میں سخت مشکل محسوس کرتے ہیں۔ وہ اردو کی ادبی عبارتوں سے لطف نہیں لے سکتے۔ غالب، ذوق، اور انیس کو تو چھوڑ دیئے۔ وہ اقبال مرحوم تک کے اشعار ٹھیک سمجھنے پر قادر نہیں۔ نہ ان اشعار میں پوشیدہ افکار، تلمیحات اور مضامین کا صحیح ادراک کر سکتے ہیں۔

اسی وجہ سے میں یہ عرض کر رہا ہوں کہ عام بول چال میں انگریزی کا بے تحاشا استعمال اب ہمارے لیے لمحہ فکریہ بن چکا ہے جس پر ملک وملت کے اہل فکر کو پوری سنجیدگی سے غور کرنا چاہئے۔ پہلے یہ استعمال صرف بول چال کی حد تک محدود تھا۔ لیکن اب رفتہ رفتہ ہماری تحریروں میں بھی تیزی سے داخل ہو رہا ہے اور اب ایسی تحریروں میں اضافہ ہو رہا ہے جو انگریزی الفاظ سے بھری ہوئی ہوتی ہیں۔

ہمارے اہل فکر، اہل دانش اور اعلیٰ تعلیم یافتہ حضرات کو اس صورت حال کا پوری بیدار مغزی سے جائزہ لینا چاہئے جب تک وہ خود اپنے عمل سے انگریزی کی اس غلامی سے آزادی کی کوشش نہیں کریں گے یہ تشویشناک رجحان بڑھتا چلا جائے گا اور ہم ایک ایسی قوم بن کر رہ جائیں گے۔ جس کی اپنی کوئی زبان نہیں بیشک انگریزی کے کچھ الفاظ ایسے ہیں جنہیں اردو زبان نے اپنے مزاج کے مطابق قبول کر کے انہیں اپنے اندر سمو لیا ہے۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہم ان مقامات پر بھی انگریزی الفاظ اور جملے استعمال کریں جہاں مطلب اردو یا اپنی کسی دوسری مقامی زبان میں آسانی سے ادا ہو سکتا ہو یا وہ الفاظ استعمال کریں جو زبان میں جذب ہونے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ تعلیمی اغراض کے لیے انگریزی دنیا کے بیشتر ملکوں میں پڑھائی جا رہی ہے لیکن جو دیوانگی ہم نے اختیار کی ہے وہ شاید کہیں اور اختیار نہیں کی گئی۔ برطانیہ کے سوا یورپ کے کسی ملک میں انگریزی نہیں بولی جاتی۔ وہ انگریزی جاننے کے باوجود انگریزی نہیں بولتے۔ بلکہ بعض مرتبہ بداخلاق کی حد تک غیر ملکیوں کے سامنے اپنی زبان بولتے چلے جاتے ہیں۔ خاص طور پر فرانس میں مجھے اس کا تجربہ ہوا اور اس کی وجہ سے خاصی پریشانی اٹھانی پڑی۔ انگریزی وہ بھی پڑھاتے ہیں مگر انہوں نے اسے اپنے اوپر سوار نہیں ہونے دیا۔

چوں کہ جا وبیجا بولنے کی عادت پڑ چکی ہے اور انگریزی تعبیرات زبان پر چڑھ چکی ہیں۔ اس لیے شاید شروع شروع میں اس طریقے کو چھوڑنے میں کچھ دشواری ہوگی لیکن یہ یاد رکھئے کہ اس ناعاقبت اندیشانہ طرز عمل پر اصرار اپنی نسلوں کو مادری زبان اور اس میں موجود شاندار علمی اور ادبی سرمائے سے سراسر محروم کرنے کے مترادف ہوگا۔ زبان صرف ایک اتفاقی ذریعہ اظہار نہیں ہے بلکہ یہ کسی عقیدہ فکر اور تہذیب وثقافت کے ساتھ رشتہ جوڑنے کا ایک مؤثر ذریعہ بھی ہے لہٰذا اپنی زبان سے دستبرداری کا مطلب اپنے پورے ماضی سے اپنے عقیدے اور اپنی فکر سے اور اپنی تہذیب اور ثقافت سے منہ موڑنا ہے۔ اگر ہمیں اپنی نسلوں کو اس ہولناک اقدام سے بچانا ہے تو ہمیں اپنی یہ عادت بدلنی ہوگی۔

بشکریہ ماہنامہ سوداگر
فروری ۱۹۹۵ء

مضمون:۳۹

بے پردگی کا سیلاب

کچھ عرصے سے علماء مسلمان اہل فکر اور دینی جماعتوں کی بیشتر توجہ ملک کے سیاسی اور قانونی مسائل کی طرف اس شدت کے ساتھ مبذول رہی ہے کہ بہت سے اہم معاشرتی مسائل پیچھے چلے گئے ہیں اور ان کی طرف توجہ یا تو بالکل نہیں رہی یا بہت کم رہی ہے اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک طرف جس سست رفتاری سے سیاست اور قانون میں دین کا عمل دخل شروع ہوا ہے، دوسری طرف اس سے کہیں زیادہ تیز رفتاری کے ساتھ معاشرت بالکل الٹی سمت میں ۔ بے دینی کی طرف دوڑ رہی ہے بے پردگی اور بے حیائی گھر گھر پھیل چکی ہے۔ عریانی اور فحاشی نے حیاء عفت کا مفہوم تک ذہنوں سے محو کر دیا ہے، بڑوں کا احترام اور خاندانی رشتوں کے اسلامی آداب قصۂ پارینہ بن چکے ہیں۔ دفتروں میں رشوت ستانی اور بازاروں میں سود، قمار اور دھوکہ فریب کو شیر مادر سمجھ لیا گیا ہے۔ اور اب ان برائیوں کی قباحت بھی دلوں سے مٹ چکی ہے۔

ان بہت سے مسائل میں سے آج کی نشست میں بے پردگی اور بے حیائی کے مسئلے پر چند درد مندانہ گذارشات قارئین کی خدمت میں پیش کرنی ہیں جن کا تعلق عام مسلمانوں سے بھی ہے، علماء اور اہل فکر سے بھی حکومت وقت سے بھی۔

اسلام نے خواتین کو عزت وحرمت کا جو مقام بخشا ہے اور اس کے تقدس کی حفاظت کے لیے جو تعلیمات دی ہیں وہ دنیا بھر کے مذاہب اور اقوام میں ایک منفرد حیثیت کی حامل ہیں۔ اسلام نے ایک طرف عورت کی حرمت اور دوسری طرف اس کے جائز تمدنی اور معاشرتی حقوق کا تحفظ کرنے کے لیے جو احکام عطا فرمائے ہیں ان کی حکمتوں کا احاطہ انسانی عقل کے ادراک سے بالاتر ہے، مسلمان عورت اپنی عزت کے تحفظ کے ساتھ تمام ضروری تمدنی حقوق رکھنے کے باوجود تلاش معاش میں ماری ماری پھرنے کے لیے نہیں بلکہ گھر کی ملکہ بننے کے لیے پیدا ہوئی ہے، اسی لیے شریعت نے

اس کی عمر کے کسی مرحلہ میں فکر معاش کا بوجھ اس کی گردن پر ڈالا نہیں۔ خال خال صورتیں تو مستثنیٰ ہیں لیکن عام حالات میں شادی سے پہلے اس کے معاش کی ذمہ داری باپ پر اور شادی کے بعد شوہر یا اولاد پر ڈالی گئی ہے، لہٰذا ناگزیر ضرورتوں کو چھوڑ کر عام طور پر اسے معاش کے لیے سڑکیں چھاننے کی ضرورت نہیں، چناں چہ اس کی عزت و آبرو اور اس کی حرمت و تقدس کو سلامت رکھنے کے لیے حکم یہ دیا گیا ہے کہ:

وَقَرْنَ فِیْ بُیُوْتِکُنَّ وَلَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِیَّةِ الْاُوْلٰی (سورۂ احزاب:۳۳)

''اور تم اپنے گھروں میں قرار سے رہو اور پچھلی جاہلیت کی طرح بناؤ سنگھار کر کے باہر نہ پھرا کرو۔''

ضرورت کے موقع پر عورت کو گھر سے باہر جانے کی اجازت بھی اسلام نے دی ہے لیکن اس طرح کہ وہ پردے کے آداب و شرائط کو ملحوظ رکھ کر بقدر ضرورت باہر نکلے اور اپنے آپ کو ہوسناک نگاہوں کا نشانہ بننے سے بچائے۔ اس غرض کے لیے مرد و عورت کے درمیان فطری تقسیم کار یہ رکھی گئی ہے کہ مرد کمائے اور عورت گھر کا انتظام کرے اور مرد کے لیے کما کر لانا عورت پر اس کا کوئی احسان نہیں، اس کا لازمی فریضہ ہے، بلکہ اس معاملے میں اسلام نے عورت کو یہ فضیلت اور امتیاز بخشا ہے کہ گھر کا انتظام بھی قانونی طور پر اس کی ذمہ داری نہیں ہے، اخلاقی طور پر اس کو اس بات کی ترغیب ضرور دی گئی ہے کہ وہ شوہر کے گھر کی دیکھ بھال کرے لیکن اگر کوئی عورت اپنی اس اخلاقی ذمہ داری کو پورا نہ کرے تو مرد اس کو بزور قانون اس پر مجبور نہیں کر سکتا اس کے برخلاف مرد پر عورت کے لیے کمانے کی ذمہ داری اخلاقی بھی ہے اور قانونی بھی اور اگر کوئی مرد اس میں کوتاہی کرے تو عورت بزور قانون اسے اس ذمہ داری کی ادائیگی پر مجبور کر سکتی ہے۔

اسلام نے عورت کو یہ امتیاز اس لیے عطا فرمایا ہے تا کہ وہ کسب معاش کی الجھنوں میں پڑ کر معاشرتی برائیوں کا سبب بننے کے بجائے گھر میں رہ کر قوم کی تعمیر کی خدمت انجام دے گھر کا ماحول معاشرے کی وہ بنیاد ہے جس پر تمدن کی پوری عمارت کھڑی ہوتی ہے، اگر یہ بنیاد خراب ہو تو اس کا فساد پورے معاشرے میں سرایت کر جاتا ہے، اس کے برعکس اگر ایک مسلمان خاتون اپنے گھر کے ماحول کو سنوار کر ان نونہالوں کی صحیح تربیت

کرے جنہیں آگے چل کر قوم و ملک کا بوجھ اٹھانا ہے تو ساری قوم خود کار طریقے پر سنور سکتی ہے اور اس طرح مرد عورت کی عزت و آبرو کا پورا تحفظ ہوتا ہے۔

اور دوسری طرف ایک ایسا ستھرا گھریلو نظام وجود میں آتا ہے جو ملکر پورے معاشرے کی پاکیزگی کا ضامن بن سکتا ہے لیکن جس ماحول میں معاشرے کی پاکیزگی کوئی قیمت ہی نہ رکھتی ہو اور جہاں عفت و عصمت کے بجائے اخلاق باختگی اور حیاسوزی کو منتہائے مقصود سمجھا جاتا ہو۔ ظاہر ہے کہ وہاں اس تقسیم کار اور پردہ اور حیا کو نہ صرف غیر ضروری بلکہ راستے کی رکاوٹ سمجھا جائے گا۔ چناں چہ جب مغرب میں تمام اخلاقی اقدار سے آزادی کی ہوا چلی تو مرد نے عورت کے گھر میں رہنے کو اپنے لیے دوہری مصیبت سمجھا۔ ایک طرف تو اس کی ہوس ناک طبیعت عورت کی کوئی ذمہ داری قبول کیے بغیر قدم قدم پر اس سے لطف اندوز ہونا چاہتی تھی اور دوسری طرف وہ اپنی قانونی بیوی کی معاشی کفالت کو بھی ایک بوجھ تصور کرتا تھا۔ چناں چہ اس نے دونوں مشکلات کا جو عیارانہ حل نکالا اس کا خوبصورت اور معصوم نام ''تحریک آزادی نسواں'' رکھا۔ عورت کو یہ پڑھایا گیا کہ تم اب تک گھر کی چار دیواری میں قید رہی ہو، اب آزادی کا دور ہے اور تمہیں اس قید سے باہر آکر مردوں کے شانہ بشانہ زندگی کے ہر کام میں حصہ لینا چاہیے۔ اب تک تمہیں حکومت و سیاست کے ایوانوں سے بھی محروم رکھا گیا ہے۔ اب تم باہر آکر زندگی کی جدوجہد میں برابر کا حصہ بنو تو دنیا بھر کے اعزازات اور اونچے اونچے منصب تمہارا انتظار کررہے ہیں۔

عورت بے چاری ان دل فریب نعروں سے متاثر ہوکر گھر سے باہر آگئی۔ اور پروپیگنڈے کے تمام وسائل کے ذریعہ شور مچا مچا کر اسے یہ باور کرا دیا گیا کہ اسے صدیوں کی غلامی کے بعد آج آزادی ملی ہے، اور اب اس کے رنج و محن کا خاتمہ ہوگیا ہے۔ ان دلفریب نعروں کی آڑ میں عورت کو گھسیٹ کر سڑکوں پر لایا گیا۔ اسے دفتروں میں کلرکی عطا کی گئی، اسے اجنبی مردوں کے پرائیویٹ سکریٹری کا ''منصب'' بخشا گیا اسے ''اسٹینوٹائپسٹ'' بننے کا اعزاز دیا گیا۔ اسے سینکڑوں انسانوں کی حکم برداری کے لیے ''ایئر ہوسٹس'' کا ''عہدہ'' عنایت کیا گیا۔ اسے تجارت چمکانے کے لیے ''سیلز گرل'' اور ''ماڈل گرل'' بننے کا شرف بخشا گیا اور اس کے ایک ایک عضو کو برسر

بازار رسوا کر کے گاہکوں کو دعوت دی گئی کہ آؤ، اور ہم سے مال خریدو۔ یہاں تک کہ وہ عورت جس کے سر پر دین فطرت نے عزت و آبرو کا تاج رکھا تھا اور جس کے گلے میں عفت و عصمت کے ہار ڈالے تھے، تجارتی اداروں کے لیے ایک شو پیس اور مرد کی تھکن دور کرنے کے لیے ایک تفریح کا سامان بن کر رہ گئی۔

نام یہ لیا گیا تھا کہ عورت کو ''آزادی'' دے کر سیاست و حکومت کے ایوان اس کے لیے کھولے جا رہے ہیں۔ لیکن ذرا جائزہ لے کر تو دیکھئے کہ اس عرصے میں خود مغربی ممالک کی کتنی عورتیں صدر و وزیر اعظم یا وزیر بن گئیں؟ کتنی خواتین کو جج بنایا گیا؟ کتنی عورتوں کو دوسرے بلند مناصب کا اعزاز نصیب ہوا؟ اعداد و شمار جمع کیے جائیں تو ایسی عورتوں کا تناسب بمشکل چند فی لاکھ ہوگا۔ ان گنی چنی خواتین کو کچھ مناصب دینے کے نام پر باقی لاکھوں عورتوں کو جس بے دردی کے ساتھ سڑکوں اور بازاروں میں گھسیٹ کر لایا گیا ہے وہ ''آزادی نسواں'' کے فراڈ کا المناک ترین پہلو ہے۔ آج یورپ اور امریکہ میں جا کر دیکھو تو دنیا بھر کے تمام نچلے درجے کے کام عورت کے سپرد ہیں۔ ریستورانوں میں کوئی مرد ویٹر شاذ و نادر ہی کہیں نظر آئے گا ورنہ یہ خدمات تمام تر عورتیں انجام دے رہی ہیں، ہوٹلوں میں مسافروں کے کمرے صاف کرنے اور ان کے بستر کی چادریں بدلنے اور ''روم اٹنڈنٹ'' کی خدمات تمام تر عورتوں کے سپرد ہیں، دوکانوں پر مال بیچنے کے لیے مرد خال خال نظر آئیں گے، یہ کام بھی عوتوں ہی سے لیا جا رہا ہے۔ دفاتر کے استقبالیوں پر عام طور سے عورتیں ہی تعینات ہیں اور بیرے سے لے کر کلرک تک تمام ''مناصب'' زیادہ تر اسی صنفِ نازک کے حصہ میں آئے ہیں ''جسے گھر کی قید سے آزادی'' عطا کی گئی ہے۔

پروپیگنڈے کی قوتوں نے یہ عجیب و غریب فلسفہ ذہنوں پر مسلط کر دیا ہے کہ عورت اگر اپنے گھر میں اپنے اور اپنے شوہر، اپنے ماں باپ بہن بھائیوں اور اولاد کے لیے خانہ داری کا انتظام کرے تو یہ قید اور ذلت ہے۔ لیکن وہی عورت اجنبی مردوں کے لیے کھانا پکائے ان کے کمروں کی صفائی کرے، ہوٹلوں اور جہازوں میں ان کی میزبانی کرے، دکانوں پر اپنی مسکراہٹوں سے گاہکوں کو متوجہ کرے اور دفاتر میں اپنے افسروں کی ناز برداری کرے تو یہ ''آزادی'' اور اعزاز ہے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ

پھر ستم ظریفی کی انتہا یہ ہے کہ عورت کسب معاش کے لیے آٹھ آٹھ گھنٹے کی یہ سخت اور ذلت آمیز ڈیوٹیاں ادا کرنے کے باوجود اپنے گھر کے کام دھندوں سے اب بھی فارغ نہیں ہوئی، گھر کی تمام خدمات آج بھی پہلے کی طرح اسی کے ذمہ ہیں اور یورپ اور امریکہ میں اکثریت ان عورتوں کی ہے جن کو آٹھ گھنٹے کی ڈیوٹی دینے کے بعد اپنے گھر پہنچ کر کھانا پکانے، برتن دھونے اور گھر کی صفائی کا کام اب بھی کرنا پڑتا ہے۔

یہ تو اس نام نہاد ''آزادی'' کے وہ نتائج ہیں جو خود عورت اپنی ذاتی زندگی میں بھگت رہی ہے اور مرد و زن کے بے محابا اختلاط سے پورے معاشرے میں بداخلاقی، جنسی جرائم، بے راہ روی اور آوارگی کی جو تباہ کن وبائیں وہاں پھوٹی ہیں وہ کسی بھی باخبر انسان سے پوشیدہ نہیں۔ عائلی نظام کی اینٹ سے اینٹ بج گئی ہے، حسب و نسب کا کوئی تصور باقی نہیں رہا۔ عفت و عصمت داستان پارینہ بن چکی ہے۔ طلاقوں کی کثرت نے گھر کے گھر اجاڑ دیئے ہیں، جنسی جنون تصور کی خیالی سرحدیں بھی پار کر چکا ہے اور فحاشی کے عفریت نے انسانیت کی ایک ایک قدر کو بھنبھوڑ کر رکھ دیا ہے۔

یہ واقعات کسی خیالی دنیا کے نہیں ہیں، یہ مغربی ممالک کے وہ ناقابل انکار حالات ہیں جن کا ہر شخص وہاں جا کر مشاہدہ کر سکتا ہے اور جو لوگ وہاں نہیں جا سکے۔ ان حالات کی خبریں لازماً ان تک بھی پہنچتی رہتی ہیں۔ تقلید مغرب کے جو شائقین شروع میں وہاں جا کر آباد ہوئے کچھ عرصے تک وہاں کی چمک دمک کی سیر کرنے کے بعد جب خود صاحب اولاد ہوئے اور اپنی بچیوں کا مسئلہ سامنے آیا تو ان کی پریشانی اور بے چینی کا یہاں رہ کر اندازہ بھی نہیں کیا جا سکتا۔

سوال یہ ہے کہ کیا کوئی مسلمان جس کے دل میں ایمان کی کوئی رمق موجود ہو یہ پسند کر سکتا ہے کہ خدانخواستہ یہ گھناؤنے حالات ہمارے اپنے ملک اور اپنے معاشرے میں بھی دہرائے جائیں؟ اگر نہیں! اور یقیناً نہیں تو یہ کیسا ستم ہے کہ ہم بھی رفتہ رفتہ بے پردگی اور بے حجابی کے اسی راستے پر چل رہے ہیں جس نے مغرب کو معاشرتی تباہی اور اخلاقی دیوالیہ پن کے آخری سرے تک پہنچا دیا ہے۔

ایک زمانہ تھا کہ مسلمان خاندان کی خواتین کی سواریوں پر بھی پردے بندھے ہوئے ہوتے تھے، اور پردہ شرافت و عالی نسبی کا نشان سمجھا جاتا تھا، لیکن آج انہیں

شریف گھرانوں کی بیٹیاں بازاروں میں برہنہ سر گھوم رہی ہیں۔ بڑے شہروں میں تو نوبت یہاں تک پہنچ چکی ہے کہ شہر میں برقعے کی شکل خال خال ہی کہیں نظر آتی ہے، بے پردگی کے سیلاب نے حیاء وغیرت کا جنازہ نکال کر رکھ دیا ہے، اور دیندار گھرانوں میں بھی پردے کی اہمیت کا احساس روز بروز گھٹ رہا ہے۔

بعض لوگ بے پردگی کی حمایت میں کہتے نظر آتے ہیں کہ ہماری بے پردگی کو یورپ اور امریکہ کی بے پردگی پر قیاس نہیں کیا جاسکتا ہے اور یہاں کی بے پردگی وہ نتائج پیدا نہیں کرے گی جو مغرب میں پیدا ہو چکے ہیں لیکن خوب سمجھ لیجیے کہ جو کچھ مغرب میں ہوا یا ہو رہا ہے وہ فطرت کے ساتھ بغاوت کے لازمی اور منطقی نتائج ہیں، یہ بغاوت جہاں کہیں ہوگی، اپنے انہی منطقی نتائج تک پہنچ کر رہے گی، ان نتائج کو کھوکھلے فلسفوں سے نہیں روکا جاسکتا اور جو لوگ بے پردگی کو فروغ دینے کے بعد معاشرے میں عفت و عصمت باقی رکھنے کے دعوے کرتے ہیں یا تو خود احمقوں کی جنت میں بستے ہیں یا دوسروں کی آنکھوں میں دھول جھونکنا چاہتے ہیں۔ واقعات اس بات کے گواہ ہیں کہ جب سے ہمارے معاشرے میں بے پردگی کا رواج بڑھا ہے، اس وقت سے اغوا، زنا اور دوسرے جرائم کی شرح کہیں سے کہیں پہنچ گئی ہے اور اس طرح جس مقدار میں ہم بے پردگی کی طرف بڑھے اسی تناسب سے مغربی معاشرے کی لعنتیں بھی ہمارے یہاں سرایت کر گئی ہیں۔

ان لعنتوں کے سدباب کا اگر کوئی راستہ ہے تو صرف یہ کہ ہم پردے کے سلسلے میں اپنے طرز عمل کو بدل کر دین فطرت کی انہی تعلیمات کی طرف لوٹیں جنہوں نے ہمیں پاکیزہ زندگی گذارنے کا طریقہ سکھایا ہے۔

افسوس یہ ہے کہ پروپیگنڈے اور خراب ماحول کے زیر اثر رفتہ رفتہ بے پردگی کی برائی ذہنوں سے محو ہوتی جارہی ہے، اور جن گھرانوں کے بارے میں کبھی بے پردگی کا تصور بھی نہیں آسکتا تھا، اب وہاں بھی وہ ختم ہو رہا ہے، گھر کے وہ بڑے جو بذات خود بے پردگی کو برا سمجھتے ہیں وہ بھی رفتہ رفتہ اس سیلاب کے آگے سپر ڈال رہے ہیں، اور ہمارے نزدیک اس سیلاب کی تیز رفتاری کا بڑا سبب یہی ہے۔ اگر یہ لوگ سپر ڈالنے کے بجائے اپنے گھر والوں کا ذہن بنانے کی فکر کریں، انہیں اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم

کے احکام یاد دلائیں، ان احکام کی نافرمانی کے سنگین نتائج سے آگاہ کریں اور انہیں یہ باور کرادیں کہ وہ اپنی موجودگی میں اپنے گھر کی خواتین کو بے پردہ نہیں دیکھیں گے تو انشاء اللہ اس سیلاب پر روک ضرور قائم ہوگی۔

ہمارے خطباء اور واعظ حضرات نے بھی ایک مدت سے اس مسئلے کی وضاحت چھوڑ رکھی ہے، اور اس اسلامی حکم کی تعلیم و تبلیغ میں بھی بہت سستی آگئی ہے۔ شاید یہ خیال ہونے لگا ہے کہ اس معاملے میں واعظ و نصیحت بے اثر ہو چکی ہے۔ لیکن خوب سمجھ لینا چاہئے کہ داعی حق کا کام یہ ہے کہ وہ تھکنے اور مایوس ہونے کے بجائے اپنے حصے کا کام انجام دیتا رہے، نتائج تو اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہیں لیکن داعی کا کام یہ ہے کہ وہ دعوت کو سست نہ پڑنے دے، تجربہ اس بات کا گواہ ہے کہ اخلاص کے ساتھ جو بات کہی جاتی رہے، وہ ایک نہ ایک دن اپنا اثر ضرور دکھاتی ہے، یہ قرآن کریم کا وعدہ ہے:

وَذَكِّرْ فَإِنَّ الذِّكْرٰى تَنْفَعُ الْمُؤْمِنِيْنَ

''اور نصیحت کرو، کہ بلاشبہ نصیحت مومنوں کو فائدہ پہنچاتی ہے۔''

حالات بلاشبہ تشویش ناک ہیں، لیکن بفضلہ تعالیٰ ابھی ہمارا معاشرہ اس مقام پر نہیں پہنچا جہاں اصلاح کی کوئی امید باقی نہیں رہتی، ہزار غفلتوں اور کوتاہیوں کے باوجود بحمد للہ ابھی لوگوں دلوں میں اللہ تعالیٰ پر، آنحضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر اور یوم آخرت پر ایمان موجود ہے، اور اس دولتِ ایمان کی وجہ سے ابھی دعوت و تبلیغ کے لیے لوگوں کے کان بالکل بند نہیں ہوئے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اخلاص اور حکمت کے ساتھ موثر انداز میں حق کی دعوت متواتر پہنچتی رہے۔ اگر خدانخواستہ اس مرحلہ پر اس فریضے میں کوتاہی جاری رہی تو اصلاح کی کوششیں روز بروز مشکل تر ہوتی جائیں گی، اور خدانہ کرے کہ ہمارے معاشرے میں وہ صورت حال پیدا ہو جس سے آج مغربی ممالک دوچار ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں وہ روز بد نہ دکھائے، اور اصلاحِ حال کے لیے اپنے حصے کا کام صدق و اخلاص اور لگن کے ساتھ کرنے کی توفیق مرحمت فرمائے۔ آمین

مضمون: ۴۰

فحاشی کا سیلاب...... ایک لمحہ فکر!!

اسلام کی بنیاد جن اعمال وافکار پر ہے ان میں سے ایک اہم ترین اساسی عفت وعصمت ہے اور اسلام کی بے شمار تعلیمات اسی محور کے گرد گھومتی ہیں اسلام اپنے پیروؤں کے لیے بالخصوص، اور پوری دنیا کے لیے بالعموم، جس معاشرے کی تعمیر کرنا چاہتا ہے وہ ایک ایسا پاکیزہ اور صاف ستھرا معاشرہ ہے جس کے سر عفت وعصمت کا تاج ہو اور جس کے اعمال وافکار کے کسی گوشے میں بداخلاقی اور بے حیائی کی گنجائش نہ ہو۔ چنانچہ اس مقصد کے لیے اسلام نے اپنی قانونی اور اخلاقی تعلیمات میں انتہائی جزرسی کا مظاہرہ کیا ہے، اور ان تمام چور دروازوں پر پہرے بٹھائے ہیں جہاں سے معاشرے میں بے حیائی کے گھس آنے کا احتمال ہو۔

سرکار دو عالم حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک حدیث میں ارشاد فرمایا:

من یضمن لی مابین لحیه وما من بین رجلیه أضمن له الجنة

''جو شخص مجھے اپنے جبڑوں کے درمیان والی چیز (یعنی زبان) اور اپنی ٹانگوں کے درمیان والی چیز (یعنی شرم گاہ) کی ضمانت دے دے (کہ اسے اللہ کی نافرمانی میں استعمال نہیں کرے گا) میں اس کے لیے جنت کی ضمانت دیتا ہوں۔''

اس حکیمانہ ارشاد نے انسانی معاشرے کی دکھتی ہوئی رگوں پر ہاتھ رکھ دیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس دنیا میں جتنے گناہ اور جتنے جرائم سرزد ہوتے ہیں، ان کے دو ہی سبب ہوتے ہیں۔ یا زبان کی بے اعتدالی، جس میں بدزبانی بھی داخل ہے اور پیٹ کی خواہش پوری کرنے کے لیے کیے جانے والے تمام جرائم بھی، یا پھر جنسی خواہشات کے بے اعتدالی، جس میں عریانی وفحاشی اور بے حیائی کے تمام کام آجاتے ہیں۔ انسان نماز

روزہ اور عبادات میں کوتاہی کرے تو اس کا براہ راست اثر تنہا اس کی ذات تک محدود رہتا ہے، لیکن زبان اور جنسی خواہشات کے بے اعتدالی پورے معاشرے پر اثر انداز ہوتی ہے اور بالآخر اسے تباہ و برباد کر کے چھوڑتی ہے۔ چنانچہ اسلام ان دونوں معاملات میں انتہائی حساس دین ہے اور اس میں ان دونوں بے اعتدالیوں کی روک تھام کے لیے بڑے وسیع دور رس اور ہمہ گیر احکام دیئے گئے ہیں۔

جنسی جذبہ انسان کا ایک فطری جذبہ ہے جو اعتدال میں رہے اور پاکیزگی کے ساتھ استعمال ہو تو زندگی میں لطف و سرور پیدا کرتا ہے۔ بقائے نوع انسانی کا ذریعہ بنتا ہے اور اس سے الفت و محبت کے مقدس رشتے استوار ہوتے ہیں لیکن اگر یہی جذبہ حد سے بڑھ جائے اور بہیمیت کا رخ اختیار کر لے تو پورے نظامِ زندگی کو تہ و بالا کر ڈالتا ہے، اس سے معاشرہ انارکی کا شکار ہو جاتا ہے۔ باہمی تعلقات و روابط کا سارا نظام مصنوعی ہو کر رہ جاتا ہے۔ اختلاط انساب کے فتنے پیدا ہوتے ہیں، اخلاقی اور جسمانی بیماریوں کی وبائیں پھوٹتی ہیں۔ باہمی نفرت و عداوت کے شعلے بھڑکتے ہیں۔ اجتماعی قوت عمل سرد پڑ جاتی ہے اور انسان اشرف المخلوقات کے منصب سے پھسل کر کتے بلیوں کی صف میں آ گرتا ہے۔

چناں چہ اسلام نے رہبانیت کی طرح جنسی جذبے کو بالکلیہ رد نہیں کیا بلکہ ایک طرف تو انسان کے اس فطری جذبے کو پوری طرح تسلیم کیا ہے۔ اس کے صحیح استعمال کی خاطر نکاح کا پاکیزہ طریقہ تجویز فرمایا ہے، اس کے لیے بے شمار آسانیاں فراہم کی ہیں، اور نکاح کے احکام و ضوابط میں اس بات کی پوری رعایت رکھی ہے کہ یہ پاکباز رشتہ انسان کے فطری جذبات کی تسکین کے لیے پوری طرح کافی ہو جائے اور دوسری طرف ان تمام بے اعتدالیوں پر کڑی بندشیں عائد کی ہیں جن سے انسان کے خیالات بھٹکتے ہیں جن سے اس کی خواہشات بے قابو ہوتی ہیں جن سے لذت پرستی کی جوع البقر پیدا ہوتی ہے، اور جو معاشرے میں کسی بھی حیثیت سے عریانی و فحاشی اور بے حیائی پھیلانے کی ذمہ دار ہو سکتی ہیں۔

اس مقصد کے لیے قرآن و سنت میں اخلاقی اور قانونی ہدایات کا ایک طویل سلسلہ ہے۔ جس کا آغاز اس آیت سے ہوتا ہے کہ:

قُلْ لِّلْمُؤْمِنِیْنَ یَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِھِمْ وَیَحْفَظُوْا فُرُوْجَھُمْ ط ذٰلِکَ اَزْکٰی لَھُمْ ط اِنَّ اللّٰہَ خَبِیْرٌ بِمَا یَصْنَعُوْنَ (سورۃ النور:۳۰)

''آپ مسلمانوں سے کہیے کہ وہ اپنی نگاہیں نیچی رکھیں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں، یہ ان کے لیے پاکیزگی کا باعث ہے۔ بے شک اللہ کو سب خبر ہے جو کچھ لوگ کیا کرتے ہیں۔''

اور دوسری طرف خواتین کو ارشاد ہے:

وَقَرْنَ فِیْ بُیُوْتِکُنَّ وَلَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاھِلِیَّةِ الْاُوْلٰی

''اور تم اپنے گھروں میں رہو اور پچھلی جاہلیت کی طرح اپنی زیب و زینت کی نمائش کرتی نہ پھرو۔''

بلکہ اس سے پہلے ان کو یہاں تک ہدایت دی گئی کہ:

فَلَا تَخْضَعْنَ بِالْقَوْلِ فَیَطْمَعَ الَّذِیْ فِیْ قَلْبِهٖ مَرَضٌ وَّقُلْنَ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا (سورۃ احزاب:۳۲)

''پس تم (نامحرم مردوں سے) نزاکت کے ساتھ بات نہ کرو، کہ جس شخص کے دل میں روگ ہو وہ لالچ کرنے لگے، اور قاعدے کی بات کرو۔''

اور پورے معاشرے کے خیالات و جذبات کو پاکیزہ رکھنے کے لیے نشر و اشاعت کے ذرائع کو تنبیہ کی گئی کہ:

اِنَّ الَّذِیْنَ یُحِبُّوْنَ اَنْ تَشِیْعَ الْفَاحِشَةُ فِی الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَھُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَةِ ط وَاللّٰہُ یَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ (سورۃ النور:۱۹)

''بلاشبہ جو لوگ مسلمانوں میں فحاشی کا چرچا چاہتے ہیں ان کے لیے دنیا و آخرت میں دردناک عذاب ہے اور اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔''

اس قسم کی بے شمار ہدایات کے ذریعہ انسان کے کان، آنکھ، دل اور اس کے تمام خیالات و جذبات پر خوفِ خدا اور فکرِ آخرت کے پہرے بٹھائے گئے ہیں اور پھر ان ہدایات کی انتہا سو کوڑوں اور سنگساری کی ایسی لرزہ خیز اور عبرت ناک سزا ہوتی ہے جو اسلام نے بدکاروں کے لیے مقرر فرمائی ہے۔

قرآن وسنت کے ان ارشادات اور سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم و تربیت کا اثر تھا کہ اسلامی معاشرہ عفت و عصمت اور جنسی جذبات کے اعتدال میں دنیا کا مثالی معاشرہ تھا۔ اب سے کچھ عرصے پہلے تک دین سے ہزار دوری اور اخلاق کے ہزار انحطاط کے باوجود مسلمان اس لحاظ سے بڑی حد تک ممتاز تھے کہ عفت و عصمت اور شرم وحیا کی قدریں ان کے رگ و پے میں سمائی ہوئی تھیں اور دینی پابندیوں کے علاوہ اس معاملہ میں خاندانی روایات کی بڑی حد تک پاس داری کی جاتی تھی۔ چنانچہ مغربی ممالک میں آبرو باختگی اور اخلاقی دیوالیہ پن کے جو واقعات سننے میں آتے تھے انہیں یہاں نفرت وحقارت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔

لیکن یہ حقیقت انتہائی کرب انگیز اور تشویش ناک ہے کہ اب دوسری سینکڑوں بدعنوانیوں کے ساتھ اس معاملہ میں بھی ہمارے معاشرے کا مزاج نہایت تیز رفتاری سے بدل رہا ہے، اور مغربی معاشرے کی وہ تمام لعنتیں جنہوں نے مغرب کو اخلاقی تباہی کے آخری سرے پر پہنچا دیا ہے، رفتہ رفتہ ہمارے درمیان بھی تباہ کن رفتار سے سرایت کر رہی ہیں یہاں تک کہ وہ خاندان جو عفت و عصمت، شرافت و متانت اور شرم وحیا کے اعتبار سے مثالی سمجھے جاتے تھے اب ان میں بے پردگی، آوارگی، بے حیائی اور جنس پرستی کا عفریت اپنی پوری فتنہ سامانیوں اور تباہ کاریوں کے ساتھ گھس آیا ہے۔ اس تشویش ناک بے راہ روی کے اسباب اتنے متنوع اور مختلف ہیں کہ محض کوئی ایک اقدام اس کے انسداد کے لیے کافی نہیں ہوگا، خاص طور سے مندرجہ ذیل چیزیں فحاشی کے فتنے کو روز بروز ہوا دے رہی ہیں۔

۱۔ ملک کے تمام شہروں میں سینما ہاؤس قائم ہیں جہاں دن رات حیا سوز فلمیں، دکھا کر شرافت و متانت کو ذبح کیا جاتا ہے۔ ان فلموں میں عریانیت، فحاشی اور جنس پرستی کی باقاعدہ تعلیم دی جاتی ہے خاص طور سے غیر ملکی فلموں میں جو ہیجان

انگیزی اور ہوس پرستی کے مناظر دکھائے جاتے ہیں وہ نوجوان نسل کے لیے سم قاتل کی حیثیت رکھتے ہیں اور جب سینکڑوں افراد ان شرمناک مناظر کو ایک ساتھ بیٹھ کر دیکھتے ہیں تو ان کی قباحت و شناعت کا تصور لمحہ بہ لمحہ ختم ہوتا جاتا ہے، نگاہیں اس انسانیت کش برائی کی عادی ہوتی چلی جاتی ہیں، اور جنس پرستی کی یہ بیماری ایک متعدی جذام کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔

۲۔ ٹیلی ویژن نے یہ قیامت ڈھائی ہے کہ بے حیائی کے جو کام سینما ہالوں، نائٹ کلبوں اور رقص گاہوں تک محدود تھے، اب اس کے ذریعہ ایک ایک گھر کے ڈرائنگ روم میں گھس آئے ہیں جو لوگ سینما ہالوں تک پہنچنے سے کتراتے تھے، اب وہ گھر بیٹھے اس ''رات'' سے سرفراز ہوتے ہیں اور رفتہ رفتہ بڑے چھوٹے اور اپنے پرائے کی تمیز اس حد تک مٹ گئی ہے کہ باپ بیٹیاں اور بہن بھائی رقص و سرور اور فلموں کے خالص جنسی مناظر نہ صرف ایک ساتھ بیٹھ کر دیکھتے ہیں بلکہ ان پر تبصرے کرتے ہیں اور بعض گھرانوں میں یہ صورت بھی عام ہوگئی ہے کہ آس پاس کے پڑوسی اور محلے کے دوست احباب خاص خاص پروگرام کے لیے جمع ہو جاتے ہیں، اور اجنبی لڑکے لڑکیاں بھی یکجا ہو کر ٹی وی سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔

۳۔ اخبارات نے عریانی و فحاشی کی نشر و اشاعت پر کمر باندھ لی ہے۔ فلمی اشتہارات کے حصے میں جو بسا اوقات کئی صفحات پر چھایا ہوا ہوتا ہے۔ روزانہ جنسی بہیمیت اور درندگی کا جہنم دہکا ہوا ہوتا ہے اور اس میں ایسی ایسی تصاویر اور ایسی ایسی عبارتیں چھپتی ہیں جن سے شیطان بھی پناہ مانگتا ہوگا۔ اخبارات آج کل ہر غریب سے غریب انسان کی ضروریات زندگی میں شامل ہو چکے ہیں اس لیے فحاشی و عریانی کا یہ سڑا ہوا ملغوبہ ان گھروں میں پہنچتا ہے جہاں ٹی وی تک کا گزر نہیں، ظاہر ہے کہ گھر کے لڑکے لڑکیوں سے ان اخبارات کی حفاظت کون کر سکتا ہے؟ چنانچہ پاکیزہ سے پاکیزہ گھرانوں میں بھی عریانی و فحاشی کے یہ پلندے بڑے بوڑھوں سے لے کر بچوں عورتوں تک سب کی نگاہوں سے گزرتے ہیں۔

(۴) رسائل و جرائد نے عریانیت کو ایک مستقل ذریعہ تجارت بنا رکھا ہے۔ نہ جانے

کتنے رسالے ہیں جو صرف عریاں تصویروں، فحش افسانوں اور بے حیائی کے مضامین کے ذریعہ چل رہے ہیں، اور ان سے جنس پرستی کا رجحان روز بروز قوت اختیار کر رہا ہے۔

۵۔ اشتہار بازوں نے عورت کو پیسے کمانے کا ایک حربہ سمجھ لیا ہے، چنانچہ دنیا کی کسی چیز کا اشتہار عورت کی تصویر کے بغیر مکمل نہیں ہوتا۔ قدرت کی اس مقدس تخلیق کو ایک کھلونا بنا کر استعمال کیا جا رہا ہے اور اس کے ایک ایک عضو کی عریاں نمائش کر کے گاہکوں کو مال خریدنے کی دعوت دی جا رہی ہے۔ چنانچہ سڑکوں پر چلتے ہوئے ایک شریف انسان کے لیے نگاہوں کو بچانا مشکل ہے۔ خاص طور سے فلموں کے اشتہار کے لیے قدم قدم پر جو سائن بورڈ آویزاں ہیں وہ ہر آن فحاشی کی تبلیغ کر رہے ہیں۔

۶۔ نیم عریاں نہیں، بالکل عریاں تصویروں کی خرید و فروخت عام ہو چکی ہے، اور نئی نسل کے لڑکے لڑکیاں، ایسی ایسی تصویروں کے پورے البم کھلم کھلا خرید رہے ہیں جن میں انسانوں کو گدھوں اور کتوں کی طرح جنسی اختلاط کرتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔

۷۔ خاص خاص مقامات پر ایسی بلو فلمیں بڑی بڑی قیمتیں وصول کر کے دکھائی جاتی ہیں جن میں انسانوں کے جسم پر کپڑے نام کی کوئی چیز نہیں ہوتی اور جنہیں دیکھ کر درندے بھی شرما جائیں۔ اگرچہ اس قسم کی تصاویر قانوناً ممنوع ہیں اور بعض مرتبہ اس قسم کے اڈوں پر پولیس کے چھاپے بھی پڑتے رہتے ہیں، لیکن اس قسم کے ہنگامی یا مصنوعی اقدامات سے اس انسانیت سوز بدکاری کے رواج میں کوئی کمی نہیں آ رہی، بلکہ اڑتی ہوئی خبریں شائع ہوئی تھیں کہ اس قسم کی فلمیں اب پاکستان میں بھی بننے لگی ہیں اور فلم اور ٹی وی کا کچھ عملہ اس میں ملوث ہے۔ اگرچہ بعد میں اس کی تردید بھی شائع ہو گئی لیکن اگر اس میدان میں ترقی کی رفتار یہی رہی تو کسی دن اس خبر کی تصدیق بھی ہو جائے تو بعید نہیں۔ اور ان خبروں کا نقد فائدہ تو شام کے اخبارات نے یہ حاصل کر ہی لیا کہ بلو فلموں کے تعارف اور ان کی تاریخ پر مضامین اور نمونے کے طور پر اس کی کچھ تصویریں

شائع کر کے چند روز کے لیے زیادہ آمدنی کا سامان پیدا کر لیا۔

اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ ۝

پھر یہ ساری رام کہانی تو صرف ان فحاشیوں کی ہے جو متوسط اور کم آمدنی والے حلقوں میں پھیلی ہوئی ہیں۔ ان سے آگے بڑھ کر دولت مند طبقوں اور نام نہاد "اونچی سوسائٹیوں" میں جو کچھ ہو رہا ہے اس کا تصور بھی لرزہ خیز ہے "ماڈل گرلز" اور "سنگر گرلز" کے ذریعہ عصمت فروشی تہذیب کا جزء بن گئی ہے پستی وذلت اور کمینگی کی انتہا ہے کہ ان "اونچے حلقوں" میں "تبادلۂ ازواج" کے باقاعدہ کلب قائم ہیں جن میں دیوثی کو ایک فن بنا لیا گیا ہے۔

وَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ الْعَلِيِّ الْعَظِيْمِ

پھر حیرتناک اور افسوسناک بات یہ ہے کہ شرافت وانسانیت کی یہ قتل گاہیں اس ملک اور اس معاشرے میں سرگرم عمل ہیں جہاں صرف بد اخلاق، آبرو باختہ اور بے حیا افراد نہیں بستے، بلکہ ان فحاشیوں کو سچے دل سے پسند کرنے والے بہت کم ہیں، اور ایک بھاری تعداد ان مسلمانوں کی ہے جو ان تمام بے راہیوں کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ لیکن شرفاء کے اس انبوہ میں کوئی خدا کا بندہ ایسا نہیں جو فحاشی کے ان دلالوں سے یہ پوچھ سکے کہ تم اس ستم رسیدہ قوم اور مصیبت زدہ ملت کو تباہی کے کس غار کی طرف لے جا رہے ہو؟ ہماری بے حسی کا عالم یہ ہے کہ ہم صبح وشام اپنی آنکھوں سے اپنے بچوں اور نوجوانوں کو فحاشی کی بھینٹ چڑھتا دیکھتے ہیں، لیکن ان کو اس مصیبت سے بچانے کا کوئی جذبہ ہمارے دل میں پیدا نہیں ہوتا۔ نہ ہمیں اس نوخیز نسل پر کوئی رحم آتا ہے، نہ ان کے مستقبل کی کوئی فکر دامن گیر ہوتی ہے، نہ تباہی کے اس سیلاب کو روکنے کے لیے سینوں میں عزم وعمل کی کوئی لہر اٹھتی ہے۔ کوئی بہت زیادہ حساس انسان ہے تو وہ اس صورت حال پر ایک ٹھنڈی آہ بھر کر خاموش ہو جاتا ہے زیادہ سے زیادہ کسی محفل میں اس کی برائیوں پر تبصرہ کر لیتا ہے لیکن یہ سب کچھ کیوں ہو رہا ہے؟ اس کی ذمہ داری کس پر ہے؟ اس سیلاب کو روکنے کی عملی صورت کیا ہے؟ ان تمام سوالات کے آگے ہماری عقل وفکر، فہم وفراست، قوت عمل اور نیکی وتقویٰ کے تمام جذبات نے سپر ڈال رکھی ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ اس صورت حال پر تبصرہ کرتے ہوئے صرف سینما، ٹی وی، ریڈیو،

نشر و اشاعت کے ذرائع اور حکومت کی بے حسی کا شکوہ کرنے سے بات نہیں بنتی۔ یہ سب چیزیں بلاشبہ اس تباہی کی ذمہ دار ہیں۔

لیکن ہمیں یہ بات کبھی فراموش نہیں کرنی چاہیے کہ اس کی بہت بڑی ذمہ داری خود ہم پر عائد ہوتی ہے۔ اگر ہم خود اپنے جہد و عمل سے اس فحاشی و عریانی کے خلاف ایک عام مدافعانہ شعور پیدا کر سکتے تو ممکن نہیں تھا کہ مذکورہ بالا ادارے جسارت اور ڈھٹائی کی اس حد پر اتر آئیں۔ جو لوگ ہمارے معاشرے میں بے حیائی کی یہ لعنت پروان چڑھا رہے ہیں انہیں معلوم ہو جاتا کہ ان کا یہ عمل صرف آخرت کے وبال ہی کو نہیں بلکہ دنیا میں عوامی غیظ و غضب کو بھی دعوت دے گا۔ لیکن ہمارا حال یہ ہے کہ اگر بسوں کے کرائے میں چند پیسوں کا اضافہ ہو جائے تو ہم ہاتھوں میں اینٹ پتھر لے کر سڑکوں پر نکل آتے ہیں۔ ہماری تنخواہوں میں معمولی کمی رہ جائے تو ہم فریاد و احتجاج کے نعروں سے آسمان سر پر اٹھا لیتے ہیں۔ اشیائے خوردنی کے دام چڑھ جائیں تو ہماری چیخ پکار سات سمندر پار تک پہنچتی ہے، اور ملک کا کوئی گوشہ ہمارے غم و غصہ کی یلغار سے سالم نہیں رہتا۔ لیکن جب نشر و اشاعت کے یہ ادارے ہمارے نوجوانوں میں جنس پرستی کا کوڑھ پھیلاتے ہیں تو ہمارے کانوں پر جوں نہیں رینگتی، جب کوئی مال و زر کا پجاری نوجوانوں کو لوٹنے کے لیے کھلے چوراہوں پر عریاں تصویریں نصب کرتا ہے تو کوئی ہاتھ اسے روکنے کے لیے نہیں اٹھتا۔ جب کوئی جنسی مریض ٹی وی کے عریاں پروگراموں کے ذریعہ ہمارے ایمان و اخلاق پر ڈاکے ڈالتا ہے تو کوئی زبان اس پر احتجاج کے لیے نہیں کھلتی، اور جب اخبارات کے فلمی اشتہار ہمارے بچوں کو ڈھور ڈنگر بننے کا سبق دیتے ہیں تو ہمارے سینوں میں اشتعال کی کوئی لہر بیدار نہیں ہوتی۔

آج تو ایسے لوگ موجود ہیں جو کم از کم دل میں اس صورت حال سے نفرت کرتے ہیں، لیکن اگر ہماری بے حسی کا یہی عالم رہا تو ڈریئے اس دن سے جب کوئی بھلا مانس ان بدعنوانیوں کو چیخ چیخ کر بھی برا کہے گا تو غلاظتوں کے ڈھیر میں پروان چڑھی ہوئی قوم اسے دیوانہ قرار دے گی۔ مغرب کے ''ترقی یافتہ'' ممالک ایک پیکر عبرت بن کر ہمارے سامنے ہیں جنہوں نے فحاشی کے عفریت کو کھلی چھوٹ دے کر اپنے آپ کو اس مقام پر پہنچا لیا ہے جہاں سے واپسی ممکن نہیں۔ آج ان کے مفکرین گلا پھاڑ پھاڑ کر چلاتے بھی

ہیں تو ان کی شنوائی نہیں ہوتی۔ وجہ یہ ہے کہ جنسی جذبہ جب اعتدال سے بڑھتا ہے تو اسے کسی حد پر روکنا ممکن نہیں رہتا، موجودہ حالات اس بات کے گواہ ہیں کہ جنسی لذت کا شوق فطرت سلیمہ کی سرحد پار کرنے کے بعد ایک نہ مٹنے والی بھوک اور نہ بجھنے والی پیاس میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ انسان کو اس بیماری میں مبتلا ہونے کے بعد لطف ولذت کے کسی درجے پر صبر نہیں آتا وہ انسانیت وشرافت کی ایک ایک قدر کو بھنبھوڑ ڈالتا ہے، پھر بھی اسے قناعت نصیب نہیں ہوتی، اور اس کی مثال صرف استسقا کے اس بھکائے ہوئے مریض کی سی ہوتی ہے جو آس پاس کے سارے گھڑے خالی کرنے کے بعد بھی پیاسا کا پیاسا دنیا سے رخصت ہو جاتا ہے۔

لہٰذا ابھی وقت ہے کہ ہم بے راہ روی کے اس بڑھتے ہوئے سیلاب کو روکنے کی کوشش کریں۔ جب پانی سر سے اونچا ہو چکے گا تو قانون اور اخلاقیات کے ساری مشینریاں اس طوفان کو روکنے میں ناکام ہو جائیں گی۔

ہماری نظر میں فوری ضرورت اس بات کی ہے کہ کچھ ملت کا درد رکھنے والے اصحاب صرف اس ایک انسداد فواحش کے مقصد کو لے کر کھڑے ہوں، اور اسی کو اپنی سوچ بچار اور جدوجہد کا موضوع بنائیں۔ دنیا میں چھوٹے چھوٹے مقاصد کے لیے بڑی بڑی انجمنیں اور جماعتیں قائم ہیں لیکن کوئی ایسی انجمن نظر نہیں آتی جو خالص انسداد فحاشی کے لیے کام کر رہی ہو۔ اگر کوئی انجمن قائم ہو جائے اور اس کے اصحاب روزانہ کچھ وقت فارغ کر کے اس مقصد میں صرف کریں تو ابھی اصلاح کی کافی توقع کی جا سکتی ہے۔ اس انجمن کا طریق کار ہماری نظر میں حسب ذیل ہونا چاہیے۔

۱۔ عوام میں فحاشی وعریانی کے خلاف مدافعانہ شعور بیدار کرنا اس غرض کے لیے تقریروں اور مذاکروں کا انعقاد اور تبلیغی لٹریچر کی تقسیم۔

۲۔ اخبارات کے مدیروں سے ملاقات کر کے انہیں اس بات پر آمادہ کرنا کہ وہ اپنے جرائد میں فحش تصویروں، عریاں اشتہارات اور غیر اخلاقی خبروں اور مضامین کا مکمل بائیکاٹ کریں۔ مدیرانِ جرائد میں غالباً اکثریت ایسے لوگوں کی ہے جنہیں ذاتی طور پر فحاشی کی ترویج کا شوق نہیں، لیکن وہ بے سوچے سمجھے زمانے کی رو پر بہہ رہے ہیں اور اگر انہیں افہام وتفہیم کے ذریعہ قائل کیا جا سکے

تو شاید ان کے دل میں کوئی احساس پیدا ہو اور وہ اپنی اس روش کو بدل سکیں۔

۳۔ جو اخبارات اپنی روش سے باز نہ آئیں، عوام میں ان کا بائیکاٹ کرنے کی مہم چلائی جائے۔

۴۔ ریڈیو اور ٹی وی کے ذمہ داروں سے معزز شہریوں کے وفود ملاقات کریں، اور انہیں فحاشی و بے حیائی کے پروگراموں سے روکنے کی کوشش کی جائے۔

۵۔ عوامی وفود حکومت کے ذمہ داروں کے پاس پہنچیں اور انہیں اس سنگین صورت حال کے خلاف اپنے جذبات سے آگاہ کریں۔ نشرواشاعت کے ذرائع ہر معاملے میں حکومت کی پالیسی کا رخ دیکھتے اور اس کے مطابق اپنے عمل کا ڈھانچہ تیار کرتے ہیں۔ موجودہ بے لگامی کا ایک بڑا سبب یہ ہے کہ ان کو اس بات کا یقین ہے کہ حکومت اس قسم کے اقدامات کو ناپسند نہیں کرتی اس کے برخلاف اگر انہیں یہ احساس دلایا جائے کہ فحاشی و عریانی کا یہ انداز حکومت کی پالیسی کے خلاف ہے تو اس بے لگام ذہنیت میں ضرور کمی آئے گی۔

۶۔ حزب اقتدار اور حزب اختلاف دونوں کے قومی اور صوبائی اسمبلیوں کے ارکان سے ملاقات کر کے انہیں اس بات پر آمادہ کیا جائے کہ وہ ''انسداد فواحش'' کے لیے ایک جامع قانون اسمبلی کے ذریعہ منظور کرائیں جس کے ذریعہ ملک بھر میں عریانی و فحاشی کے تمام اقدامات پر پابندی لگائی جاسکے۔

۷۔ عوام میں اس بات کی تحریک چلائی جائے کہ وہ ٹیلی ویژن کے ایسے پروگراموں کا قطعی بائیکاٹ کریں گے جو شرم و حیا کی روایات کے خلاف ہیں۔

یہ کام ایک دو روز میں پورا ہو جانے والا نہیں ہے۔ اس کے لیے مسلسل جدوجہد متواتر عمل اور مستقل سوچ بچار کی ضرورت ہے۔ جب تک کوئی معین جماعت اس کام کے لیے کھڑی نہیں ہوگی۔ اس وقت تک اس کی اہمیت محسوس کرنے والے حضرات بھی اسے آج سے کل اور کل سے پرسوں پر ٹلاتے رہیں گے لیکن یہ ضروری ہے کہ جو جماعت یا انجمن یہ کام لے کر اٹھے اس پر کوئی سیاسی چھاپ نہ ہو اس میں ہر شعبہ زندگی کے افراد شامل ہوں اور وہ صرف اس محدود کام کو اپنا محور و مقصد بنا کر سرگرم ہو۔ کام شروع کرنے کے بعد خود اس کے نئے نئے راستے نظر آئیں گے اور دل میں اللہ کی خوشنودی حاصل

کرنے کا شوق، اسلام کے لیے خلوص اور ملت کا سچا درد ہو تو ایسی کوشش رائیگاں نہیں جاسکتی۔ اللہ تعالیٰ کچھ حساس دلوں میں اس کام کی اہمیت پیدا فرمادے اور وہ وقت کی اس اہم ضرورت کو پورا کرسکیں۔ اگر کسی صاحب دل کے سینے میں ان عاجزانہ گزارشات سے حرکت پیدا ہو اور وہ اس سلسلہ میں کوئی کام کرنے کا ارادہ کریں تو وہ مشورے کے لیے احقر کو بھی مطلع فرمادیں تو ممنون ہوں گا۔

وما توفیق الا باللہ

مضمون:۴۱

مقدارِ مہر

الجواب و منه الصدق و الصواب:

۱۔ سنت مستمرہ سے کیا مراد ہے؟ اگر یہ مراد ہو کہ نبی علیہ السلام اور صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین سے لے کر آج تک علماء امت اسی کے مطابق عمل کرتے ہوئے آرہے ہیں۔ یہ تو کسی دلیل سے ثابت نہیں۔ نہ نقلاً نہ عملاً اور جہاں تک اس کا تعلق نبی علیہ السلام کے ساتھ ہے وہ تو صحیح ہے کیوں کہ نبی علیہ السلام نے اپنی ازواج مطہرات اور صاحبزادیوں کا مہر پانچ سو درہم سے زائد مقرر نہیں فرمایا جس پر ہم آئندہ جا کر مفصلاً بحث کریں گے۔ انشاء اللہ تعالیٰ

۲۔ مجموعہ روایات ذیل سے یہی بات ثابت ہوتی ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی بنات اور ازواجِ مطہرات رضی اللہ تعالیٰ عنہن اجمعین کا مہر ساڑھے بارہ اوقیہ تھا جو پانچ سو درہم ہوتے ہیں جس کی مقدار وزن رائج الوقت کے اعتبا سے ۱۳۱ تولہ ۳ ماشہ ہوتی ہے اور یہی صحیح اور رائج ہے۔ لیکن یہ بات باعتبار اکثر ازواج کے ہے کیوں کہ حضرت ام حبیبہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا زوجہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مہر چار ہزار درہم تھا۔ جس کو شاہ نجاشی نے مقرر کر کے خود ادا کیا تھا، ایسا ہی حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا، حضرت جویریہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا؟ حضرت صفیہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا مہر اور کچھ تھا۔ جیسا کہ حافظ رحمۃ اللہ علیہ کی عبارت میں درج ہے۔

عن عمر بن الخطاب قال الا لا تغالوا صدقة النساء فانها لو كانت مكرمة في الدنيا (الى قوله) ما علمت رسول الله صلى الله عليه وسلم نكح شيئا من نسائه ولا انكح شيئاً من بناته على اكثر

من اثنی عشرة اوقیه۔

(رواہ احمد والترمذی وابوداؤد والنسائی وابن ماجہ والدارمی مشکوٰۃ۔ جلد۲ صفحہ ۲۷۷)

وعن ابی سلمه قال سالت عائشة کم کان صداق النبی صلی الله علیه وسلم قالت کان صداقه لا زواجه ثنتی عشر ة اوقیة ونش، قالت اتدری ماالنش قلت لاقالت نصف اوقیه فتلک خمسمائة درهم۔ (رواہ مسلم۔ جلد:۱، صفحہ:۴۵۸)

قال الحافظ رحمة الله علیه فی التلخیص "اطلاقه ان جمیع الزوجات کان صداقهن کذالک محمول علی الا کثر، والا فخلیجة، وجویریة، بخلاف ذلک وصفیة کان عتقها صداقهاوام حبیبة اصدقها النجاشی اربعة آلاف کماروا ه ابو داؤد والنسائی.

(تلخیص الحبیر للحافظ ابن حجر العسقلانیؒ۔ جلد:۳، صفحہ:۱۹۱)

۳۔ حضرت فاطمۃ زہراء رضی اللہ عنہا کی مقدار مہر میں روایات بہت مختلف نظر آتی ہیں۔ ان تمام روایات کو سامنے رکھنے سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ اس باب میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ، اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث راجح ہے اور ان دونوں روایات کے مجموعہ سے مقدار پانچ سو درہم ثابت ہوتی ہے اور یہی قول ہمارے حضرات اکابر کا ہے جو منقح اور محقق معلوم ہوتا ہے اور اس کی مقدار وزن رائج الوقت کے اعتبار سے ۱۳۱ تولہ ۳ ماشہ، چاندی ہوتی ہے لہٰذا اتنی چاندی یا اتنی چاندی (۱۳۱۔۳) کی قیمت کے برابر روپے یا نوٹ مہر فاطمی ہوگا اور سوال میں یہ جو مذکور ہے:

''اس زمانے میں سرکار نے .... بعینہ اس ڈیڑھ سو روپیہ کا نوٹ مہر فاطمی ہوگا؟''

یہ صحیح نہیں کیوں کہ دور حاضر میں جو کاغذی روپیہ ''نوٹ'' ہے اس کا ڈیڑھ

سو روپیہ یا ایک سو اکتیس روپیہ مہر فاطمی (۱۳۱ تولہ ۳ ماشہ چاندی) کے برابر نہیں ہوسکتا۔ لہٰذا مہر فاطمی (۱۳۱۔۳) کی قیمت کے برابر کاغذی روپیہ ''نوٹ'' ہی مہر ہوگا جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے۔

وعن ابی سلمة قال سالت عائشة کم کان صداق النبی صلی الله علیه وسلم الی اخر الحدیث کما مرفی الجواب الثانی.

وعن عمر بن الخطاب قال الا لا تغالوا صدقة النساء فانهالو کانت مکرمة فی الدنیا الی اخر الحدیث کما مرایضا فی الجواب الثانی.

(مجمع الزوائد للهیثمیؒ. جلد۴، صفحه ۲۸۳. والسنن الکبریٰ للبیهقی. جلد۷، صفحه۳۳۵. المرقات لعلی القاریؒ. جلد۶، صفحه ۲۴۶. اشعة اللمعات للیشخ الدهلویؒ. جلد۳، صفحه ۱۳۷. والشامیؒ. جلد۲، صفحه۳۲۹ وفتح القدیر لابن الهمامؒ جلد۲، صفحه۴۳۶. والتبیین للزیلعیؒ جلد۲ صفحه۱۳۷. فتاوی دارالعلوم دیوبند جلد۸، صفحه۲۹۷. شرح المذهب للنوویؒ جلد۵. صفحه۴۸۳. زرقانی علی المواهب اللدنیه جلد ۲. صفحه۳.۶. الاستیعاب علی هاش الاصابة لابن عبدالبرؒ جلد۴، صفحه ۳۶۳. البدایة والنهایة لابن کثیرؒ جلد۳، صفحه ۳۴۶. وایضاً جلد۷، صفحه ۳۴۲. دستور العلماء للقاضی عبدالنبی الدحمدنگریؒ جلد۳، صفحه ۳۸۹)

۴۔ مہر شرعی کی اقل مقدار دس درہم ہے جس کی مقدار وزن رائج الوقت کے اعتبار سے دو تولہ ساڑھے سات ماشہ چاندی ہوتی ہے اور زائد کے لیے کوئی حد ایسی مقرر نہیں کہ اس سے زائد مہر نہ ہو سکے۔ لیکن اس میں شک نہیں ہے کہ مہر کا کم ہونا بہتر ہے اور حیثیت سے زائد ہونا تو کسی طرح مناسب نہیں ہے جیسا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی حدیث مذکور سے معلوم ہوتا ہے، علاوہ بریں جب مہر زیادہ مقرر کیا جاتا ہے تو کبھی اس کے ادا کرنے کی نہ ہمت ہوسکتی ہے اور نہ کبھی اس کا ارادہ ہوتا ہے اور ادائے مہر کا ارادہ ہی دل میں نہ ہونے پر حدیث میں

وعید آئی ہے لہٰذا حتی الامکان شوہر کو اپنی حیثیت کے مطابق مہر مقرر کرنا چاہیے۔
یہ رائے حکیم الامت حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی ہے:

عن عائشه رضی الله عنها ان النبی صلی الله علیه وسلم قال ان من اعظم النساء برکة ایسرهن صداقاً. لفظ حدیث عفان. وفی روایة یزید بن هارون، ایسرهن مؤنة.

وایضاً عن عائشة رضی الله عنها انها قالت قال رسول الله صلی الله علیه وسلم من یمن المرأة ان تیسر خطبتها وان یتیسر صداقها. ویتیسر رحمها. قال عروه وانا اقول من عندی من اول شؤمها ان یکثر صداقها.

(کلاهما فی السنن الکبریٰ للبیهقی۔ جلد ۷، صفحہ ۲۳۵)

وعن ابن عباس: قال قال رسول الله صلی الله علیه وسلم خیرهن ایسرهن صداقاً۔

(مجمع الزوائد جلد ۴ صفحہ ۲۸۱)

عن عقبة بن عامر: قال قال رسول الله صلی الله علیه وسلم خیر الصداق ایسره۔

(رواه الحاکم وصححه) (نیل الاوطار بحوالہ اعلاء السنن جلد ۱۱، صفحہ ۵۸)

قال النووی: بعد ذکر هذه الروایة: والمستحب ان لایزید علی خمسمائة درهم وهو صداق ازواج النبی صلی الله علیه وسلم وبناته علیهن سلام الله ورحمته، لماروی عن عائشة کماذکرناه من قبل. (شرح المهذب للنووی جلد ۱۵، صفحہ ۴۸۳)

وقال ابن قدامة بعد هذه الروایة: فلا تستحب الزیادة علی هذا لانه اذا اکثر ربما تعذر علیه

فیتعرض للضرر فی الدنیا والاٰخرۃ۔

(المغنی لابن قدامہ جلد ۶، صفحہ ۶۸۲)

نیز اس کے ساتھ ہی یہ بھی خوب سمجھ لینا چاہیے کہ اگر کسی خاندان کی لڑکیوں کا مہر زیادہ تعداد میں رائج ہے تو جب تک سارا خاندان اپنا رواج بدل کر مہر میں کمی نہ کرے اس وقت تک تنہا کسی لڑکی کا مہر کم باندھنے کا اختیار اس کے اولیاء کو نہیں ہے لوگ اس میں بہت غفلت کرتے ہیں کہ سارے خاندان کے مہر مثل کے خلاف اپنی لڑکی کا مہر کم کر دیتے ہیں جس کا ان کو حق نہیں ہے۔ (امداد المفتین المفتی محمد شفیعؒ۔ جلد:۱، صفحہ ۵۶۵)

اور شاید یہی وجہ ہے کہ بہت سے حضرات صحابہ رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین نے زیادہ سے زیادہ مہر پر نکاح کیے ہیں۔ حالاں کہ مہر فاطمی کا مسنون اور افضل ہونا ان کو بھی (ظاہراً) معلوم تھا۔ روایات میں ہے کہ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے چالیس ہزار درہم مہر مقرر کیا۔ جس کی مقدار وزن رائج الوقت کے اعتبار سے ایک ہزار پانچ سو تولہ چاندی ہوتی ہے اور جس لڑکی کا یہ مہر مقرر ہوا وہ بھی حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی صاحبزادی حضرت ام کلثوم ہیں۔ اسی طرح حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ، انس بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ، حسن بن علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ، مصعب بن الزبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ، عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بہت مہر مقرر کر کے اپنا اور اپنی صاحبزادیوں کا نکاح کیا۔

الغرض مہر میں غلو کرنا جائز نہیں۔ بلکہ سنت کے مطابق مہر کم رکھنا بہتر و افضل ہے۔ لیکن دوسری طرف بھی غلو کرنا جائز نہیں کہ مہر مثل کے خلاف لڑکی یا اس کے اولیاء کو مہر فاطمی پر مجبور کر دیا جائے۔ یہ غلو اور جبر بھی بالکل خلاف سنت اور خلاف تعامل صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین ہے۔ اعتدال کی صورت یہ ہے اپنے خاندان میں مہر مثل کم کرنے کی کوشش کی جاوے اور سب خاندان والوں کو احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت سیدۃ النساء رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے مہر کی تقلید و اتباع کی ترغیب دی جاوے۔ اگر وہ سب قبول کر لیں تو بہتر ورنہ تنہا کسی ایک لڑکی یا اس کے اولیاء کو اس پر مجبور نہ کیا جاوے

قال الزیلعی: ان الفاروق تزوج ام کلثوم بنت علی من فاطمة علی اربعین الف درهم و ابن عمر

تزوج علی عشرة آلاف درهم و کان بزوج بناته علی عشرة آلاف درهم۔ وروی عن الحسن بن علی انه تزوج امرأة فساق الیها مائة جاریة قیمة کل واحدة منهن الف درهم وتزوج ابن عباس شمیلة علی عشرة آلاف درهم وتزوج انس امرأة علی عشرة آلاف درهم۔

قال الزیلعیؒ: ویجوزان یکون ذلک مهر مثل کل واحدة منهن لانهٗ یختلف باختلف الزمان ولا ید ذلک علی الفضیلة بل هو الظاهر، لان المال کان قلیلاً فی زمن النبی صلی الله علیه وسلم۔ ثم الستع المسلمون بعد ذلک لما حصل لهم من فتوح البلاد۔ (زیلعی شرح کنز۔جلد۲،صفحہ:۱۳۱)

وایضاً هذه الروایات فی السنن الکبریٰ للبیهقی جلد:۷،صفحه ۲۳۳ وشرح المهذب للنووی جلد ۱۵، صفحه ۴۸۳

واللہ اعلم

الجواب صحیح

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

دارالافتاء دارالعلوم کراچی نمبر ۱۴

احقر محمد کمال الدین فینوی عفی عنہ

دارالافتاء دارالعلوم کراچی نمبر ۱۴

۱۴۰۳/۸/۵ھ

بشکریہ البلاغ کراچی

ذی قعدہ ۱۴۰۳

مضمون: ۴۲

رفیقہ حیات کے ساتھ حسن سلوک

بیوی کا مارنا بداخلاقی ہے:

ایک مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبہ ارشاد فرمایا اور اس خطبے میں بہت سی باتیں ارشاد فرمائیں اور یہ بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ:

"یہ بری بات ہے کہ تم میں سے ایک شخص اپنی بیوی کو اس طرح مارتا ہے جیسے آقا اپنے غلام کو مارتا ہے اور دوسری طرف اس سے اپنی جنسی خواہش بھی پوری کرتا ہے۔ یہ کتنی بداخلاقی اور بے غیرتی کی بات ہے کہ آدمی اپنی بیوی کو اس طرح مارے جس طرح غلام کو مارا جاتا ہے۔" (صحیح بخاری)

بیوی کی اصلاح کے تین درجات:

قرآن کریم نے میاں بیوی کے تعلقات کی چھوٹی چھوٹی جزئیات اور مسائل کا حکم بیان کرنے کا اہتمام کیا ہے۔ میاں بیوی کے درمیان چپقلش کا پہلا درجہ یہاں سے شروع ہوتا ہے کہ شوہر کو بیوی کی کوئی بات ناپسند ہوگئی تو اس کا حل قرآن کریم نے یہ بتادیا کہ جب ایک بات تمہیں ناپسند ہوگئی تو تم یہ دیکھو کہ دوسری بات اس کے اندر پسندیدہ بھی ہوگی اور پھر بھی اگر شوہر یہ سمجھتا ہے کہ اس کے اندر بعض باتیں ایسی ہیں جو قابل برداشت نہیں ہیں۔ بلکہ اصلاح کے لائق ہیں اور ظاہر ہے کہ مرد کو اس بات کا بھی مکلف بنایا گیا ہے یہ کہ اگر وہ بیوی میں کوئی بات قابل اصلاح اور بری دیکھے تو اس کی اصلاح کی فکر کرے۔ لیکن اس کی اصلاح کا طریقہ کیا ہونا چاہیے؟ وہ طریقہ قرآن کریم نے سورہ نساء میں بتادیا۔

سب سے پہلے تو ان کو نرمی، خوش اخلاقی اور محبت سے نصیحت کرو۔ یہ اصلاح کا

پہلا درجہ ہے۔ اگر نصیحت کے ذریعہ وہ باز آجائیں تو بس۔ اب آگے قدم نہ بڑھاؤ اور اگر وعظ و نصیحت کارگر نہ ہو تو پھر اصلاح کا دوسرا درجہ یہ ہے کہ ان۔ کے ساتھ سونا چھوڑ دو اور اپنا بستر الگ کردو۔ اگر ذرا بھی سمجھ ہو گی اور فہم میں درستگی ہو گی تو اب باز آجائے گی۔

بیوی کو مارنے کی حد:

اور اگر اصلاح کا دوسرا درجہ بھی کارگر ثابت نہ ہو تو پھر تیسرا درجہ اختیار کرو۔ وہ ہے مارنا لیکن مار کیسی ہونی چاہیے؟ اس کے بارے میں حجۃ الوداع کے موقع پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے امت کو آخری نصیحت فرمائی۔ ان میں یہ نصیحت بھی فرمائی یعنی اول تو مار کا مرحلہ آنا ہی نہیں چاہیے اور اس صورت کو صرف اس وقت استعمال کیا جائے جب اس کے علاوہ کوئی چارہ باقی نہ رہ جائے اس لیے کہ مار بالکل آخری چارہ کار ہے اور اس میں یہ قید لگادی کہ وہ مار تکلیف والی نہ ہو یعنی اس مار سے تکلیف دینا مقصود نہ ہو بلکہ تادیب مقصود ہو اور اصلاح مقصود ہو اس لیے تکلیف دینے والی ایسی مار جائز نہیں جس سے نشان پڑ جائے۔

اس کا بستر چھوڑ دو:

اگر تم عورت کے اندر کوئی بے حیائی کی بات دیکھو تو پہلے اس کو سمجھاؤ اگر سمجھانے سے باز نہ آئے تو اس کا بستر چھوڑ دو اور الگ بستر پر سونا شروع کردو۔ اس حدیث میں بستر چھوڑنے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ تم گھر سے نکل کر باہر چلے جاؤ۔ بلکہ گھر کے اندر ہی رہو۔ البتہ احتجاج کے طور پر تادیبی طور پر اور ایک نفسیاتی مار کے طور پر کمرہ بدل دو یا بستر بدل دو اور اس سے علیحدگی اختیار کرلو۔

ایسی علیحدگی جائز نہیں:

بعض علماء نے اس حدیث کے یہ معنی بھی بیان فرمائے ہیں کہ:

''ایسے موقع پر اگرچہ بستر تو الگ کردو لیکن بالکلیہ بات چیت ختم نہ

کرو اور ایسی علیحدگی نہ ہو کہ ایک دوسرے کو سلام بھی نہ کیا جائے اور سلام کا جواب بھی نہ دیا جائے اور کوئی ضروری بات کرنی ہو تو اس کا جواب بھی نہ دیا جائے۔ اس طرح کی علیحدگی جائز نہیں ہے۔"

چار ماہ سے زیادہ سفر میں بیوی کی اجازت:

اس حدیث کے تحت فقہاء کرام نے یہاں تک لکھا ہے کہ مرد کے لیے چار مہینہ سے زیادہ گھر سے باہر رہنا بیوی کی اجازت اور اس کی خوش دلی کے بغیر جائز نہیں۔ چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنی تمام قلمرو میں یہ حکم جاری فرمادیا کہ جو مجاہدین گھر سے باہر رہتے ہیں وہ چار ماہ سے زیادہ گھر سے باہر نہ رہیں اور چار ماہ کے اندر ایک مرتبہ ضرور اپنے گھر واپس آئیں۔ اور اسی وجہ سے فقہاء کرام نے لکھا ہے کہ اگر کسی شخص کو چار ماہ سے کم کا سفر درپیش ہو تو اس کے لیے بیوی کی اجازت کی ضرورت نہیں لیکن اگر چار ماہ سے زیادہ کا سفر درپیش ہو تو اس کے لیے بیوی سے اجازت لینی ضروری ہے۔ چاہے وہ سفر کتنا ہی بابرکت کیوں نہ ہو۔ حتی کہ اگر حج کا سفر ہو تو اس میں بھی اگر وہ چار ماہ کے اندر واپس آسکتا ہے تو پھر اجازت کی ضرورت نہیں لیکن اگر نفلی طور پر وہاں زیادہ قیام کا ارادہ ہے تو پھر اجازت لینی ضروری ہے۔ یہی حکم تبلیغ۔ دعوت، اور جہاد کے سفر کا ہے۔ لہٰذا جب ان مبارک سفروں میں بیوی کی اجازت ضروری ہے تو پھر جو لوگ ملازمت کے لیے پیسہ کمانے کے لیے لمبے سفر کرتے ہیں ان میں تو بطریق اولی بیوی کی اجازت ضروری ہے۔ اگر بیوی کی اجازت کے بغیر جائیں گے تو یہ بیوی کی حق تلفی ہوگی اور شرعاً ناجائز ہوگا اور گناہ ہوگا۔

آج کے دور میں "خوش اخلاقی":

آج کل ہر چیز کے معنی بدل گئے۔ ہر چیز کا مفہوم الٹ گیا۔ مولانا قاری محمد طیب صاحب" فرمایا کرتے تھے کہ پہلے زمانے کے مقابلے میں اب اس دور میں ہر چیز الٹی ہوگئی۔ یہاں تک کہ پہلے چراغ تلے اندھیرا ہوتا تھا اور اب بلب کے اوپر اندھیرا ہوتا

ہے۔ اگر بلب لٹک رہا ہو تو اس کے اوپر اندھیرا ہوتا ہے۔ پھر فرماتے کہ آج کل ہر چیز کی قدریں بدل گئیں۔ ہر چیز کا مفہوم الٹ گیا۔ یہاں تک کہ اخلاق کا مفہوم بھی بدل گیا۔ آج صرف چند ظاہری حرکات کا نام اخلاق ہے۔ مثلاً مسکرا کر مل لیے اور ملاقات کے وقت رسمی الفاظ زبان سے ادا کردیئے۔ مثلاً یہ کہہ دیا کہ ''آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی'' یا ''آپ سے مل کر بڑا اچھا معلوم ہوا'' وغیرہ۔ اب زبان سے تو یہ الفاظ ادا کر رہے ہیں لیکن دل کے اندر عداوت اور حسد کی آگ سلگ رہی ہے۔ دل کے اندر نفرت کروٹیں لے رہی ہے۔ بس آج اسی کا نام خوش اخلاقی ہے۔ اور آج باقاعدہ یہ ایک فن بن گیا ہے کہ دوسروں کے ساتھ کس طرح پیش آیا جائے۔ تاکہ دوسرے لوگ ہمارے گرویدہ ہو جائیں اور باقاعدہ اس پر کتابیں لکھی جارہی ہیں کہ دوسرے کو گرویدہ بنانے کے لیے اور دوسرے کو متاثر کرنے کے لیے کیا طریقے اختیار کیے جائیں؟ لہٰذا سارا زور اس پر صرف ہو رہا ہے کہ دوسرا گرویدہ ہو جائے۔ دوسرا ہم سے متاثر ہو جائے۔ اور ہم کو اچھا سمجھنے لگے۔ آج اسی کا نام ''اخلاق'' رکھا جاتا ہے۔

خوب سمجھ لیجیے اس کا اس اخلاق سے کوئی تعلق نہیں جس کا ذکر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم فرما رہے ہیں۔ یہ اخلاق نہیں بلکہ ریاکاری اور دکھاوا ہے۔ اور یہ نمائش ہے اور یہ دوسرے لوگوں کو اپنا گرویدہ بنانے اور اپنے گرد اکٹھا کرنے کا بہانہ ہے، یہ حب جاہ ہے، یہ حب شہرت ہے، جو بذات خود بیماریاں اور بداخلاقیاں ہیں۔ حسن خلق سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔

''حسن اخلاق'' دل کی کیفیت کا نام ہے:

حقیقت میں اخلاق دل کی ایک کیفیت کا نام ہے جس کا مظاہرہ اعضاء اور جوارح سے ہوتا ہے اور وہ یہ ہے کہ دل میں ساری مخلوق خدا کی خیر خواہی ہو اور ان سے محبت ہو خواہ وہ دشمن اور کافر ہی کیوں نہ ہو اور یہ سوچ کر یہ میرے مالک کی مخلوق ہے لہٰذا مجھے اس سے محبت رکھنی چاہیے اس کے ساتھ مجھے اچھا سلوک کرنا چاہیے۔ اولاً دل میں یہ جذبہ پیدا ہوتا ہے اور پھر اس جذبے کے ماتحت اعمال صادر ہوتے ہیں اور اس کے ساتھ خیر خواہی کرتا ہے۔ اب اس جذبہ کے بعد چہرے پر جو مسکراہٹ اور تبسم آتا ہے وہ

بناوٹی نہیں ہوتا اور وہ دوسروں کو اپنا گرویدہ کرنے کے لیے نہیں ہوتا بلکہ وہ اپنی دلی خواہش اور دلی جذبے کا ایک لازمی اور منطقی تقاضا ہوتا ہے۔ لہٰذا حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے بیان کردہ اخلاق میں اور آج کے اخلاق میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔

اخلاق پیدا کرنے کا طریقہ:

اور ان اخلاق کو حاصل کرنے کے لیے محض کتاب پڑھ لینا کافی نہیں ہے اور نہ محض وعظ سن لینا ہی کافی ہوتا ہے۔ اس کے لیے کسی مربی اور کسی مصلح کی صحبت میں رہنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ تصوف اور پیری مریدی کا جو سلسلہ بزرگوں سے چلا آرہا ہے اس کا اصل مقصد یہ ہے کہ انسان کے اندر اخلاق حسنہ پیدا ہوں اور برے اخلاق دور ہوں بہر حال! ایمان میں کامل ترین افراد وہ ہیں جن کے اخلاق اچھے ہوں جن کے دل میں صحیح داعیے پیدا ہوتے ہوں اور ان صحیح داعیوں کا اظہار ان کے اعمال و افعال سے ہوتا ہو۔

اللہ کی بندیوں کو نہ مارو:

حضرت ایاس بن عبداللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ اللہ کی بندیوں کو مارو نہیں۔ یعنی عورتوں کو مارنا اچھی بات نہیں ہے۔ مت مارا کرو اب جب حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے روک دیا کہ یہ کام مت کرو تو جس شخص نے براہ راست حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے سن لیا اس کے لیے وہ کام حرام قطعی ہو گیا اب اس کے لیے کسی بھی حالت میں مارنا جائز نہیں۔

حدیث ظنی یا قطعی:

صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین نے جو بات حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے براہ راست سن لی وہ حدیث ظنی نہیں بلکہ قطعی ہے۔ لہٰذا اگر کوئی اس کی خلاف ورزی کرے گا تو صرف گناہ گار نہیں ہوگا بلکہ کافر ہو جائے گا۔ اس لیے کہ اس نے حضور اقدس

صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کا انکار کر دیا۔ لہٰذا فوراً کافر ہو گیا۔

صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین ہی اس لائق تھے:

کبھی کبھی ہمارے دلوں میں یہ احمقانہ خیال آتا ہے کہ کاش! ہم بھی حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں پیدا ہوئے ہوتے اور اس زمانے کی برکات حاصل کرتے۔ ارے یہ تو اللہ تعالیٰ کی حکمت ہے اور وہی اپنی حکمت سے فیصلے فرماتے ہیں اور اپنی حکمت سے ہمیں اس دور میں پیدا فرمایا اگر ہم اس دور میں پیدا ہو جاتے تو خدا جانے کس اسفل السافلین میں ہوتے۔ اس لیے کہ وہاں ایمان کا معاملہ اتنا نازک تھا کہ ذرا سی دیر میں انسان ادھر سے ادھر ہو جاتا تھا۔

وہ تو دیتے ہیں بعد از قضا کار دیکھ کر
وہ تو دیتے ہیں بعد ظرف گدا کا دیکھ کر

یہ تو صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین ظرف تھا کہ انہوں نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے جلوہ مبارک کو ہضم فرمایا۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جس جانثاری کا معاملہ فرمایا۔ وہ انہی کا ظرف تھا۔ اور اسی کے نتیجے میں وہ اس درجے تک پہنچے۔ اگر ہم جیسا آرام پسند اور عافیت پسند آدمی اس دور میں ہوتا تو خدا جانے کیا حشر بنتا۔ یہ تو اللہ تعالیٰ کا بڑا فضل و کرم ہے کہ اس نے ہمیں اس انجام سے بچایا اور ایسے دور میں پیدا فرمایا جس میں ہمارے لیے بہت سی آسانیاں ہیں۔ آج ایک حدیث کے بارے میں ہم یہ کہہ دیتے ہیں کہ یہ حدیث ظنی ہے اور ظنی ہونے کی وجہ سے اگر کوئی انکار کردے گا تو کافر نہ ہوگا۔ صرف گناہ گار ہی ہوگا لیکن صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کا معاملہ تو یہ تھا کہ اگر کوئی شخص حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے کوئی حکم سننے کے بعد انکار کردے کہ میں نہیں کرتا فوراً کافر ہو جاتا۔

یہ عورتیں شیر ہو گئی ہیں:

لہٰذا جب حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمایا کہ عورتوں کو نہ مارو تو اب مارنے کا سلسلہ بالکل بند ہو گیا۔ اس لیے کہ صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین تو ایسے نہیں

تھے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے کسی کام کے بارے میں ممانعت سنیں اور پھر بھی وہ کام جاری رکھیں۔ جب مارنے کا سلسلہ بالکل بند ہوگیا تو کچھ دنوں کے بعد حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ، حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ:

"یا رسول اللہ! یہ عورتیں تو اب اپنے شوہروں پر شیر ہوگئیں، اس لیے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مارنے کی ممانعت کردی جس کے بعد اب کوئی شخص اپنی بیوی کو نہیں مارتا، بلکہ مار کے قریب جانے سے بھی ڈرتا ہے اور اس نہ مارنے کے نتیجے میں عورتیں شیر ہوگئی ہیں اور شوہروں کی حق تلفیاں کرنے لگی ہیں اور ان کے ساتھ بدسلوکی کرنے لگی ہیں۔ اب آپ فرمائیں کہ ان حالات میں ہم کیا کریں؟"

چنانچہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اجازت دے دی کہ اگر عورتیں شوہروں کی حق تلفی کریں اور مارنے کے سوا کوئی چارہ نہ ہو تو تمہیں مارنے کی اجازت ہے اب اس اجازت کے نتیجے میں یہ ہوا کہ ابھی کچھ ہی دن گذرے تھے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بہت سی خواتین آنی شروع ہوگئیں اور آکر عرض کرتیں کہ یا رسول اللہ! آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے شوہروں کو مارنے کی اجازت دیدی جس سے لوگوں نے غلط فائدہ اٹھایا اور ہمیں اس طرح مارا۔

یہ اچھے لوگ نہیں ہیں:

اس پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا نام لے کر فرمایا محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے گھر میں بہت سی خواتین چکر لگاتی ہیں اور وہ اپنے شوہروں کی شکایت کرتی ہیں کہ وہ شوہر ان کے ساتھ بدسلوکی کرتے ہیں۔ ان کو بری طرح مارتے ہیں لہٰذا خوب اچھی طرح سن لو کہ جو لوگ یہ مار پیٹ کر رہے ہیں وہ تم میں اچھے لوگ نہیں ہیں اور اچھے مومن اور مسلمان کا کام نہیں ہے کہ وہ مار پیٹ کرے۔ اس سارے مجموعے سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بات واضح فرمادی کہ اگرچہ ناگزیر حالت میں جب کوئی اور چارہ نہ رہے اس

وقت شریعت کی طرف سے ایسی مار کی اجازت ہے جس سے نشان نہ پڑے اور بہت زیادہ تکلیف نہ ہو لیکن اس کے باوجود محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اصل خواہش یہ ہے کہ کوئی مرد کسی عورت پر کبھی ہاتھ نہ اٹھائے چنانچہ حضرت امہات المؤمنین رضی اللہ تعالیٰ عنہن فرماتی ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ساری عمر کبھی کسی عورت پر ہاتھ نہیں اٹھایا لہٰذا سنت کا تقاضا بھی یہی ہے۔

دنیا کی بہترین چیز ''نیک عورت'':

حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ روایت کرتے ہیں کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ دنیا ساری کی ساری لطف اندوزی کی چیز ہے یعنی ایسی چیز ہے جس سے انسان فائدہ اٹھاتا ہے۔ نفع اٹھاتا ہے اور لطف اٹھاتا ہے۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ دنیا انسان کے نفع کے لیے پیدا فرمائی ہے۔ جیسا کہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ:

> ''اللہ وہ ذات ہے جس نے تمہارے فائدے کے لیے پیدا کیا جو کچھ زمین میں ہے اور تمہارے نفع کے لیے اور تمہارے لطف اٹھانے کے لیے تمہاری ضرورت پوری کرنے کے لیے پیدا کیا اور دنیا کی بہترین متاع جس سے انسان نفع اٹھائے وہ نیک اور صالح عورت ہے۔''

ایک دوسری حدیث میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ:

مجھے تمہاری دنیا میں سے تین چیزیں بہت زیادہ محبوب ہیں۔ کتنا خوبصورت جملہ ارشاد فرمایا کہ ''تمہاری دنیا'' میں سے یہ اس لیے فرمایا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم دوسری جگہ پر یہ ارشاد فرما چکے تھے کہ۔

میرا دنیا سے کیا تعلق! میں تو ایک ایسے سوار کی طرح ہوں جو کسی درخت کے سائے میں ذرا سی دیر کے لیے ٹھہرتا ہے اور پھر چلا جاتا ہے اور اس درخت کو چھوڑ دیتا ہے۔ اس لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ:

''تمہاری دنیا میں سے تین چیزیں مجھے بہت زیادہ محبوب اور پسند

ہیں وہ کیا ہیں؟ ایک عورت، دوسری خوشبو، اور تیسری ٹھنڈا پانی،
اس لیے دنیا کی ساری نعمتوں میں سے یہ تین چیزیں اول درجے
کی نعمتیں ہیں۔"

ٹھنڈا پانی عظیم نعمت ہے:

چنانچہ احادیث میں کہیں یہ ثابت نہیں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ساری زندگی میں کبھی کسی خاص کھانے کا اہتمام فرمایا ہو۔ نہ کبھی ثابت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی خاص کھانے کی فرمائش کی ہو کہ فلاں کھانا پکالو۔ بلکہ جو کچھ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے آیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تناول فرمایا۔ لیکن ٹھنڈے پانی کا اتنا اہتمام تھا کہ پینے کے لیے ٹھنڈا پانی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے بئرِ غرس سے لایا جاتا تھا۔ جو مسجد نبوی سے تقریباً دو یا ڈھائی میل دور تھا۔ اس لیے کہ اس کا پانی ٹھنڈا اور میٹھا ہوتا تھا اور اسی لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے وصیت فرمائی تھی کہ انتقال کے بعد مجھے اسی کنویں کے پانی سے غسل دیا جائے۔

ٹھنڈا پانی پیا کرو:

حاجی امداد اللہ صاحب مکی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کی ایک حکمت بیان فرمائی۔ چنانچہ ایک مرتبہ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ سے فرمایا کہ میاں اشرف علی! جب کبھی پانی پیو تو خوب ٹھنڈا پیو تاکہ رگ رگ سے شکر نکلے۔ اس لیے کہ جب ٹھنڈا پانی پیئے گا تو رگ رگ سیراب ہوگی تو پھر رگ رگ سے "الحمد للہ" نکلے گا اور بیساختہ رگ رگ سے شکر ادا ہوگا۔

بری عورت سے پناہ مانگو:

بہر حال تین پسندیدہ چیزوں میں سے ایک نیک عورت ہے اس لیے کہ اگر عورت نیک نہ ہو تو اس سے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے پناہ مانگی ہے۔
اے اللہ! میں اس عورت سے پناہ مانگتا ہوں جو مجھے بڑھاپے سے پہلے بوڑھا اور

اس اولاد سے پناہ مانگتا ہوں جو میرے لیے وبال ہو جائے۔ اللہ بچائے۔ آمین۔ اس لیے کہ جب اپنے لیے یا اپنی اولاد کے لیے جب تلاش کرو تو ایسی عورت تلاش کرو جس میں دین ہو، صلاح ہو، نیکی ہو، اگر خدانہ کرے نیکی نہیں تو وہ پھر عذاب بننے کا اندیشہ ہے۔ لہٰذا اگر کسی شخص کو صالح بیوی کی نعمت میسر آئی ہو تو اس کو چاہیے کہ وہ اس کی قدر کرے۔ اس کی ناقدری نہ کرے اور اس کی قدر یہی ہے کہ اس کے حقوق ادا کرے اور اس کے ساتھ حسن سلوک کرے۔

مضمون: ۳۴

عوام کے لیے تقلید محض ایک ضرورت

تقلید کا سب سے پہلا درجہ ''عوام کی تقلید'' کا ہے۔ یہاں ''عوام'' سے ہماری مراد مندرجہ ذیل اقسام کے حضرات ہیں:

۱۔ وہ حضرات جو عربی زبان اور اسلامی علوم سے بالکل ناواقف ہوں، خواہ دوسرے فنون میں وہ کتنے ہی تعلیم یافتہ اور ماہر و محقق ہوں۔

۲۔ وہ حضرات جو عربی زبان جانتے اور عربی کتابیں سمجھ سکتے ہوں۔ لیکن انہوں نے تفسیر و حدیث و فقہ اور متعلقہ دینی علوم کو باقاعدہ اساتذہ سے نہ پڑھا ہو۔

۳۔ وہ حضرات جو رسمی طور پر اسلامی علوم سے فارغ التحصیل ہوں۔ لیکن تفسیر، حدیث، فقہ اور ان کے اصولوں میں اچھی استعداد اور بصیرت پیدا نہ ہوئی ہو۔

یہ تینوں قسم کے حضرات تقلید کے معاملے میں ''عوام'' ہی کی صف میں شمار ہوں گے، اور تینوں کا حکم ایک ہے۔ اس قسم کے عوام کو ''تقلید محض'' کے سوا چارہ نہیں، کیوں کہ ان میں اتنی استعداد اور صلاحیت نہیں ہے کہ وہ براہ راست کتاب و سنت کو سمجھ سکیں، یا اس سے متعارض دلائل میں تطبیق و ترجیح کا فیصلہ کر سکیں۔

لہٰذا احکام شریعت پر عمل کرنے کے لیے ان کے پاس اس کے سوا کوئی راستہ نہیں کہ وہ کسی مجتہد کا دامن پکڑیں اور اس سے مسائل شریعت معلوم کریں، چنانچہ علامہ خطیب بغدادی فرماتے ہیں۔

اما من یسوغ لہ التقلید فھو العامی الذی لا یعرف طرق الحکام الشرعیۃ فیجوز لہ ان یقلد عالما ویعمل بقولہ...... ولانہ لیس من اھل الا جتھا دفکان فرضہ التقلید کتقلید الاعمیٰ فی القبلۃ فانہ لعالم یکن معہ الۃ الا جتھاد فی القبلۃ

كان عليه تقليد البصير فيها.

(الفقیہ والمتفقہ، للخطیب البغدادی صفحہ ۶۸ مطبوعہ دار الافتاء سعودیہ ریاض ۱۳۸۹ھ)

"رہی یہ بات کہ تقلید کس کے لیے جائز ہے؟ سو وہ عامی شخص ہے جو احکام شرعیہ کے طریقوں سے واقف نہیں، لہٰذا اس کے لیے جائز ہے کہ وہ کسی عالم کی تقلید کرے اور اس کے قول پر عمل پیرا ہو...... (آگے قرآن وسنت سے اس کی دلیلیں بیان کرنے کے بعد لکھتے ہیں) نیز اس لیے کہ وہ (عامی آدمی) اجتہاد کا اہل نہیں ہے لہٰذا اس کا فرض یہ ہے کہ وہ بالکل اس طرح تقلید کرے جیسے ایک نابینا قبلہ کے معاملے میں کسی آنکھ والے کی تقلید کرتا ہے، اس لیے کہ جب اس کے پاس کوئی ایسا ذریعہ نہیں ہے جس سے وہ اپنی ذاتی کوششوں کے ذریعہ قبلہ کا رخ معلوم کر سکے۔ تو اس پر واجب ہے کہ کسی آنکھ والے کی تقلید کرے۔"

اس درجے کے مقلد کا کام یہ نہیں ہے کہ وہ دلائل کی بحث میں الجھے اور یہ دیکھنے کی کوشش کرے کہ کون سے فقیہ و مجتہد کی دلیل زیادہ راجح ہے؟ اس کا کام صرف یہ ہے کہ وہ کسی مجتہد کو متعین کر کے ہر معاملہ میں اسی کے قول پر اعتماد کرتا رہے۔ کیوں کہ اس کے اندر اتنی استعداد موجود نہیں ہے کہ وہ دلائل کے راجح و مرجوح ہونے کا فیصلہ کر سکے بلکہ ایسے شخص کو اگر اتفاقاً کوئی حدیث ایسی نظر آجائے جو بظاہر اس کے امام مجتہد کے مسلک کے خلاف معلوم ہوتی ہو تب بھی اس کا فریضہ یہ ہے کہ وہ اپنے امام و مجتہد کے مسلک پر عمل کرے اور حدیث کے بارے میں یہ اعتقاد رکھے کہ اس کا صحیح مطلب میں نہیں سمجھ سکا۔ یہ کہ امام مجتہد کے پاس اس کے معارض کی کوئی قوی دلیل ہوگی۔

بظاہر یہ بات عجیب معلوم ہوتی ہے کہ مجتہد کے مسلک کو قبول کر لیا جائے اور حدیث میں تاویل کا راستہ اختیار کیا جائے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ جس درجہ کے مقلد کا بیان ہو رہا ہے اس کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے اور اگر ایسے مقلد کو یہ اختیار دیدیا جائے کہ وہ کوئی حدیث اپنے امام کے مسلک کے خلاف پا کر امام کے مسلک کو چھوڑ سکتا ہے تو اس کا نتیجہ شدید افراتفری اور سنگین گمراہی کے سوا کچھ نہیں ہوگا۔ اس لیے

کہ قرآن وحدیث سے مسائل کا استنباط ایک ایسا وسیع وعمیق فن ہے کہ اس میں عمریں کھپا کر بھی ہر شخص اس میں عبور حاصل نہیں کر سکتا۔ بسا اوقات ایک حدیث کے ظاہری الفاظ سے ایک مفہوم نکلتا ہے، لیکن قرآن وسنت کے دوسرے دلائل کی روشنی میں اس کا بالکل دوسرا مفہوم ثابت ہوتا ہے اب اگر ایک عام آدمی صرف ایک حدیث کے ظاہری مفہوم کو دیکھ کر اس پر عمل کرے تو اس سے طرح طرح کی گمراہیاں پیدا ہوتی ہیں خود راقم الحروف کا ذاتی تجربہ ہے کہ قرآن وسنت کے علوم میں گہری استعداد کے بغیر جن لوگوں نے براہ راست احادیث کا مطالعہ کر کے ان پر عمل کرنے کی کوشش کی ہے وہ غلط فہمیوں کا شکار ہوتے ہوتے پرلے درجہ کی گمراہیوں میں مبتلا ہو گئے۔

راقم الحروف کے ایک گریجویٹ دوست مطالعے کے شوقین تھے۔ اور انہیں بطور خاص احادیث کے مطالعہ کا شوق تھا اور ساتھ ہی یہ بات بھی ان کے دماغ میں سمائی ہوئی تھی کہ اگرچہ میں حنفی ہوں لیکن اگر حنفی مسلک کی کوئی بات مجھے حدیث کے خلاف معلوم ہوئی تو میں اسے ترک کر دوں گا۔ چنانچہ ایک روز انہوں نے احقر کی موجودگی میں ایک صاحب کو یہ مسئلہ بتایا کہ ''ریح خارج ہونے سے اس وقت تک وضو نہیں ٹوٹتا جب تک کہ ریح کی بدبو محسوس نہ ہو یا آواز نہ سنائی دے'' میں سمجھ گیا کہ وہ بچارے اس غلط فہمی میں کہاں سے مبتلا ہوئے ہیں، میں نے ہر چند انہیں سمجھانے کی کوشش کی لیکن شروع میں انہیں اس بات پر اصرار رہا کہ یہ بات میں نے ترمذی کی ایک حدیث میں دیکھی ہے، اس لیے میں تمہارے کہنے کی بناء پر حدیث کو نہیں چھوڑ سکتا۔ آخر جب میں نے تفصیل کے ساتھ حدیث کا مطلب سمجھایا اور حقیقت واضح کی تب انہوں نے بتایا کہ میں تو عرصہ، دراز سے اس پر عمل کرتا آ رہا ہوں اور نہ جانے کتنی نمازیں میں نے اس طرح پڑھی ہیں کہ آواز اور بو نہ ہونے کی وجہ سے میں سمجھتا رہا کہ میرا وضو نہیں ٹوٹا

دراصل وہ اس سنگین غلط فہمی میں اس لیے مبتلا ہوئے کہ انہوں نے جامع ترمذی میں یہ حدیث دیکھی کہ:

عن ابی هریره رضی الله تعالیٰ عنهٗ ان رسول الله صلی الله علیه وسلم قال لا وضو الا من صوت اوریح

''حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ وضو اسی وقت واجب ہے جب کہ باآواز ہو یا بدبو ہو۔''

اسی کے ساتھ جامع الترمذی میں یہ حدیث بھی انہیں نظر آئی کہ:

اذا کان احدکم فی المسجد فوجد ریحا بین الیتیہ فلا یخرج حتی یسمع صوتاً اویجد ریحاً

(جامع ترمذی ۱۵ صفحہ ۳۱ باب ماجاء فی الوضوء من الریح)

''اگر تم میں سے کوئی شخص مسجد میں ہو اور اسے اپنے سرینوں کے درمیان ہوا محسوس تو وہ اس وقت مسجد سے (بہ ارادہ وضو) نہ نکلے جب تک اس نے (خروج ریح کی) آواز نہ سنی ہو یا اس کو بدبو نہ محسوس ہو۔''

اس حدیث کے ظاہری الفاظ سے انہوں نے یہی سمجھا کہ وضوٹوٹنے کا مدار آواز یا بو پر ہے، حالاں کہ تمام فقہاء امت اس پر متفق ہیں کہ اس حدیث کا یہ مطلب نہیں ہے کہ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد ان وہمی قسم کے لوگوں کے لیے ہے۔ جنہیں خواہ مخواہ وضوٹوٹنے کا شک ہو جاتا ہے اور مقصد یہ ہے کہ جب تک خروج ریح کا ایسا یقین حاصل نہ ہو جائے جیسا کہ آواز سننے یا بو محسوس کرنے سے حاصل ہوتا ہے اس وقت تک وضو نہیں ٹوٹتا ہے۔ چنانچہ دوسری روایات میں حدیث کا یہ مطلب صاف ہو گیا ہے مثلاً ابوداؤد میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہی کی روایت کے الفاظ یہ ہیں۔

اذا کان احدکم فی الصلوٰۃ فوجد حرکۃ فی دبرہ احدث اولم یحدث فاشکل علیہ فلا ینصرف حتیٰ یسمع صوتاً اویجد ریحاً

(سنن ابی داؤد۔ جلد:۱، صفحہ:۲۲، باب من شک فی الحدیث)

''اگر تم میں سے کوئی شخص نماز میں ہو اور اسے اپنی پشت میں حرکت محسوس ہونے لگے کہ ریح خارج ہوئی ہے یا نہیں تو اس کو چاہیے کہ

اس وقت تک وہ وہاں سے نہ ہٹے جب تک آواز نہ سن لے یا بو نہ پالے۔"

نیز ابوداؤد میں حضرت عبداللہ بن زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے واضح فرما دیا ہے کہ یہ جواب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ایسے شخص کو دیا تھا جو اس معاملے میں اوہام اور وساوس کا مریض تھا۔

لیکن حدیث کے مختلف طریق اور الفاظ کو جمع کر کے ان سے کسی نتیجہ تک وہی شخص پہنچ سکتا ہے جو علم حدیث کا ماہر ہو۔ محض ایک کتاب میں کوئی حدیث یا اس کا ترجمہ دیکھ کر تو انسان اسی گمراہی اور غلط فہمی میں مبتلا ہوگا جس میں وہ صاحب مبتلا ہوئے تھے۔

اسی طرح اگر ہر شخص کو یہ اختیار دے دیا جائے کہ وہ کسی حدیث کو اپنے امام کے مسلک کے خلاف دیکھ کر امام کا مسلک چھوڑ سکتا ہے تو یہ بھی ممکن ہے کہ جامع ترمذی رحمۃ اللہ علیہ میں اس کو یہ حدیث نظر آئے کہ:

عن ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ قال جمع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بین الظهر و العصر وبين المغرب و العشاء بالمدينة من غير خوف ولا مطر، قال فقيل لا بن عباس ما ارادا بذالک؟ قال اراد ان لاتحرج امته.

(جامع ترمذی۔ جلد:۱، صفحہ ۴۶)

"حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ وہ فرماتے ہیں کہ جمع کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ظہر اور عصر کو اور مغرب اور عشاء کو مدینہ میں بغیر کسی خوف کے اور بغیر کسی بارش کے۔

ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے پوچھا گیا کہ اس سے حضور کا مقصد کیا تھا؟ انہوں نے فرمایا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصد یہ تھا کہ آپ کی امت تنگی میں مبتلا نہ ہو۔"

اس حدیث کی بناء پر ایک شخص یہ کہہ سکتا ہے کہ ظہر کی نماز عصر کے وقت میں اور

مغرب کو عشاء کے وقت میں اکھٹا کر کے پڑھنا بغیر کسی سفر کے اور عذر کے بھی جائز ہے اور چونکہ میرے امام مجتہد کا مسلک اس حدیث صریح کے خلاف ہے اس لیے میں مجتہد کا مسلک ترک کر کے حدیث پر عمل کرتا ہوں حالاں کہ اس حدیث کا مطلب ائمہ اربعہ اور اہل حدیث میں سے کسی کے نزدیک بھی یہ نہیں ہے کہ جمع بین الصلوٰتین بغیر عذر کے جائز ہے، بلکہ اس کو قرآن وسنت کے دوسرے دلائل کی روشنی میں صرف حنفیہ ہی نے نہیں بلکہ شافعیہ، مالکیہ، حنابلہ بلکہ اہل حدیث حضرات نے بھی جمع صوری کے معنی پر محمول کیا ہے۔ (ملاحظہ ہو تحفۃ الحوذی للمبارک پوریؒ۔ جلد: ا صفحہ ۱۶۶۔۱۶۷)

(یعنی یہ کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ظہر کی نماز بالکل آخر وقت میں اور عصر کی بالکل اول وقت میں پڑھی اور اس طرح ظاہری اعتبار سے دونوں کی ادائیگی ایک ساتھ ہو گئی)۔

یہ دو مثالیں محض نمونے کے طور پر پیش کر دی گئیں۔ ورنہ ایسی احادیث ایک دو نہیں بیسیوں ہیں، جن کو قرآن وسنت کے علوم میں کافی مہارت کے بغیر انسان دیکھے گا۔ تو لامحالہ غلط فہمیوں میں مبتلا ہوگا، اس بنا پر علماء نے فرمایا ہے کہ جس شخص نے علم دین باقاعدہ حاصل نہ کیا ہو۔ اسے قرآن وحدیث کا مطالعہ ماہر استاد کی مدد کے بغیر نہیں کرنا چاہیے۔

پھر یہ بات بھی پیچھے عرض کی جا چکی ہے کہ کسی امام و مجتہد کی تقلید تو کی ہی اس مقام پر جاتی ہے جہاں قرآن وسنت کے دلائل میں تعارض محسوس ہوتا ہے۔ لہٰذا اگر ایک مسئلے کے جواب میں امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا اختلاف ہے تو ان میں سے کوئی بھی دلیل سے خالی نہیں ہوتا۔ تقلید کا تو مقصد ہی یہ ہے کہ جو شخص ان دلائل میں راجح و مرجوح کا فیصلہ کرنے کے قابل نہیں ہے وہ ان میں سے کسی ایک کا دامن پکڑ لے۔ اب اگر امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا دامن پکڑنے کے بعد اسے کوئی ایسی حدیث نظر آجاتی ہے۔ جس پر امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے مسلک کی بنیاد رکھی ہے تو اس کا کام یہ نہیں ہے کہ وہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے مسلک کو چھوڑ دے کیوں کہ یہ تو پہلے ہی معلوم تھا کہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کی بھی کوئی نہ کوئی دلیل ضرور ہوگی، لیکن ظاہر ہے کہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے اس دلیل کو کسی اور دلیل کی بنیاد پر چھوڑا ہے جو

ان کے نزدیک زیادہ مضبوط اور قوی تھی، اس لیے ان کے مسلک کو حدیث کے خلاف نہیں کہا جاسکتا اور جس درجے کے مقلد کی بات ہو رہی ہے اس کے اندر چوں کہ دلائل کا مقابلہ کرنے کی اہلیت نہیں ہے اس لیے وہ فیصلہ نہیں کرسکتا کہ کس کی دلیل قوی ہے؟ چنانچہ اس کا کام صرف تقلید ہے اور اگر اسے کوئی حدیث اپنے امام کے مسلک کے خلاف نظر آئے تب بھی اسے اپنے امام کا مسلک نہیں چھوڑنا چاہئیے بلکہ یہ سمجھنا چاہئیے کہ حدیث کا مفہوم یا اس کا صحیح محمل میں سمجھ نہیں سکا۔

اس کی مثال بالکل یوں سمجھے کہ دنیا میں آج جب بھی کسی شخص کو قانون کے بارے میں کوئی بات معلوم کرنی ہوتی ہے تو وہ کسی ماہر قانون کی طرف رجوع کرتا ہے، قانون کی کتابیں براہ راست دیکھنے کی کوشش نہیں کرتا۔ اب اگر بالفرض وہ کسی ایسے ماہر قانون کے پاس جاتا ہے جس کی علمی مہارت اور تجربہ مسلم ہے اور جس کے بارے میں اسے یقین ہے کہ یہ مجھے دھوکہ نہیں دے سکتا اور وہ ماہر قانون کسی قانونی نکتے کی وضاحت کرتا ہے تو اس کا فرض یہ ہے کہ اس کی بات پر اعتماد کر کے اس پر عمل کرے پھر اگر بالفرض اسے اتفاقاً قانون کی کوئی کتاب ہاتھ لگ جاتی ہے اور اس کا کوئی جملہ اسے بظاہر اس ماہر قانون کی بتائی ہوئی بات کے خلاف محسوس ہوتا ہے تب بھی اس کا کام یہ نہیں ہے۔ کہ وہ ماہر قانون کی بات کو رد کردے بلکہ اس کو عمل اسی ماہر قانون کی بات پر کرنا ہوگا اور کتاب کے بارے میں یہ سمجھنا ہوگا کہ اس کا صحیح مطلب کچھ اور ہے جو میں نہیں سمجھ سکا۔ وجہ یہ ہے کہ قانون کی کتابوں سے کوئی نتیجہ نکالنا ہر کس و ناکس کا کام نہیں ہے بلکہ اس کے لیے اس فن کی مہارت اور وسیع تجربہ درکار ہے، یہ بات اس سے کہیں زیادہ صحت کے ساتھ قرآن وسنت پر صادق آتی ہے کہ اس سے مسائل شرعیہ کا استنباط ان علوم کی زبردست مہارت کا متقاضی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ ہمارے فقہاء نے اس بات کی تصریح فرمائی ہے کہ عوام کو براہ راست قرآن وحدیث سے احکام شریعت معلوم کرنے کے بجائے علما فقہاء کی طرف رجوع کرنا چاہئیے بلکہ فقہاء نے تو یہاں تک فرمایا ہے کہ اگر کسی عام آدمی کو کوئی مفتی غلط فتویٰ دیدے تو اس کا گناہ فتویٰ دینے والے پر ہوگا، عام آدمی کو معذور سمجھا جائے گا لیکن اگر کوئی عام آدمی کوئی حدیث دیکھ کر اس کا مطلب غلط سمجھے اور اس پر عمل کرے تو وہ

معذور نہیں ہے کیوں کہ اس کا کام کسی مفتی کی طرف رجوع کرنا تھا خود قرآن وسنت سے مسائل کا استنباط اس کا کام نہ تھا۔

مثلاً سینگی، پچھنے لگوانے سے جمہور علماء کے نزدیک روزہ نہیں ٹوٹتا لیکن اگر کسی عام آدمی نے کسی مفتی سے مسئلہ پوچھا اور اس نے غلطی سے یہ مسئلہ بتا دیا کہ روزہ ٹوٹ گیا۔ اور اس کے بعد اس شخص نے یہ سمجھ کر کچھ کھا پی لیا کہ روزہ تو ٹوٹ ہی چکا ہے تو ہدائیہ میں لکھا ہے کہ اس پر صرف قضا آئے گی۔ کفارہ نہیں آئے گا۔ صاحب ہدایہ اس کی وجہ بتاتے ہوئے فرماتے ہیں۔

"لان الفتویٰ دلیل شرعی فی حقه"

اس لیے کہ اس عام آدمی کے لیے مفتی کا فتویٰ دلیل شرعی ہے لیکن اگر کسی شخص نے ابوداؤد یا ترمذی وغیرہ میں یہ حدیث دیکھی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم رمضان میں ایک شخص کے پاس گزرے جو سینگی لگوا رہا تھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

فطر الحاجم والمجوب

سینگی لگانے والے اور لگوانے والے دونوں کا روزہ ٹوٹ گیا۔

یہ حدیث سنداً صحیح ہے لیکن بخاری میں ایک دوسری حدیث مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خود روزے کی حالت میں سینگی لگوائی ہے۔ اور نسائی میں حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے روزہ دار کو سینگی لگوانے کی اجازت دی۔ ان احادیث کی بناء پر امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ، امام مالک رحمۃ اللہ علیہ، امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور جمہور علماء یہ کہتے ہیں کہ **"افطر الحاجم والمحجوم"** کا حکم یا تو منسوخ ہے یا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان خاص آدمیوں کو کوئی اور ایسا کام کرتے دیکھا ہوگا جس سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے، اس حدیث کی اور بھی متعدد توجیہات کی گئی ہیں۔ (دیکھئے تحفۃ الاحوذی۔ جلد۲، صفحہ:۶۵،۲۴)

اور اس حدیث سے اس نے یہ سمجھ کر کہ سینگی لگوانے سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے کچھ کھا پی لیا تو امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس پر کفارہ واجب ہوگا، کیوں کہ اس کا فرض یہ تھا کہ وہ کسی مفتی سے مسئلہ پوچھتا اور اس نے یہ فرض ادا نہیں کیا۔ امام یوسف فرماتے ہیں:

لان علیٰ العامی الاقتداء بالفقهاء لعدم الهتداء فی حقه الیٰ معرفه الا حادیث

(ہدایہ۔جلد:۱،صفحہ:۲۲۶،باب مایوجب القفاء والکفارہ)

''عام آدمی کا فریضہ یہ ہے کہ وہ فقہاء کی اقتدار کرے اس لیے کہ وہ احادیث کا علم حاصل کرے کیوں کہ وہ صحیح نتیجہ تک پہنچنے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔''

خلاصہ یہ ہے کہ عوام کے لیے تقلید کا پہلا درجہ متعین ہے یعنی ان کا کام یہ ہے کہ وہ ہر حال میں اپنے امام مجتہد کے قول پر عمل کریں اور اگر انہیں کوئی حدیث امام کے قول کے خلاف نظر آئے تو اس کے بارے میں یہ سمجھیں کہ اس کا صحیح مطلب یا صحیح محمل ہم نہیں سمجھ سکے، اور جس امام کی ہم نے تقلید کی ہے۔ انہوں نے اس کے ظاہری مفہوم کو کسی دوسری قوی دلیل کی بنا پر چھوڑا ہے۔ عوام کے لیے اس طرز عمل کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے، ورنہ احکام شریعت کے معاملے میں جو شدید افراتفری برپا ہوگی اس کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ (ماخوذ تقلید کی شرعی حیثیت)

بشکریہ پندرہ روزہ تعمیر حیات لکھنؤ

۱۰رجون ۱۹۹۶

مضمون: ۴۴

حکم اور ادب توازن کی ضرورت

حضرت سہیل بن سعد الساعدی رضی اللہ تعالیٰ عنہ روایت کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ اطلاع ملی کہ قبیلہ بنی عمر بن عوف کے درمیان آپس میں جھگڑا کھڑا ہو گیا ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے درمیان مصالحت کرانے کے لیے تشریف لے گئے اور بعض صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کو بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ساتھ لے لیا تا کہ اس مصالحت میں وہ مدد دیں، مصالحت کرانے کے دوران آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیر ہو گئی، بات لمبی ہو گئی، اتنی دیر ہو گئی کہ نماز کا وقت آ گیا یعنی وہ وقت آ گیا جس میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مسجد نبوی میں نماز پڑھایا کرتے تھے لیکن چوں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ابھی تک فارغ نہیں ہوئے تھے اس لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم مسجد نبوی میں تشریف نہ لا سکے۔

یہاں اس حدیث کا منشا یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کے درمیان جھگڑے کو ختم کرانے اور مصالحت کرانے کو اتنی اہمیت دی اور اس میں اتنے مصروف ہوئے کہ نماز کا مقررہ وقت آ گیا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم مسجد نبوی میں تشریف نہ لا سکے۔

راوی فرماتے ہیں کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے مؤذن حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے جب یہ دیکھا کہ نماز کا وقت ہو گیا ہے اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم تشریف نہیں لائے تو وہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے پاس گئے اور ان کو جا کر عرض کیا کہ ''اے ابوبکر رضی اللہ عنہ! آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دیر ہو گئی ہے اور نماز کا وقت آ گیا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو مزید کچھ دیر ہو جائے اور لوگ نماز کے انتظار میں ہیں تو کیا یہ ہو سکتا ہے کہ آپ رضی اللہ عنہ امامت کرا دیں۔ تو حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے فرمایا۔ اگر تم چاہو تو ایسا کر سکتے ہیں، ہم نماز پڑھ لیتے ہیں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو دیر ہو گئی ہو گی۔ اس کے بعد حضرت بلال رضی اللہ

عنہ نے تکبیر کہی اور حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ امامت کے لیے آگے بڑھ گئے۔
حضرت صدیق رضی اللہ عنہ نے نماز شروع کرنے کے لیے "اللہ اکبر" کہا اور لوگوں نے تکبیر کہی۔ جب نماز شروع کردی تو نماز کے دوران حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے آئے اور آکر صف میں ایک جگہ پر مقتدی کی حیثیت سے کھڑے ہو گئے۔
جب لوگوں نے دیکھا کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے آئے ہیں اور صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے آنے کے بارے میں پتہ نہیں ہے اس لیے کہ وہ آگے امامت کر رہے ہیں۔ لوگوں کو خیال ہوا کہ اب صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو علم ہو جانا چاہیے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لا چکے ہیں تا کہ وہ پیچھے ہٹ جائیں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم آگے ہو کر نماز پڑھائیں اور چوں کہ اس وقت لوگوں کو مسئلہ معلوم نہیں تھا۔ اس لیے حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو اطلاع دینے کے لیے نماز کے اندر تالیاں بجانا شروع کر دیں۔ اور ان کو متوجہ کرنا شروع کیا لیکن حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا حال یہ تھا کہ جب نماز شروع کر دیتے تھے تو ان کو دنیا ومافیہا کی کچھ خبر نہیں رہتی تھی اور وہ کسی اور طرف متوجہ نہیں ہوتے تھے کہ دائیں بائیں کیا ہو رہا ہے۔ تو شروع میں جب ایک دو آدمیوں نے ہاتھ پر ہاتھ مار کر تالی بجائی تو حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو پتہ بھی نہیں چلا وہ اپنی نماز میں مصروف رہے لیکن جب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے یہ دیکھا کہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کچھ التفات نہیں کر رہے تو اس وقت لوگوں نے زیادہ زور سے تالی بجانی شروع کر دی اور جب کئی صحابہ رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین نے تالی بجائی اور آواز بلند ہونے لگی تو اس وقت حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو کچھ احساس ہوا اور کن انکھیوں سے دائیں بائیں دیکھنا شروع کیا تو اچانک دیکھا کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم صف میں تشریف فرما ہیں۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو صف میں دیکھ کر حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے پیچھے ہٹنا چاہا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو ہاتھ کے اشارے سے فرمایا کہ تم اپنی جگہ پر رہو، پیچھے ہٹنے کی ضرورت نہیں، نماز پوری کرلو۔
لیکن حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے جب حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھ لیا تو پھر ان کے بس میں نہ رہا کہ وہ اپنے مصلے پر کھڑے رہتے اس لیے الٹے پاؤں

پیچھے کی طرف ہٹنا شروع کر دیا، یہاں تک کہ صف میں آ کر کھڑے ہو گئے اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم آگے مصلے پر تشریف لے گئے اور پھر باقی نماز آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پڑھائی۔

جب نماز ختم ہو گئی تو اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں کی طرف متوجہ ہوئے اور خطاب فرمایا کہ یہ کیا طریقہ ہے کہ نماز کے اندر کوئی واقعہ پیش آجائے تو اس میں تم تالیاں بجانا شروع کر دیتے ہو۔ یہ طریقہ نماز کے شایان شان اور مناسب نہیں اور تالیاں بجانا تو صرف عورتوں کے لیے مشروط ہے یعنی بالفرض اگر خواتین کی جماعت ہو رہی ہو۔ ویسے خواتین کی جماعت اچھی اور پسندیدہ نہیں ہے یا خواتین نماز میں شامل ہوں اور وہ امام کو کسی بات کی طرف متوجہ کرنا چاہیں تو ان کے لیے یہ حکم ہے کہ وہ ہاتھ پر ہاتھ مار کر تالیاں بجائیں کیوں کہ ان کے لیے نماز کے اندر زبان سے ''سبحان اللہ'' یا ''الحمد للہ'' کہنا اچھا نہیں ہے کہ نماز کے اندر خاتون کی آواز مرد سنیں۔ لہٰذا ان کے لیے یہ اجازت ہے کہ اگر نماز کے اندر کوئی واقعہ پیش آئے تو ہاتھ پر ہاتھ مار کر امام کو متوجہ کریں لیکن اگر مردوں کی جماعت میں کوئی واقعہ پیش آجائے جس کی وجہ سے امام کو کسی بات کی طرف متوجہ کرنا منظور ہو تو اس میں مردوں کے لیے طریقہ یہ ہے کہ وہ ''سبحان اللہ'' کہیں۔ مثلاً امام کو بیٹھنا چاہیے تھا مقتدیوں نے دیکھا کہ کھڑا ہو رہا ہے تو مقتدی کو چاہئیے کہ وہ ''سبحان اللہ'' کہہ دیں یا ''الحمد للہ'' کہہ دیں۔ یا امام کو کھڑا ہونا چاہیے تھا لیکن وہ بیٹھ گیا تو اس وقت بھی ''سبحان اللہ'' کہہ دیں یا بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ جہری نماز ہے اور امام نے آہستہ قرات شروع کر دی تو اس وقت بھی اس کو متنبہ کر دے تو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر نماز میں کوئی بھی ایسا عمل پیش آجائے جس کی وجہ سے اس کو تنبیہ کرنا مقصود ہو تو مقتدی ''سبحان اللہ'' کہہ دیں، تالیا نہیں بجانا چاہئیں۔ اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی طرف متوجہ ہوئے اور ان سے فرمایا کہ ''اے ابوبکر رضی اللہ عنہ میں نے تو آپ کو اشارہ کر دیا تھا کہ آپ رضی اللہ عنہ نماز پڑھائیں پھر بھی آپ رضی اللہ عنہ پیچھے ہٹ گئے اور امامت کرنے سے آپ رضی اللہ عنہ نے تردد کیا'' تو اس وقت حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے کیا عجیب جواب دیا فرمایا کہ ''یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! ابو قحافہ کے بیٹے کی یہ

مجال نہیں تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی میں لوگوں کی امامت کریں۔ (ابو قحافہ ان کے والد کا نام ہے) یعنی میری یہ مجال نہیں تھی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی میں، میں مصلے پر کھڑا ہو کر امامت کرتا رہوں۔ جب تک آپ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف نہیں لائے تھے تو بات دوسری تھی۔ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھ لیا تو میرے اندر یہ تاب نہیں تھی کہ میں امامت جاری رکھوں، اس واسطے میں پیچھے ہٹ گیا۔'' آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر کوئی اعتراض نہیں فرمایا بلکہ خاموشی اختیار فرمائی۔

حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ، کا مقام:

اس سے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ، کا مقام معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے دل میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت اس درجہ میں پیوست کر رکھی تھی کہ فرماتے ہیں کہ یہ بات میری برداشت سے باہر تھی کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم پیچھے کھڑے ہوں اور میں آگے بڑھ جاؤں۔ اگرچہ یہ واقعہ بے اختیار رہا اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی میں کھڑے نہیں ہوئے تھے لیکن جب پتہ لگ گیا کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم پیچھے ہیں تو پھر آگے کھڑا رہنا برداشت سے باہر تھا، اس لیے پیچھے ہٹ گئے۔

یہاں ایک اور مسئلہ ادب کا عرض کر دوں جو مسنون ادب ہے۔ آپ نے وہ مشہور مقولہ سنا ہوگا۔ ''حکم ادب پر مقدم ہے'' یعنی ادب کا تقاضہ اور سنت یہی ہے کہ جب کوئی بڑا کسی بات کا حکم دے چاہے اس بات پر عمل کرنا ادب کے خلاف معلوم ہو رہا ہو اور ادب کا تقاضہ یہ کہ وہ عمل نہ کیا جائے لیکن جب بڑے نے حکم دے دیا تو چھوٹے کا کام یہ ہے کہ اس کے حکم کی تعمیل کرے۔ یہ بڑی نازک بات ہے اور بعض اوقات اس پر عمل بھی مشکل ہوتا ہے لیکن دین پر عمل کرنے والے تمام بزرگوں کا یہی معمول رہا ہے کہ جب بڑے نے کسی کام کا حکم دے دیا تو اب حکم کی تعمیل مقدم ہے، بہ نسبت ادب کے۔

مثلاً فرض کریں کہ ایک بڑا بزرگ شخص ہے اور وہ کسی امتیازی جگہ جیسے تخت وغیرہ پر بیٹھا ہے۔ اب ایک شخص اس کے پاس آیا جو اس سے چھوٹا ہے ان بزرگ نے کہا کہ بھائی! تم یہاں میرے پاس آجاؤ تو اس وقت اس کی بات مان لینی چاہئیے۔ اگرچہ بظاہر

یہ کام ادب کے خلاف معلوم ہوتا ہے کہ بالکل اس کے پاس تخت پر جا کر بیٹھ جائے اور ادب کا تقاضہ یہ ہے کہ پاس نہ بیٹھے دور بیٹھے لیکن جب بڑے نے حکم دے کر کہہ دیا کہ یہاں آجاؤ تو اس وقت ادب کا تقاضہ بھی یہی ہے اور تعظیم کا تقاضہ بھی یہی ہے کہ اس کے حکم پر عمل کرے۔ چاہے دل میں یہ بات بری لگ رہی ہو کہ میں بڑے کے بالکل قریب جا کر بیٹھ جاؤں، اس لیے ادب کے لحاظ پر حکم کی تعمیل مقدم ہے۔

سارے دین کا خلاصہ ہے اتباع، بڑے کے حکم کو ماننا، اس کے آگے سر تسلیم خم کر دینا۔ اللہ کے حکم کا اتباع، اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کا اتباع اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے وارثین کا اتباع۔ بس وہ جو کہہ رہے ہیں اس پر عمل کرو۔ چاہے ظاہر میں وہ بات ادب کے خلاف ہو۔

مغل بادشاہ عالم گیر رحمۃ اللہ کے والد کے انتقال کے بعد باپ کی جانشینی کا مسئلہ کھڑا ہو گیا اور دونوں بھائیوں کے درمیان آپس میں رقابت تھی۔ عالم گیر رحمۃ اللہ بھی اپنے باپ کے جانشین اور بادشاہ بننا چاہتے تھے۔ اور ان کے بھائی داراشکوہ بھی تخت کے طالب تھے۔ ان کے زمانے میں ایک بزرگ تھے، تو دونوں نے ارادہ کیا کہ ان سے جا کر اپنے حق میں دعا کرائی جائے، پہلے داراشکوہ ان بزرگ کے پاس زیارت اور دعا کے لیے پہنچے، اس وقت وہ بزرگ تخت پر بیٹھے ہوئے تھے تو ان بزرگ نے داراشکوہ سے کہا کہ یہاں میرے پاس آجاؤ اور تخت پر بیٹھ جاؤ۔ تو داراشکوہ نے کہا کہ حضرت، میری مجال نہیں ہے کہ میں آپ کے پاس تخت پر بیٹھ جاؤں میں تو یہاں نیچے ہی ٹھیک ہوں، ان بزرگ نے پھر کہا کہ میں تمہیں بلا رہا ہوں، یہاں آجاؤ، لیکن وہ نہیں مانے اور ان کے پاس نہ گئے اور وہیں بیٹھے رہے، ان بزرگ نے فرمایا کہ اچھا تمہاری مرضی، پھر ان بزرگ نے ان کو جو نصیحت فرمانی تھی وہ فرما دی اور وہ واپس چلے گئے۔

ان کے جانے کے تھوڑی دیر بعد عالم گیر رحمۃ اللہ آگئے وہ جب سامنے نیچے بیٹھنے لگے تو ان بزرگ نے فرمایا کہ تم یہاں میرے پاس آجاؤ، وہ فوراً جلدی سے اٹھے اور ان بزرگ کے پاس جا کر تخت پر بیٹھ گئے۔ پھر انہوں نے ان کو جو نصیحت فرمانی تھی وہ فرما دی۔ جب عالم گیر رحمۃ اللہ علیہ واپس چلے گئے تو ان بزرگ نے اپنی مجلس کے لوگوں سے فرمایا کہ ان دونوں بھائیوں نے تو خود ہی فیصلہ کر لیا۔ داراشکوہ کو ہم نے تخت پیش

کیا، اس نے انکار کردیا اور عالم گیر رحمتہ اللہ علیہ کو پیش کیا تو انہوں نے لے لیا۔ اس واسطے دونوں کا فیصلہ ہوگیا۔ اب تخت شاہی عالم گیر رحمتہ اللہ علیہ کو ملے گا چنانچہ ان کو ہی مل گیا۔

یہ تو ایک تاریخی واقعہ ہے۔ بہر حال ادب یہ ہے کہ جب بڑا کہہ رہا ہے کہ یہ کام کرلو تو اس میں زیادہ حیل و حجت کرنا ٹھیک بات نہیں، اس وقت میں ادب کا تقاضہ یہ ہے کہ جا کر بیٹھ جائے، اس لیے کہ بڑے کے حکم کی تعمیل ادب پر مقدم ہے، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا معمول بھی یہی ہے۔

اس واقعہ میں آپ نے دیکھا کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ تم اپنی جگہ پر کھڑے رہو لیکن صدیق اکبر رضی اللہ عنہ پیچھے ہٹ گئے تو صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین میں دو واقعات ایسے ملتے ہیں جن میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا لیکن صحابہ رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین نے ادب کے تقاضے کو حکم کی تعمیل پر مقدم رکھا۔ ایک تو اس واقعے میں اور ایک واقعہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ہے۔

صلح حدیبیہ کے موقع پر جب حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم اور کفار مکہ کے درمیان صلح نامہ لکھا جارہا تھا تو حضرت علی رضی اللہ عنہ کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بلایا کہ تم لکھو، انہوں نے فرمایا کہ ٹھیک ہے، جب انہوں نے معاہدے کی شرائط لکھنی شروع کیں تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے صلح نامہ پر لکھا۔ "**بسم اللہ الرحمن الرحیم**" جو شخص کفار مکہ کی طرف سے صلح کی شرائط طے کرنے آیا تھا، اس نے کہا نہیں! ہم تو "**بسم اللہ الرحمن الرحیم**" نہیں لکھیں گے اور چوں کہ یہ صلح نامہ دونوں کی طرف سے ہوگا۔ اس لیے اس میں ایسی بات ہونی چاہیے جس پر دونوں متفق ہوں ہم "**بسم اللہ الرحمن الرحیم**" سے اپنے کام کا آغاز نہیں کرتے۔ ہم تو "**باسمک اللھم**" لکھتے ہیں۔ اس زمانہ جاہلیت میں بھی لوگ "**بسم اللہ الرحمن الرحیم**" کے بجائے "**باسمک اللھم**" یعنی اے اللہ! آپ کے نام سے ہم شروع کرتے ہیں۔ لکھتے تھے، اس لیے اس نے کہا کہ اس کو مٹا دیں اور "**باسمک اللھم**" لکھیں تو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ

عنہ سے فرمایا کہ ہمارے لیے اس میں کیا فرق پڑتا ہے۔ **"باسمک اللھم"** بھی اللہ تعالیٰ کا نام ہے چلو وہ مٹادو اور یہ لکھ دو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے **"باسمک اللھم"** لکھ دیا۔ اس کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ نے لکھنا شروع کیا کہ "یہ معاہدہ ہے جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور سرداران مکہ کے درمیان طے پایا۔" اب پھر کفار کی طرف سے جو نمائندہ تھا اس نے پھر اعتراض کیا کہ آپ نے یہ "لفظ محمد" کے ساتھ "رسول اللہ" کیسے لکھ دیا؟ اگر ہم آپ کو "رسول اللہ" مان لیں تو پھر جھگڑا ہی کیسا سارا جھگڑا تو اس بات پر ہے کہ ہم آپ کو "رسول" تسلیم نہیں کرتے۔ لہٰذا یہ معاہدہ جس میں آپ نے "محمد" کے ساتھ "رسول اللہ" بھی لکھا ہے، ہم اس پر دستخط نہیں کریں گے۔ آپ صرف یہ لکھیں کہ "یہ معاہدہ جو محمد بن عبداللہ اور سرداران قریش کے درمیان طے پایا۔" تو پھر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے فرمایا۔ چلو کوئی بات نہیں۔ تم تو مجھے اللہ کا رسول مانتے ہو، اس لیے "محمد" کے ساتھ "رسول اللہ" کا لفظ مٹا دو اور "محمد بن عبداللہ" لکھ دو۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے پہلی بات مان تو لی تھی اور **"بسم اللہ الرحمن الرحیم"** کے بجائے **"باسمک اللھم"** لکھ دیا تھا لیکن جب حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمایا کہ "محمد رسول اللہ" کاٹ کر "محمد بن عبداللہ" لکھ دو تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فوراً بے ساختہ فرمایا کہ خدا کی قسم میں لفظ "رسول اللہ" کو نہیں مٹاؤں گا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے مٹانے سے انکار کر دیا، آنحضرت نے بھی ان کے ان جذبات کو محسوس فرمایا اور فرمایا۔ اچھا! تم نہ مٹاؤ مجھے دو، میں اپنے ہاتھ سے مٹاؤں گا۔ چنانچہ وہ عہد نامہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے لے کر اپنے دست مبارک سے وہ لفظ مٹا دیا۔

یہاں بھی یہی واقعہ ہوا کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو جو حکم دیا تھا انہوں نے اس کی براہ راست تعمیل سے انکار فرمایا اور بظاہر یوں لگتا ہے کہ ادب کو حکم پر مقدم کر لیا اس کی حقیقت سمجھ لیجیے کہ اصل قاعدہ تو وہی ہے کہ بڑا جو کہہ رہا ہے اس کو مانے اور اس کی تعمیل کرے، لیکن بعض اوقات انسان کسی حالت سے اتنا مغلوب ہو جاتا ہے کہ اس کے لیے حکم کی تعمیل کرنا اختیار سے باہر ہو جاتا ہے۔ گویا کہ اس کے اندر اس کام کی استطاعت اور طاقت ہی نہیں ہوتی اس وقت اگر وہ اس کام سے

پیچھے ہٹ جائے تو اس کو یہ نہیں کہا جائے گا کہ اس نے نافرمانی کی بلکہ اس پر یہ حکم صادق آئے گا۔ ''یعنی اللہ تعالیٰ کسی کو اس کی وسعت سے زیادہ کا مکلّف نہیں کرتے تو حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے تو خود ہی فرمادیا کہ یہ بات میرے بس سے باہر تھی کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نماز میں موجود ہوں اور ابو قحافہ کا بیٹا امامت کرتا رہے اور وہاں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لیے بھی یہ بات گویا استطاعت سے باہر تھی، حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت میں اتنے مغلوب الحال تھے کہ یہ بات ان کے بس سے باہر تھی کہ وہ ''محمد'' کے نام سے ''رسول اللہ'' کا لفظ مٹادیں اس واسطہ انہوں نے مٹانے سے انکار کردیا۔

لیکن اصل حکم وہی ہے کہ محبوب جو بات کہے اس کو مانو، اپنی نہ چلاؤ وہ جس طرح کہہ دے اسی کے مطابق عمل کرو۔

یار جس حال میں رکھے وہی حال اچھا ہے
عشق تسلیم و رضا کے، سوا کچھ بھی نہیں
وہ وفا سے خوش نہ ہوں تو پھر وفا کچھ بھی نہیں

اگر ان کی خوشی اسی میں ہے کہ میں ایسا کام کروں جو بظاہر ادب کے خلاف لگ رہا ہے تو پھر وہی کام بہتر ہے جس کے اندر ان کی خوشی ہے اور ان کی رضا ہے۔

بشکریہ روزنامہ جنگ کراچی
۱۶/اپریل ۱۹۹۳ء

مضمون: ۴۵

انسانی حقوق، ہیومن رائٹس
اور
سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم

۳۱ر اگست ۱۹۹۳ء کو اسلامک سینٹر سیلون روڈ اپٹن پارک لندن میں ورلڈ اسلامک فورم کے زیر اہتمام سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عنوان پر جلسہ عام منعقد ہوا، جس کی صدارت مولانا مفتی عبدالباقی نے کی اور مولانا زاہد الراشدی، مولانا منظور الحسینی، مولانا محمد عیسیٰ منصوری، اور مولانا عبدالرشید رحمانی کے علاوہ جسٹس مولانا محمد تقی عثمانی نے ''سیرت النبی اور انسانی حقوق'' کے عنوان پر مندرجہ ذیل مفصل خطاب کیا۔

حضرات علمائے کرام، جناب صدر محفل اور معزز حاضرین!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

ہمارے لیے یہ بڑی سعادت اور مسرت کا موقع ہے کہ آج اس محفل میں، جو نبی کریم سرور دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے مبارک ذکر کے لیے منعقد ہے، ہمیں شرکت کی سعادت حاصل ہو رہی ہے اور حقیقت یہ ہے کہ نبی کریم سرور دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر جمیل انسان کی اتنی بڑی سعادت ہے کہ اس کے برابر اور کوئی سعادت نہیں۔ کسی شاعر نے کہا ہے ؏

ذکر حبیب کم نہیں وصل حبیب سے

اور حبیب کا تذکرہ بھی حبیب کے وصال کے قائم مقام ہوتا ہے اور اسی وجہ سے اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس ذکر کو یہ فضیلت عطا فرمائی ہے کہ جو شخص ایک مرتبہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر درود بھیجے تو اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے دس رحمتیں اس پر نازل ہوتی ہیں۔ تو جس مجلس کا انعقاد اس مبارک تذکرہ کے لیے ہو اس میں شرکت، خواہ ایک مقرر اور بیان کرنے والے کی حیثیت میں ہو یا سامع کی حیثیت میں، ایک بڑی

سعادت ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کی برکات ہمیں اور آپ کو عطا فرمائے۔

تذکرہ ہے نبی کریم سرور دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ کا اور سیرت طیبہ ایک ایسا موضوع ہے کہ اگر کوئی شخص اس کے صرف ایک پہلو کو بھی بیان کرنا چاہے تو پوری رات بھی اس کے لیے کافی نہیں ہو سکتی، اس لیے کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے وجود مبارک میں اللہ جل جلالہ نے تمام بشری کمالات، جتنے تصور ہو سکتے تھے، وہ سارے کے سارے جمع فرمائے۔

یہ جو کسی نے کہا تھا کہ۔

حسن یوسف دم عیسیٰ ید بیضا داری
آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری

تو یہ کوئی مبالغے کی بات نہیں تھی۔ سرور دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم اس انسانیت کے لیے اللہ تعالیٰ کی تخلیق کا ایک ایسا شاہکار بن کر تشریف لائے تھے کہ جس پر کسی بھی حیثیت سے، کسی بھی نقطہ نظر سے غور کیجیے تو وہ کمال ہی کمال کا پیکر ہے۔ اس لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ کے کس پہلو کو آدمی بیان کرے، کس کو چھیڑے، انسان کشمکش میں مبتلا ہو جاتا ہے۔

زفرق تابقدم ہر کجا کہ مے نگرم
کرشمہ دامن دل مہ کشد کہ جا اینجا است

اور غالب نے کہا تھا۔

کہ غالب ثنائے خواجہ بہ یزداں گذاشتیم
کاں ذات پاک مرتبہ داں محمد است

انسان کے تو بس ہی میں نہیں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعریف و توصیف کا حق ادا کر سکے۔ ہمارے یہ ناپاک منہ، یہ گندی زبانیں اس لائق نہیں تھیں کہ ان کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا نام لینے کی بھی اجازت دی جا سکتی۔ لیکن یہ اللہ جل جلالہ کا کرم ہے کہ اس نے نہ صرف اجازت دی بلکہ اس سے راہنمائی اور استفادے کا بھی موقع عطا فرمایا۔ اس واسطے موضوعات تو سیرت کے بے شمار ہیں، لیکن میرے مخدوم اور محترم مولانا زاہد الراشدی صاحب، اللہ تعالیٰ ان کے فیوض کو جاری و ساری فرمائے۔ انہوں

نے حکم دیا کہ سیرت طیبہ کے اس پہلو پر گفتگو کی جائے کی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم انسانی حقوق کے لیے کیا راہنمائی اور ہدایت لے کر تشریف لائے اور جیسا کہ انہوں نے ابھی فرمایا، اس موضوع کی وجہ یہ ہے کہ اس وقت پوری دنیا میں پروپیگنڈہ کا بازار گرم ہے کہ اسلام کو عملی طور پر نافذ کرنے سے ہیومن رائٹس مجروح ہوں گے، انسانی حقوق مجروح ہوں گے اور یہ پبلسٹی کی جارہی ہے کہ گویا ہیومن رائٹس کا تصور پہلی بار مغرب کے ایوانوں سے بلند ہوا اور سب سے پہلے انسان کو حقوق دینے والے یہ اہل مغرب ہیں اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی لائی ہوئی تعلیمات میں انسانی حقوق کا معاذ اللہ کوئی تصور نہیں۔ تو یہ موضوع جب انہوں نے گفتگو کے لیے عطا فرمایا تو ان کے تعمیل حکم میں اسی موضوع پر آج اپنی گفتگو کو محصور کرنے کی کوشش کروں گا۔ لیکن موضوع ذرا علمی نوعیت کا ہے اور ایسا موضوع ہے کہ اس میں زیادہ توجہ اور زیادہ حاضر دماغی کی ضرورت ہے، تو اس سلسلے میں آپ حضرات سے درخواست ہے کہ موضوع کی اہمیت کے پیش نظر اور اس کی نزاکت کو مدنظر رکھتے ہوئے ذرا براہ کرم توجہ کے ساتھ سماعت فرمائیں۔ شاید اللہ تبارک وتعالی ہمارے دل میں اس سلسلے کے اندر کوئی صحیح بات ڈال دے۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے، جس کا جواب دینا منظور ہے، کہ آیا اسلام میں انسانی حقوق کا کوئی جامع تصور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کی روشنی میں ہے یا نہیں؟ یہ سوال اس لیے پیدا ہوتا ہے کہ یہ اس دور کا عجیب وغریب رجحان ہے کہ انسانی حقوق کا ایک تصور پہلے اپنی عقل، اپنی فکر اپنی سوچ کی روشنی میں خود متعین کرلیا کہ یہ انسانی حقوق ہیں، یہ ہیومن رائٹس ہیں اور ان کا تحفظ ضروری ہے اور اپنی طرف سے خود ساختہ جو سانچہ انسانی حقوق کا ذہن میں بنایا اس کو ایک معیار حق قرار دے کر ہر چیز کو اس معیار پر پرکھنے اور جانچنے کی کوشش کی جارہی ہے۔ پہلے سے خود متعین کرلیا کہ فلاں چیز انسانی حق ہے اور فلاں چیز انسانی حق نہیں ہے اور یہ متعین کرنے کے بعد اب دیکھا جاتا ہے کہ آیا اسلام یہ حق دیتا ہے کہ نہیں دیتا۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ حق دیا کہ نہیں دیا اگر دیا تو ہم کسی درجہ میں اس کو ماننے کے لیے تیار ہیں۔ اگر نہیں دیا تو ماننے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ لیکن ان مفکرین اور دانشوروں سے اور ان فکر وعقل کے سورماؤں سے میں ایک سوال کرنا چاہتا ہوں کہ یہ آپ نے جو اپنے ذہن سے انسانی حقوق کے تصورات

مرتب کیے، یہ آخر کس بنیاد پر کیے؟ یہ جو آپ نے یہ تصور کیا کہ انسانی حقوق کا ایک پہلو یہ ہے، ہر انسان کو یہ حق ضرور ملنا چاہئے۔ یہ آخر کس بنیاد پر آپ نے کہا کہ ملنا چاہئے؟

انسانیت کی تاریخ پر نظر دوڑا کر دیکھئے تو ابتدائے آفرینش سے لے کر آج تک انسان کے ذہن میں انسانی حقوق کے تصورات بدلتے چلے آئے ہیں۔ کسی دور میں انسان کے لیے ایک حق لازمی سمجھا جاتا تھا، دوسرے دور میں اس حق کو بیکار قرار دے دیا گیا۔ تیسرے کسی ماحول کے اندر، ایک خطے میں ایک حق قرار دیا گیا دوسری جگہ اس حق کو ناحق قرار دے دیا گیا۔ تاریخ انسانیت پر نظر دوڑا کر دیکھئے تو آپ کو یہ نظر آئے گا کہ جس زمانے میں بھی انسانی فکر نے حقوق کے جو سانچے تیار کیے ان کا پروپیگنڈا اور ان کی پبلسٹی اس زور وشور کے ساتھ کی گئی کہ اس کے خلاف بولنے کو جرم قرار دے دیا گیا۔

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جس وقت دنیا میں تشریف لائے تو اس وقت انسانی حقوق کا ایک تصور تھا اور وہ تصور ساری دنیا کے اندر پھیلا ہوا تھا اور اسی تصور کو معیار حق قرار دیا جاتا تھا، ضروری قرار دیا جاتا تھا کہ یہ حق لازمی ہے۔ میں آپ کو ایک مثال دیتا ہوں کہ اس زمانے میں انسانی حقوق ہی کے حوالے سے یہ تصور تھا۔ کہ جو شخص کسی کا غلام بن گیا تو غلام بننے کے بعد وہ صرف جان و مال اور جسم ہی اس کا مملوک نہیں ہوا بلکہ انسانی حقوق انسانی مفادات کے ہر تصور سے عاری ہو گیا۔ آقا کا یہ بنیادی حق ہے کہ اپنے غلام کی گردن میں طوق ڈالے اور اس کے پاؤں میں بیڑیاں پہنائی جائیں۔ یہ ایک تصور تھا۔ آپ کو اس کے اوپر پورا لٹریچر مل جائے گا اس زمانے کے اندر جنہوں نے اس کو مطمئن کرنے کے لیے اور اس کو مبنی بر انصاف قرار دینے کے لیے فلسفے پیش کیے تھے۔ یہ دور کی بات ہے، اسے جاہلیت کا زمانہ کہہ لیجیے کہ چودہ سو سال پہلے کی بات ہے، لیکن ابھی قریب سو ڈیڑھ سو سال پہلے کی بات لے لیجیے، جب جرمنی اور اٹلی میں فاشزم نے اور نازی ازم نے سر اٹھایا۔ آج فاشزم اور نازی ازم کا نام گالی بن چکا اور دنیا بھر میں بد نام ہو چکا، لیکن آپ ان کے فلسفے کو اٹھا کر دیکھئے۔ جس بنیاد پر انہوں نے فاشزم کا تصور پیش کیا تھا اور نازی ازم کا تصور پیش کیا تھا اس فلسفے کو خالص عقل کی بنیاد پر اگر آپ رد کرنا چاہیں تو آسان نہیں ہوگا۔ انہوں نے یہ تصور پیش کیا تھا کہ جو طاقت ور ہے اس کا ہی یہ بنیادی حق ہے کہ وہ کمزور پر حکومت کرے اور یہ طاقتور کے بنیادی حقوق میں شمار ہوتا ہے

اور کمزور کے ذمہ واجب ہے کہ وہ طاقت کے آگے سر جھکائے۔ یہ تصور ابھی سوڈیڑھ سوسال پہلے کی بات ہے۔

تو انسانی افکار کی تاریخ میں انسانی حقوق کے تصورات یکساں نہیں رہے، بدلتے رہے، کسی دور میں کسی ایک چیز کو حق قرار دیا گیا اور کسی دور میں کسی دوسری چیز کو حق قرار دیا گیا اور جس دور میں جس قسم کے حقوق کے سیٹ کو یہ کہا گیا کہ یہ انسانی حقوق کا حصہ ہے، اس کے خلاف بات کرنا زبان کھولنا ایک جرم قرار پایا۔ تو اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ آج جن ہیومن رائٹس کے سیٹ کو کہا جارہا ہے کہ ان ہیومن رائٹس کا تحفظ ضروری ہے۔ یہ کل کو تبدیل نہیں ہوں گے، کل کو ان کے درمیان انقلاب نہیں آئے گا اور کون سی بنیاد ہے جو اس بات کو درست قرار دے سکے؟

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا انسانی حقوق کے بارے میں سب سے بڑا کنٹری بیوشن یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انسانی حقوق کے تعین کی صحیح بنیاد فراہم فرمائی۔ وہ اساس فراہم فرمائی جس کی بنیاد پر یہ فیصلہ کیا جاسکے۔ کہ کون سے ہیومن رائٹس قابل تحفظ ہیں اور کون سے ہیومن رائٹس قابل تحفظ نہیں۔ اگر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی راہنمائی اور آپ کی ہدایت کو اساس تسلیم نہ کیا جائے تو اس دنیائے کے پاس، اس کائنات کے پاس کوئی بنیاد نہیں ہے۔ جس کی بنیاد پر وہ کہہ سکے کہ فلاں انسانی حقوق لازماً قابل تحفظ ہیں۔

میں آپ کو ایک لطیفے کی بات سناتا ہوں۔ آج سے تقریباً ایک سال پہلے، یا کچھ مدت زیادہ ہوگئی، ایک دن میں مغرب کی نماز پڑھ کر گھر میں بیٹھا ہوا تھا تو باہر سے کوئی صاحب ملنے کے لیے آئے۔ کارڈ بھیجا تو دیکھا کہ اس کارڈ پر لکھا ہوا تھا کہ یہ ساری دنیا میں ایک مشہور ادارہ ہے جس کا نام ایمنسٹی انٹرنیشنل، جو سارے انسانی بنیادی حقوق کے تحفظ کا علم بردار ہے، اس ادارے کے ایک ڈائریکٹر پیرس سے پاکستان آئے تھے وہ ملنا چاہتے تھے، خیر میں نے بلالیا، پہلے سے کوئی اپائنٹ منٹس نہیں تھی، کوئی پہلے سے وقت نہیں لیا تھا، اچانک آگئے اور پاکستان کی وزارت خارجہ کے ایک ذمہ دار افسر بھی ان کے ساتھ تھے، آپ کو یہ معلوم ہے کہ ایمنسٹی انٹرنیشنل وہ ادارہ ہے جو انسانی حقوق کے تحفظ کے لیے اور آزادی تقریر علم بردار کہا جاتا ہے اور پاکستان میں جو بعض شرعی قوانین

نافذ ہوئے یا مثلاً قادیانیوں کے سلسلے میں پابندیاں عائد کی گئیں تو ایمنسٹی انٹرنیشنل کی طرف سے اس پر اعتراضات واحتجاجات کا سلسلہ رہا، تو یہ صاحب تشریف لائے، انہوں نے آکر مجھ سے کہا کہ آپ سے اس لیے ملنا چاہتا ہوں کہ میرے ادارے نے مجھے اس بات پر مقرر کیا ہے کہ میں آزادی تحریر وتقریر اور انسانی حقوق کے سلسلے میں ساؤتھ ایسٹ ایشیا کے ممالک کی رائے عامہ کا سروے کروں یعنی یہ معلوم کروں کہ جنوب مشرقی ایشیا کے مسلمان انسانی حقوق، آزادی تحریر وتقریر اور آزادی اظہار رائے کے بارے میں کیا خیالات رکھتے ہیں اور وہ کس حد تک اس معاملہ میں ہم سے تعاون کرنے پر آمادہ ہیں۔ اس کا سروے کرنے کے لیے میں پیرس سے آیا ہوں اور اس سلسلے میں آپ سے انٹرویو کرنا چاہتا ہوں۔ ساتھ ہی انہوں نے معذرت بھی کی کہ چوں کہ میرے پاس وقت کم تھا اس لیے میں پہلے وقت نہیں لے سکا، لیکن میں چاہتا ہوں کہ میرے چند سوالات کا آپ جواب دیں تاکہ اس کی بنیاد پر اپنی رپورٹ مرتب کرسکوں۔

تو میں نے ان صاحب سے پوچھا کہ آپ کب تشریف لائے۔ کہا کہ میں کل ہی پہنچا ہوں۔ میں نے کہا آئندہ کیا پروگرام ہے؟ فرمانے لگے کہ کل مجھے اسلام آباد جانا ہے۔ میں نے کہا اس کے بعد؟ کہا کہ اسلام آباد ایک یا دو دن ٹھہر کر پھر میں دہلی جاؤں گا۔ میں نے کہا وہاں کتنے دن قیام فرمائیں گے؟ کہا دو دن میں نے کہا پھر اس کے بعد؟ کہا کہ اس کے بعد مجھے ملائیشیا جانا ہے۔ تو میں نے کہا کل آپ کراچی تشریف لائے اور آج شام کو اس وقت میرے پاس تشریف لائے، کل صبح آپ اسلام آباد چلے جائیں گے۔ آج کا دن آپ نے کراچی میں گزارا، تو آپ نے کیا کراچی کی رائے عامہ کا سروے کرلیا؟ تو اس سوال پر وہ بڑا شپٹائے۔ کہنے لگے اتنی دیر میں واقعی پورا سروے تو نہیں ہوسکتا تھا، لیکن اس مدت کے موافق میں نے کافی لوگوں سے ملاقات کی اور تھوڑا بہت اندازہ مجھے ہوگیا ہے تو میں نے کہا آپ نے کتنے لوگوں سے ملاقات کی کہا کہ تین افراد سے میں ملاقات کرچکا ہوں، چوتھے آپ ہیں۔ میں نے کہا چار افراد سے ملاقات کرنے کے بعد آپ نے کراچی کا سروے مکمل کرلیا، اب اس کے بعد کل اسلام آباد تشریف لے جائیں گے اور وہاں ایک دن قیام فرمائیں گے چار یا چھ آدمیوں سے وہاں پھر آپ کی ملاقات ہوگی۔ چھ آدمیوں سے ملاقات کے بعد اسلام آباد کے رائے عامہ کا

سروے ہوجائے گا، اس کے بعد دو دن کے لیے دہلی تشریف لے جائیں گے۔ دو دن دہلی کے اندر چھ لوگوں سے ملاقاتیں کریں گے تو وہاں کا سروے آپ کا ہوجائے گا۔ تو یہ بتائیے کہ یہ سروے کا کیا طریقہ ہے؟ تو وہ کہنے لگے آپ کی بات معقول ہے، واقعتاً جتنا وقت مجھے دینا چاہیے تھا اتنا میں دے نہیں رہا، مگر میں کیا کروں کہ میرے پاس وقت کم تھا۔ تو میں نے کہا معاف فرمائیے۔ اگر وقت کم تھا تو کسی ڈاکٹر نے آپ کو مشورہ دیا تھا کہ آپ سروے کریں؟ اس لیے کہ اگر سروے کرنا ہے تو پھر ایسے آدمی کو کرنا چاہیے جس کے پاس وقت ہو، جو لوگوں کے پاس جا کر مل سکے، لوگوں سے بات کر سکے، اگر وقت کم تھا تو پھر سروے کی ذمہ داری لینے کی ضرورت کیا تھی؟ تو کہنے لگے کہ بات تو آپ کی ٹھیک ہے، لیکن بس ہمیں اتنا ہی وقت دیا گیا تھا اس لیے میں مجبور تھا۔ میں نے کہا معاف فرمائیے مجھے آپ کے اس سروے کی سنجیدگی پر شک ہے، میں اس سروے کو سنجیدہ نہیں سمجھتا لہٰذا میں اس سروے کے اندر کوئی پارٹی بننے کے لیے تیار نہیں ہوں، اور نہ آپ کے کسی سوال کا جواب دینے کے لیے تیار ہوں، اس لیے کہ آپ پانچ چھ آدمیوں سے گفتگو کرنے کے بعد یہ رپورٹ دیں گے کہ وہاں پر رائے عامہ یہ ہے۔ اس رپورٹ کی کیا قدر و قیمت ہوسکتی ہے؟ لہٰذا میں آپ کے کسی سوال کا جواب نہیں دے سکتا۔ وہ بڑا سٹپٹائے اور انہوں نے کہا کہ آپ کی بات ویسے ٹیکنیکلی صحیح ہے، لیکن میں چوں کہ آپ کے پاس ایک بات پوچھنے کے لیے آیا ہوں تو میرے کچھ سوالوں کے جواب آپ ضرور دے دیں۔ میں نے کہا نہیں، میں آپ کے کسی سوال کا جواب نہیں دوں گا۔ جب تک مجھے اس بات کا یقین نہ ہوجائے کہ آپ کا سروے واقعتاً علمی نوعیت کا ہے، سنجیدہ ہے اور علمی شرائط پوری کرتا ہے تو میں اس سروے کے اندر کوئی پارٹی بننے کے لیے تیار نہیں ہوں، آپ مجھے معاف فرمائیں۔ میرے مہمان ہیں میں آپ کی خاطر تواضع جو کرسکتا ہوں وہ کروں گا، باقی کسی سوال کا جواب نہیں دوں گا۔

میں نے کہا بتا دیجیے اگر میری بات میں کوئی غیر معقولیت ہے تو مجھے سمجھا دیجیے کہ میرا موقف غلط ہے اور فلاں بنیاد پر غلط ہے۔ کہنے لگے بات تو آپ کی معقول ہے۔ لیکن میں آپ سے ویسے برادرانہ طور پر چاہتا ہوں کہ آپ کچھ جواب دیں۔ میں نے کہا میں جواب نہیں دوں گا۔ البتہ آپ مجھے اجازت دیں تو میں آپ سے کچھ سوال کرنا چاہتا

ہوں۔ کہنے لگے سوال تو میں کرنے کے لیے آیا تھا تو آپ کیا سوال کرنا چاہتے ہیں؟ میں نے کہا میں آپ سے اجازت طلب کر رہا ہوں، اگر آپ اجازت دیں گے تو سوال کرلوں گا اگر اجازت نہیں دیں گے تو میں بھی سوال نہیں کروں گا ہم دونوں کی ملاقات ہوگئی بات ختم ہوگئی۔ کہنے لگے نہیں آپ سوال کر لیجیے۔ تو میں نے کہا میں سوال آپ سے یہ کرنا چاہتا ہوں کہ آپ آزاد اظہار رائے اور انسانی حقوق کا علم لے کر چلے ہیں تو میں ایک بات آپ سے پوچھتا ہوں کہ یہ آزادی اظہار رائے جس کی آپ تبلیغ کرنا چاہتے ہیں اور کر رہے ہیں اور جس علم کو لے کر چلے ہیں، یہ آزادی اظہار رائے یعنی مطلق ہے، اس پر کوئی قید کوئی پابندی کوئی شرط عائد نہیں ہوتی یا یہ کہ آزادی اظہار رائے پر کچھ قیود شرائط بھی عائد ہونی چاہئیں؟ کہنے لگے میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا؟ تو میں نے کہا مطلب تو الفاظ سے واضح ہے۔ میں یہ آپ سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ آپ جس آزادی اظہار رائے کی تبلیغ کرنا چاہتے ہیں، تو کیا وہ ایسی ہے کہ جس شخص کی جو رائے ہو اس کا برملا اظہار کرے، اس کی برملا تبلیغ کرے، برملا اس کی طرف دعوت دے اور اس پر کوئی روک ٹوک کوئی پابندی عائد نہ ہو۔ یہ مقصود ہے؟ اگر یہ مقصود ہے تو فرمائیے کہ ایک شخص یہ کہتا ہے کہ میری رائے یہ ہے کہ یہ دولت مند افراد انہوں نے بہت پیسے کما لیے اور غریب لوگ بھوک مر رہے ہیں، لہٰذا ان دولت مندوں کے گھروں پر ڈاکہ ڈال کر اور ان کی دکانوں کو لوٹ کر غریبوں کو پیسہ پہنچانا چاہیے۔ اگر کوئی شخص دیانتدارانہ یہ رائے رکھتا ہو اور یہ رائے رکھ کر اس کی طرف تبلیغ کرے اور اس کا اظہار کرے، لوگوں کو دعوت دے کہ آپ آئیے اور میرے ساتھ شامل ہو جائیے اور جتنے دولت مند لوگ ہیں، روزانہ ان پر ڈاکہ ڈالا کریں گے، ان کا مال لوٹا کریں گے اور مال لوٹ کر غریبوں میں تقسیم کیا کریں گے، تو آپ ایسی اظہار رائے کی آزادی کے حامی ہوں گے یا نہیں؟ اور اس کی اجازت دیں گے کہ نہیں؟ کہنے لگے اس کی اجازت نہیں دی جائے گی کہ لوگوں کا مال لوٹ کر دوسروں میں تقسیم کر دیا جائے۔ تو میں نے کہ یہی میرا مطلب تھا کہ اگر اس کی اجازت نہیں دی جائے گی تو اس کا معنی یہ ہے کہ آزادی اظہار رائے اتنی مطلق نہیں ہے کہ اس پر کوئی قید کوئی شرط پابندی عائد نہ کی جا سکے، کچھ نہ کچھ قید شرط لگانی پڑے گی۔ کہنے لگے ہاں کچھ نہ کچھ تو لگانی پڑے گی، تو میں نے کہا مجھے یہ بتائیے کہ وہ قید و شرط کس بنیاد پر لگائی

جائے گی اور کون لگائے گا؟ کس بنیاد پر یہ طے کیا جائے کہ فلاں قسم کی رائے کا اظہار کرنا تو جائز ہے اور فلاں قسم کی رائے کا اظہار کرنا جائز نہیں؟ فلاں قسم کی تبلیغ جائز ہے اور فلاں قسم کی تبلیغ جائز نہیں ہے؟ اس کا تعین کون کرے گا اور کس بنیاد پر کرے گا، اس سلسلے میں آپ کے ادارے نے کوئی عملی سروے کیا اور عملی تحقیق کی ہو تو اس کو جاننا چاہتا ہوں۔

کہنے لگے کہ اس نقطہ نظر سے پہلے ہم نے غور نہیں کیا۔ تو میں نے عرض کیا کہ دیکھئے۔ آپ اتنے بڑے مشن کو لے کر چلے ہیں، پوری انسانیت کو آزادی اظہار رائے دلانے کے لیے، ان کو حقوق دلانے کے لیے، لیکن آپ نے بنیادی سوال نہیں سوچا کہ آخر آزادی اظہار رائے کس بنیاد پر طے ہونے چاہئے؟ کیا اصول ہوں کیا ضوابط ہوں کیا شرطیں اور کیا قیود ہوں۔ تو کہنے لگے اچھا آپ ہی بتا دیجیے۔ تو میں نے کہا میں تو پہلے عرض کر چکا ہوں کہ میں کسی سوال کا جواب دینے بیٹھا ہی نہیں۔ میں تو آپ سے پوچھ رہا ہوں کہ آپ مجھے بتائیے کہ کیا قیود شرائط ہونی چاہئیں اور کیا نہیں۔ میں نے تو آپ سے سوال کیا ہے کہ آپ کے نقطہ سے، آپ کے ادارے کے نقطہ نظر سے کیا ہونا چاہیے؟

کہنے لگے میرے علم میں ابھی تک ایسا کوئی فارمولا نہیں ہے۔ ایک فارمولا ذہن میں آتا ہے کہ صاحب۔ ایسی آزادی اظہار رائے جس میں وائلنس ہو، جس میں دوسرے کے ساتھ تشدد ہو تو وہ نہیں ہونی چاہیے۔ میں نے کہا یہ تو آپ کے ذہن میں آیا کہ وائلنس کی پابندی ہونی چاہیے۔ کسی اور کے ذہن میں کوئی اور بات بھی آسکتی ہے کہ فلاں چیز کی آزادی بھی نہیں ہونی چاہیے۔ یہ کون طے کرے گا اور کس بنیاد پر طے کریگا۔ کہ کس قسم کی اظہار رائے کی کھلی چھٹی ہونی چاہیے۔ کس کی نہیں؟ اس کا کوئی فارمولا کچھ نہ کچھ معیار ہونا چاہیے، کہنے لگے آپ سے گفتگو کے بعد یہ اہم سوال میرے ذہن میں آیا ہے اور میں اپنے ذمہ داروں تک اس کو پہنچاؤں گا اور اس کے بعد اس پر اگر کوئی لٹریچر ملا تو آپ کو بھیجوں گا۔ تو میں نے کہا انشاء اللہ میں منتظر رہوں گا کہ آپ اس کے اوپر کوئی لٹریچر بھیج سکیں اور اس کا فلسفہ بتا سکیں تو میں ایک طالب علم کی حیثیت میں اس کا مشتاق ہوں۔

جب وہ چلنے لگے، ان کو مجھ سے کوئی بات ملی نہیں تو اس وقت میں نے ان سے کہا کہ میں سنجیدگی سے آپ سے کہہ رہا ہوں، یہ بات مذاق کی نہیں ہے، سنجیدگی سے چاہتا ہوں کہ اس مسئلے پر غور کیا جائے، اس کے بارے میں اپنا نقطہ نظر بھیجیں، لیکن ایک بات میں آپ

کو بتادوں کہ جتنے آپ کے نظریات اور فلسفے ہیں، ان سب کو مد نظر رکھ لیجیے، کوئی ایسا متفقہ فارمولا آپ پیش کر نہیں سکیں گے، جس پر ساری دنیا متفق ہو جائے کہ فلاں بنیاد پر اظہار رائے کی آزادی ہونی اور فلاں بنیاد پر نہیں ہونی چاہیے۔ تو یہ میں آپ کو بتا دیتا ہوں اور اگر پیش کر سکیں تو میں منتظر ہوں۔ آج ڈیڑھ سال ہو گیا ہے کوئی جواب نہیں آیا۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ مجمل نعرے، یہ اجمالی نعرے کہ صاحب! ہیومن رائٹس ہونے چاہئیں، آزادی اظہار رائے ہونی چاہیے، تحریر وتقریر کی آزادی ہونی چاہیے، یہ اجمالی نعرے ان کی ایسی کوئی بنیاد جس پر ساری دنیا متفق ہو سکے اور جس کے بارے میں معقولیت سے کہا جا سکے کہ یہ ہے وہ بنیاد جو اس کو طے کر سکے، یہ کسی کے پاس نہیں ہے اور نہ ہو سکتی ہے۔ کیوں؟ اس واسطے کہ جو کوئی بھی یہ بنیادیں طے کرے گا۔ وہ اپنی سوچ اور اپنی عقل کی بنیاد پر کرے گا۔ اور کبھی دو انسانوں کی عقل یکساں نہیں ہوتی، دو زمانوں کی عقلیں یکساں نہیں ہوتیں، دو گروپوں کی عقلیں یکساں نہیں ہوتیں۔ لہٰذا ان کے درمیان اختلاف رہا ہے، رہے گا اور اس اختلاف کو ختم کرنے کا کوئی راستہ نہیں، وجہ اس کی یہ ہے کہ انسانی عقل اپنی ایک حد رکھتی ہے۔ اس کی حدود ہیں، اس سے آگے وہ تجاوز نہیں کر پاتی۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا اس پوری انسانیت کے لیے سب سے بڑا احسان عظیم یہ ہے کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان تمام معاملات کو طے کرنے کی وہ بنیاد فراہم کی ہے کہ کون سا حق قابل تحفظ ہے اور کونسا حق قابل تحفظ نہیں۔ اس کی واحد بنیاد یہ ہے کہ وہ ذات جس نے اس پوری کائنات کو پیدا کیا، وہ ذات جس نے انسانوں کو پیدا کیا، اسی سے پوچھو کہ کون سے انسانی حقوق قابل تحفظ ہیں اور کون سے انسانی حقوق قابل تحفظ نہیں؟ وہی بتا سکتا ہے، اس کے سوا کوئی نہیں بتا سکتا اور اس ذات کے ساتھ اس خالق کائنات کے ساتھ رشتہ جوڑا محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اور رشتہ جوڑا وحی کا رشتہ۔ وہ مقام جہاں پر انسان کی عقل آگے کرنا کارہ ہو جاتی ہے، بے کار ہو جاتی ہے، صحیح جواب نہیں دیتی، اس مقام پر حضرت جبرئیل علیہ السلام وحی لے کر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوتے ہیں اللہ تعالیٰ کی اور وہ بتاتے ہیں کہ یہ ہے وہ بنیاد جس کی روشنی میں تم اپنے مسائل حل کر سکتے ہو۔

جو لوگ کہتے ہیں کہ پہلے ہمیں یہ بتاؤ کہ اسلام ہمیں کیا حقوق دیتا ہے، پھر ہم

اسلام کو مانیں گے، میں نے کہا اسلام کو تمہاری ضرورت نہیں۔ اگر اسلام کو اس وجہ سے مانا کہ حقوق پہلے اپنے ذہن میں طے کر لیے کہ یہ جہاں ملیں گے وہاں جائیں گے اور اس کے بعد پھر اسلام میں اس خاطر آتے ہو کہ یہ حقوق چوں کہ اسلام میں مل رہے ہیں اس واسطے میں جا رہا ہوں، تو یاد رکھو اسلام کو تمہاری ضرورت نہیں، اسلام کا مفہوم یہ ہے کہ پہلے اپنی عاجزی، درماندگی اور شکستگی پیش کرو کہ ان مسائل کو حل کرنے میں ہماری عقل عاجز ہے اور سوچ عاجز ہے، ہمیں وہ بنیاد چاہیے جس کی بنیاد پر ہم مسائل کو حل کریں۔ جب آدمی اس نقطہ نظر سے اسلام کی طرف رجوع کرتا ہے تو پھر اسلام ہدایت و راہنمائی پیش کرتا ہے۔ "ھدی للمتقین" یہ ہدایت متقین کے لیے ہے۔ متقین کے کیا معنی؟ متقین کے معنی یہ ہیں کہ جس کے دل میں طلب ہو، یہ ہو کہ ہم اپنی عاجزی کا اقرار کرتے ہیں، درماندگی کا اعتراف کرتے ہیں، پھر رجوع کرتے ہیں اپنے مالک اور خالق کے سامنے کہ آپ ہمیں بتائیے کہ ہمارے لیے کیا راستہ ہے۔

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ پیغام لے کر آئے، لہٰذا یہ جو آج کی دنیا کے اندر ایک فیشن بن گیا کہ صاحب! پہلے یہ بتاؤ کہ ہیومن رائٹس سے کیا ملیں گا؟ تب اسلام میں داخل ہوں گے تو یہ طریقہ اسلام میں داخل ہونے کا نہیں ہے۔

سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب اس امت کو پیغام دیا، دعوت دی تو آپ نے جتنے غیر مسلموں کو دعوت دی، کسی جگہ آپ نے یہ نہیں فرمایا کہ اسلام میں آجاؤ تمہیں فلاں فلاں حقوق مل جائیں گے۔ بلکہ یہ فرمایا کہ میں تم کو اللہ جل جلالہ کی عبادت کی طرف دعوت دیتا ہوں۔ قولوا لآ الہ الا اللہ تفلحون یہ مادی منافع مادی مصلحتوں اور مادی خواہشات کی خاطر اگر کوئی اسلام میں آنا چاہتا ہے تو وہ درحقیقت اخلاص کے ساتھ صحیح راستہ تلاش نہیں کر رہا۔ پہلے وہ اپنی عاجزی کا اعتراف کرے کہ ہماری عقلیں ان مسائل کو حل کرنے سے عاجز ہیں۔

اور یاد رکھیے! یہ موضوع بڑا طویل ہے کہ عقل انسانی بے کار نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جو ہمیں عقل عطا فرمائی، یہ بڑی کار آمد چیز ہے، مگر یہ اس حد تک کار آمد ہے جب تک اس کو اس کی حدود میں استعمال کیا جائے اور حدود سے باہر اگر اس کو استعمال کرو گے تو وہ غلط جواب دینا شروع کر دے گی۔ اس کے بعد اللہ تبارک وتعالیٰ نے ایک

اور ذریعہ علم عطا فرمایا ہے۔ اس کا نام وحی الٰہی ہے۔ جہاں عقل جواب دے جاتی ہے اور کارآمد نہیں رہتی وہاں وحی الٰہی اس جگہ پر آکر رہنمائی کرتی ہے۔

دیکھو! اللہ تبارک وتعالیٰ نے ہمیں آنکھ دی، کان دیئے۔ یہ زبان دی، آنکھ سے دیکھ کر ہم بہت سی چیزیں معلوم کرتے ہیں، کان سے سن کر بہت ساری چیزیں معلوم کرتے ہیں، زبان سے چکھ کر بہت ساری چیزیں معلوم کرتے ہیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے ہر ایک کا اپنا ایک فنکشن رکھا ہے، ہر ایک کا اپنا عمل ہے اس حد تک وہ کام دیتا ہے، اس سے باہر نہیں دیتا۔ آنکھ دیکھ سکتی ہے، سن نہیں سکتی۔ کوئی شخص یہ چاہے کہ میں آنکھ سے سنوں تو وہ احمق ہے۔ کان سن سکتا ہے دیکھ نہیں سکتا۔ کوئی شخص یہ چاہے کہ کان سے میں دیکھنے کا کام لوں تو وہ بے وقوف ہے۔ اس واسطے کہ یہ اس کام کے لیے پیدا نہیں ہوا اور ایک حد ایسی آتی ہے جہاں نہ آنکھ کام دے رہی ہے نہ کان کام دے رہے ہیں نہ زبان کام دے رہی ہے۔ اس موقع کے لیے اللہ تعالیٰ نے عقل عطا فرمائی ہے کہ عقل انسان کی رہنمائی کرتی ہے۔

دیکھئے یہ کرسی ہمارے سامنے رکھی ہے، آنکھ سے دیکھ کر معلوم کیا کہ اس کے ہینڈل زرد رنگ کے ہیں، ہاتھ سے چھو کر معلوم کیا کہ یہ چکنے ہیں لیکن تیسرا سوال یہ پیدا ہوتا ہے یہ آیا خود بخود وجود میں آگئی یا کسی نے اس کو بنایا؟ تو وہ بنانے والا میری آنکھوں سے سامنے نہیں ہے اس واسطے میری آنکھ بھی اس سوال کا جواب نہیں دے سکتی، میرا ہاتھ بھی اس سوال کا جواب نہیں دے سکتا، اس موقع کے لیے اللہ تعالیٰ نے تیسری چیز عطا فرمائی جس کا نام عقل ہے۔ عقل سے میں نے سوچا کہ یہ جو ہینڈل ہے، یہ بڑے قاعدے کا بنا ہوا ہے، یہ خود تو وجود میں نہیں آسکتا، کسی بنانے والے نے اس کو بنایا ہے۔ یہاں عقل نے میری راہنمائی کی ہے۔ لیکن ایک چوتھا سوال آگے چل کر یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس کرسی کو کس کام میں استعمال کرنا چاہیے، کس میں نہ کرنا چاہیے؟ کہاں اس کو استعمال کرنے سے فائدہ ہوگا کہاں نقصان ہوگا؟ یہ سوال جو ہے اس سوال کو حل کرنے کے لیے عقل بھی ناکام ہو جاتی ہے۔ اس موقع پر اللہ تعالیٰ نے ایک چوتھی چیز عطا فرمائی اور اس کا نام ہے وحی الٰہی، وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی ہوتی ہے، وہ خیر اور شر کا فیصلہ کرتی ہے، وہ نفع اور نقصان کا فیصلہ کرتی ہے، جو بتاتی ہے کہ اس چیز میں خیر ہے اس میں شر ہے، اس میں نفع

ہے اس میں نقصان ہے۔ وحی آتی ہی اس مقام پر ہے جہاں انسان کی عقل کی پرواز ختم ہو جاتی ہے، لہٰذا جب اللہ اور اس کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم آجائے اور وہ اپنی عقل میں نہ آئے، سمجھ میں نہ آئے تو اس کی وجہ سے اس کو رد کرنا کہ صاحب میری تو عقل میں نہیں آرہا، لہٰذا میں اس کو رد کرتا ہوں تو یہ درحقیقت اس عقل کی اور وحی الٰہی کی حقیقت ہی سے جہالت کا نتیجہ ہے۔ اسے سمجھ میں اس لیے نہیں آرہا کہ اگر سمجھ میں آتا تو وحی آنے کی ضرورت کیا تھی۔ وحی تو آئی ہی اس لیے کہ تم اپنی تنہا عقل کے ذریعہ اس مقام تک نہیں پہنچ سکتے تھے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے وحی کے ذریعہ سے تمہاری مدد فرمائی تو اس واسطے اگر عقل سے خود بخود فیصلہ ہوتا تو اللہ تعالیٰ ایک حکم نازل کر دیتے بس کہ ہم نے تمہیں عقل دی ہے، عقل کے مطابق جو چیز اچھی لگے وہ کرو اور جو بری لگے اس سے بچ جاؤ۔ نہ کسی کتاب کی ضرورت، نہ کسی رسول کی ضرورت، نہ کسی پیغمبر کی ضرورت، نہ کسی مذہب اور دین کی ضرورت، عقل دی اور اس عقل کے مطابق کام کرو۔ جب اللہ نے اس عقل دینے کے باوجود اس پر اکتفا نہیں فرمایا، رسول بھیجے، کتابیں اتاریں، وحی بھیجی، تو اس کے معنی یہ ہیں کہ تنہا عقل انسان کی راہنمائی کے لیے کافی نہیں تھی۔ اس کے بعد وحی الٰہی اس لیے آئی۔ تو آج کل لوگ کہتے ہیں کہ صاحب ہمیں چوں کہ اس کا فلسفہ سمجھ میں نہیں آیا۔ لہٰذا ہم نہیں مانتے تو وہ درحقیقت دین کی حقیقت ہی سے ناواقف ہیں حقیقت سے جاہل ہیں۔ سمجھ میں آ ہی نہیں سکتا اور یہیں سے ایک اور بات کا جواب مل جاتا ہے جو آج کل بڑی کثرت سے لوگوں کے ذہنوں میں پیدا ہوتا ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ قرآن کریم نے چاند پر جانے کا کوئی طریقہ نہیں بتایا، خلا کو فتح کرنے کا کوئی فارمولا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں بتایا، یہ سب قومیں اس قسم کے فارمولے حاصل کر.. کر کہاں سے کہاں تک پہنچ گئیں اور ہم قرآن بغل میں رکھنے کے باوجود پیچھے رہ گئے، تو قرآن وسنت نے یہ فارمولے کیوں نہیں بتلائے؟

جواب اس کا یہی ہے کہ اس لیے نہیں بتایا کہ وہ چیز تمہاری عقل کے دائرے کی تھی، اپنی عقل سے اور اپنے تجربے اور اپنی محنت سے جتنا آگے بڑھو گے، اس کے اندر تمہیں انکشافات ہوتے چلے جائیں گے، وہ تمہاری عقل کے دائرے کی چیز تھی، عقل اس کا ادراک کر سکتی تھی۔ اس واسطے اس کے لیے نبی بھیجنے کی ضرورت نہیں تھی، اس کے لیے

رسول بھیجنے کی ضرورت نہیں تھی، اس کے لیے کتاب نازل کرنے کی ضرورت نہیں تھی، لیکن کتاب اور رسول کی ضرورت ہے وہاں جہاں تمہاری عقل عاجز تھی جیسے کہ ایمنسٹی انٹرنیشنل والے آدمی کی عقل عاجز تھی کہ بنیادی حقوق اور آزادی تحریر وتقریر کے اوپر کیا پابندیاں ہونی چاہئیں، کیا نہیں ہونی چاہئیں۔ اس معاملے میں انسان کی عقل عاجز تھی اس کے لیے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے آئے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بتایا کہ یہ حق ہے انسان کا، جس کا تحفظ ضروری ہے اور فلاں حق ہے جس کے تحفظ کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ تو اس لیے پہلے یہ سمجھ لو کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا انسانی حقوق کے سلسلے میں سب سے بڑا کنٹری بیوشن یہ ہے کہ انسانی حقوق کے تعین کی بنیاد فراہم فرمائی کہ کونسا انسانی حق پابندی کے قابل ہے اور کونسا نہیں۔ یہ بات اگر سمجھ میں آجائے تو اب سنئے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا حقوق انسان کو عطا فرمائے۔ کن حقوق کو طے کیا، کن حقوق کا تعین فرمایا اور پھر اس کے اوپر عمل کر کے دکھایا، متعین کن حقوق کو کیا۔ اور آج کی دنیا میں متعین کرنے والے تو بہت اس کا اعلان کرنے والے بہت، اس کے نعرے لگانے والے بہت، لیکن ان نعروں پر اور ان حقوق کے اوپر جب عمل کرنے کا سوال آجائے تو وہی ڈھنڈورچی، جو یہ کہتے ہیں کہ انسانی حقوق قابل تحفظ ہیں، جب ان کا اپنا معاملہ آجاتا ہے، اپنے مفاد سے ٹکراؤ پیدا ہو جاتا ہے، تو دیکھئے پھر انسانی حقوق کس طرح پامال ہوتے ہیں۔

انسانی حقوق کا ایک تقاضا یہ ہے کہ اکثریت کی حکومت ہونی چاہیے، جمہوریت، سیکولر ڈیموکریسی، آج امریکہ کی ایک کتاب دنیا بھر میں بہت مشہور ہو رہی ہے۔ ''دی اینڈ آف ہسٹری اینڈ دی لاسٹ مین'' آج کل کے سارے پڑھے لکھے لوگوں میں مقبول ہو رہی ہے، اس کی ساری تھیسس یہ ہے کہ انسان کی ہسٹری کا خاتمہ وہ جمہوریت کے اوپر ہو گیا اور اب انسانیت کے عروج اور فلاح کے لیے کوئی نیا نظریہ وجود میں نہیں آئے گا۔ یعنی ختم نبوت پر ہم اور آپ یقین رکھتے ہیں، اب یہ نظریہ ختم ہو گیا یہ کہ ڈیموکریسی کے بعد کوئی نظریہ انسانی فلاح کا وجود میں آنے والا نہیں ہے۔

ایک طرف تو یہ نعرہ ہے کہ اکثریت جو بات کہہ دے وہ حق ہے، اس کو قبول کرو، اس کی بات مانو، لیکن وہی اکثریت اگر الجزائر میں کامیاب ہو جاتی ہے اور انتخابات میں

اکثریت حاصل کر لیتی ہے تو اس کے بعد جمہوریت باقی نہیں رہتی۔ پھر اس کا وجود جمہوریت کے لیے خطرہ بن جاتا ہے۔ تو نعرے لگا لینا اور بات ہے لیکن اس کے اوپر عمل کر کے دکھانا مشکل ہے۔

یہ نعرے لگا لینا بہت اچھی بات ہے کہ سب انسانوں کو ان کے حقوق ملنے چاہئیے، ان کو آزادی اظہار رائے ہونی چاہیئے اور لوگوں کو حق خود ارادی ملنا چاہیئے اور یہ سب کچھ، لیکن جن لوگوں کا حق خود ارادی پامال کر کے ان کے سر سے لے کر پاؤں تک ان کو جبر و تشدد کی چکی میں پیسا جا رہا ہے، ان کے بارے میں آواز اٹھاتے ہوئے زبان تھراتی ہے اور وہی جمہوریت اور آزادی کے مناد، منادی کرنے والے وہ ان کے خلاف کاروائیاں کرتے ہیں۔ تو بات صرف یہ نہیں ہے کہ زبان سے کہہ دیا جائے کہ انسانی حقوق کیا ہیں؟ بات یہ ہے کہ جو بات زبان سے کہو اس کو کر کے دکھاؤ اور یہ کام کیا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کہہ دیا اس پر عمل کر کے دکھایا۔

غزوہ بدر کا موقع ہے اور حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ اپنے والد ماجد کے ساتھ سفر کرتے ہوئے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کے لیے مدینہ منورہ جا رہے ہیں، راستے میں ابو جہل کے لشکر سے ٹکراؤ ہو جاتا ہے اور ابو جہل کا لشکر کہتا ہے ہم تمہیں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جانے نہیں دیں گے، اس لیے کہ تم جاؤ گے تو ہمارے خلاف ان کے لشکر میں شامل ہو گے، ہمارے خلاف جنگ کرو گے۔ یہ بیچارے پریشان ہوتے ہیں کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کے لیے جانا تھا اور انہوں نے روک لیا۔ آخر کار انہوں نے کہا اس شرط پر تمہیں چھوڑیں گے کہ ہم سے وعدہ کرو۔ اس بات کا وعدہ کرو کہ جاؤ گے اور جانے کے بعد ان کے لشکر میں شامل نہیں ہو گے ہم سے جنگ نہیں کرو گے۔ اگر یہ وعدہ کرتے ہو تو ہم تمہیں چھوڑتے ہیں۔ حضرت حذیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور ان کے والد نے وعدہ کر لیا حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی صرف زیارت کریں گے، ان کے لشکر میں شامل ہو کر آپ سے لڑیں گے نہیں۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پہنچ گئے۔ جب کفار کے ساتھ جنگ کا وقت آیا، اور کیسی جنگ؟ ایک ہزار مکہ مکرمہ کے مسلح سورما اور اس کے مقابلے میں ۳۱۳

نہتے، جن کے پاس ۸ تلواریں، دو گھوڑے، ستر اونٹ، ۸۸ تلواروں کے سوا تین سو تیرہ آدمیوں کے پاس اس تعداد کے علاوہ ایک تلوار بھی نہیں تھی، کسی نے لاٹھی اٹھائی ہوئی ہے کسی نے پتھر اٹھایا ہوا ہے۔ اس موقع پر ایک ایک آدمی کی قیمت تھی۔ کسی نے کہا یارسول صلی اللہ علیہ وسلم یہ نئے آدمی آئے ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر مسلمان ہوئے ہیں اور ان سے زبردستی معاہدہ کرایا گیا ہے، یہ وعدہ زبردستی لیا گیا کہ تم جنگ میں شامل نہیں ہوگے تو اس واسطے ان کو اجازت دے دیجیے کہ جہاد میں شامل ہو جائیں اور جہاد بھی کونسا؟ یوم الفرقان، جس کے اندر شامل ہونے والا ہر فرد بدری بن گیا، جس کے بارے میں سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمادیا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے اہل بدر کے سارے گناہ اگلے پچھلے معاف فرمائے ہیں، اتنا بڑا غزوہ ہو رہا ہے، حذیفہ بن یمان چاہتے ہیں، دل مچل رہا ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ شامل ہو جائیں، سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا جواب یہ ہے کہ نہیں، جو ابوجہل کے لشکر سے وعدہ کر کے آئے ہو کہ جنگ نہیں کرو گے تو مومن کا کام وعدہ کی خلاف ورزی نہیں ہے، لہٰذا تم اس جنگ میں شامل نہیں ہو سکتے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جنگ میں شامل ہونے سے روک دیا۔ یہ ہے کہ جب وقت پڑے، اس وقت انسان اصول کو نبھائے، یہ نہیں کہ زبان سے تو کہہ دیا کہ ہم انسانی حقوق کے علمبردار ہیں اور ہیروشیما اور ناگاساکی پر بے گناہ بچوں کو بے گناہ عورتوں کو تہہ و بالا کر دیا کہ ان کی نسلیں تک معذور پیدا ہو رہی ہیں اور جب جنگ کا اپنا وقت پڑ جائے تو اس میں کوئی اخلاق کوئی کردار دیکھنے والا نہ ہو۔

تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انسانی حقوق بتائے بھی اور عمل کر کے بھی دکھایا۔ کیا حقوق؟ اب سنئے!

انسانی حقوق میں سب سے پہلا حق انسان کی جان کا حق ہے۔ ہر انسان کی جان کا تحفظ انسان کا بنیادی حق ہے کہ کوئی اس کی جان پر دست درازی نہ کرے۔ **لا تقتلوا النفس التی حرم اللہ الا بالحق** کسی بھی جان کے اوپر دست درازی نہیں کی جا سکتی۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ حکم دے دیا اور کیا حکم دیا کہ جنگ میں جا رہے ہو، کفار سے مقابلہ ہے، دشمن سے مقابلہ ہے اس حالت میں بھی تمہیں کسی بچے پر ہاتھ اٹھانے کی اجازت نہیں، کسی عورت پر ہاتھ اٹھانے کی اجازت نہیں، بوڑھے پر ہاتھ

اٹھانے کی اجازت نہیں، عین جہاد کے موقع پر بھی پابندی عائد کر دی گئی۔ یہ پابندی ایسی نہیں ہے کہ صرف زبانی جمع خرچ ہو، جیسا کہ میں نے ابھی بتایا کہ صرف زبانی طور پر تو کہہ دیا اور تہس نہس کر دیا سارے بچوں کو بھی اور عورتوں کو بھی، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے جاں نثار صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین نے اس پر عمل کر دیکھایا۔ ان کا ہاتھ کسی عورت پر نہیں اٹھا، ان کا ہاتھ کسی بچے پر نہیں اٹھا، ان کا ہاتھ کسی بوڑھے پر نہیں اٹھا، عمل کر کے دیکھایا۔ یہ ہے جان کا تحفظ۔

مال کا تحفظ انسان کا دوسرا بنیادی حق ہے **لا تاکلوا اموالکم بینکم بالباطل** باطل کے ساتھ ناحق طریقے سے کسی کا مال نہ کھاؤ۔ اس پر عمل کر کے کیسے دیکھایا؟ یہ نہیں ہے کہ تاویل کر کے توجیہ کر کے مال کھا گئے کہ جب تک اپنے مفادات وابستہ تھے اس وقت تک بڑی دیانت تھی بڑی امانت تھی، لیکن جب معاملہ جنگ کا آ گیا، دشمنی ہوگئی تو اب یہ ہے کہ صاحب تمہارے اکاؤنٹس منجمد کر دیئے جائیں گے۔ تمہارے اکاؤنٹس فریز کر دیئے جائیں گے۔ جب مقابلہ ہوگیا تو اس وقت میں حقوق انسانی غائب ہوگئے۔ اب مال کا تحفظ کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو مثال پیش کی وہ عرض کرتا ہوں غزوہ خیبر ہے، یہودیوں کے ساتھ لڑائی ہو رہی ہے، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کے ساتھ خیبر کے اوپر حملہ آور ہیں، اور اس خیبر کے گرد محاصرہ کیے ہوئے ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی آرمی پڑی ہوئی ہے خیبر کے قلعہ کے اردگرد، خیبر کے اندر ایک بے چارا چھوٹا سا چرواہا جو اجرت پر بکریاں چرایا کرتا تھا، اس کے دل میں خیال پیدا ہوا کہ خیبر سے باہر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا لشکر پڑا ہوا ہے۔ تو جا کر دیکھوں تو سہی، آپ کا نام تو بہت سنا ہے "محمد" صلی اللہ علیہ وسلم وہ کیا کہتے ہیں اور کیسے آدمی ہیں؟ بکریاں لے کر خیبر کے قلعے سے نکلا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تلاش میں مسلمانوں کے لشکر میں داخل ہوا۔ کسی سے پوچھا کہ بھائی! محمد "صلی اللہ علیہ وسلم" کہاں ہیں؟ تو لوگوں نے بتایا کہ فلاں خیمے کے اندر ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ مجھے یقین نہیں آیا کہ خیمے کے اندر، یہ کھجور کا معمولی سا خیمہ جھونپڑی، اس میں اتنا بڑا سردار، اتنا بڑا نبی وہ اس خیمے کے اندر ہے؟ لیکن جب لوگوں نے بار بار کہا تو اس میں چلا گیا۔ اب جب

داخل ہوا تو سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف فرما تھے، جا کر کہا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! آپ کیا پیغام لے کر آئے ہیں، آپ کا پیغام کیا ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مختصراً بتایا، توحید کے عقیدے کی وضاحت فرمائی۔ کہنے لگا اگر میں آپ کے اس پیغام کو قبول کرلوں تو میرا کیا مقام ہوگا؟ تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہم تمہیں سینے سے لگائیں گے، تم ہمارے بھائی ہو جاؤ گے اور جو حقوق دوسروں کو حاصل ہیں، وہ تمہیں بھی حاصل ہوں گے۔ کہنے لگا آپ مجھ سے ایسی بات کرتے ہیں، مذاق کرتے ہیں ایک کالا بھجنگ چرواہا سیاہ فام، میرے بدن سے بدبو اٹھ رہی ہے، اس حالت کے اندر آپ مجھے سینے سے لگائیں گے، فرمایا کہ ہاں ہم تمہیں سینے سے لگائیں گے۔ کہا اگر آپ مجھے سینے سے لگائیں گے یہاں تو مجھے دھتکارا جاتا ہے، میرے ساتھ اہانت آمیز برتاؤ کیا جاتا ہے تو آپ یہ جو مجھے سینے سے لگائیں گے تو کس وجہ سے لگائیں گے؟ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، اللہ کی مخلوق اللہ کی نگاہ میں سب بندے برابر ہیں، اس واسطے ہم تمہیں سینے سے لگائیں گے۔ کہا کہ اگر میں آپ کی بات مان لوں۔ مسلمان ہو جاؤں، تو میرا انجام کیا ہوگا۔ تو سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر اسی جنگ کے اندر مر گئے تو میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ تبارک وتعالیٰ تمہاری اس چہرے کی سیاہی کو تابانی سے بدل دے گا اور تمہارے جسم کی بدبو کو خوشبو سے بدل دے گا۔ میں گواہی دیتا ہوں۔ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب یہ فرمایا، اس اللہ کے بندے کے دل پر اثر ہوا کہ اگر آپ یہ فرماتے ہیں تو **اشهد ان لا اله الا الله واشهد ان محمدا رسول الله،** عرض کیا میں مسلمان ہو گیا، اب جو حکم آپ دیں وہ کرنے کو تیار ہوں۔ سنیئے۔ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے سب سے پہلا حکم اس کو کیا دیا؟ یہ نہیں دیا کہ نماز پڑھو۔ یہ نہیں دیا کہ روزہ رکھو، پہلا حکم یہ دیا کہ جو کسی کی بکریاں تم چرانے کے لیے لے کر آئے ہو یہ تمہارے پاس امانت ہیں، پہلے ان بکریوں کو واپس دے کر آؤ اور اس کے بعد آکر پوچھنا کہ مجھے کیا کرنا ہے؟ بکریاں کس کی یہودیوں کی، جن کے اوپر حملہ آور ہیں، جن کے ساتھ جنگ کی حالت میں چھیننا تو جائز تھا لیکن تم لے کر آئے ہو ایک معاہدہ کے تحت، اور اس معاہدے کا تقاضا یہ ہے کہ ان کے مال کا تحفظ معاہدے کا تحفظ کیا جائے۔ یہ ان کا حق ہے، لہٰذا ان کو پہنچا کر آؤ۔ اس نے کہا کہ یا رسول اللہ

بکریاں، تو ان دشمنوں کی ہیں جو آپ کے خون کے پیاسے ہوئے ہیں اور پھر آپ واپس لوٹاتے ہیں فرمایا کہ ہاں، پہلے ان کو واپس لوٹاؤ۔ چنانچہ بکریاں واپس لوٹائی گئیں۔ کوئی مثال پیش کرے گا کہ عین میدان جنگ میں عین حالت جنگ کے اندر انسانی مال کے تحفظ کا حق ادا کیا جارہا ہو؟ جب بکریاں واپس کردیں، تو عرض کی اب کیا کروں؟ فرمایا کہ نہ تو نماز کا وقت ہے کہ تمہیں نماز پڑھواؤں، نہ رمضان کا مہینہ ہے کہ روزے رکھواؤں، نہ تمہارے پاس مال ہے کہ زکوۃ دلواؤں۔ ایک ہی عبادت اس وقت ہو رہی ہے جو کہ تلوار کی چھاؤں کے نیچے ادا کی جاتی ہے وہ ہے جہاد، اس میں شامل ہو جاؤ۔ چنانچہ وہ اس میں شامل ہو گیا، اس کا اسود راعی نام آتا ہے۔ جب جہاد ختم ہوا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول تھا کہ جنگ ختم ہونے کے بعد دیکھنے جایا کرتے تھے کہ کون زخمی ہوا، کون شہید ہوا، تو۔۔ یکھا کہ ایک جگہ صحابہ کرام کا مجمع لگا ہوا۔ آپس میں صحابہ پوچھ رہے ہیں کہ یہ کون آدمی ہے؟ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا کیا معاملہ ہے تو صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین نے بتلایا کہ یہ ایسے شخص کی لاش ملی ہے کہ جس کو ہم میں سے کوئی پہچانتا نہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے قریب پہنچ کر دیکھا اور فرمایا تم نہیں پہنچاتے، میں پہچانتا ہوں اور میری آنکھیں دیکھ رہی ہیں اللہ تبارک و تعالیٰ نے اس کو جنت الفردوس کے اندر کوثر و تسنیم سے غسل دیا ہے اور اس کے چہرے کی سیاہی کو تابانی سے بدل دیا ہے، اس کے جسم کی بدبو کو خوشبو سے تبدیل فرمادیا ہے۔ یہ بات کہ مال کا تحفظ ہو، محض کہہ دینے کی بات نہیں، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کرکے دکھایا۔ کافر کے مال کا تحفظ دشمن کے مال کا تحفظ، جو معاہدے کے تحت ہو۔ یہ مال کا تحفظ ہے۔

تیسرا انسان کا بنیادی حق یہ ہے کہ اس کی آبرو محفوظ ہو۔ آبرو کی تحفظ کا نعرہ لگانے والے بہت ہیں، لیکن یہ پہلی بار محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بتایا کہ انسان کی آبرو کا ایک حصہ یہ بھی ہے کہ پیٹھ پیچھے اس کی برائی نہ کی جائے، غیبت نہ کی جائے۔ آج بنیادی حقوق کا نعرہ لگانے والے بہت، لیکن کوئی اس بات کا اہتمام کرے کہ کسی کا پیٹھ کے پیچھے ذکر برائی سے نہ کیا جائے، غیبت کرنا بھی حرام، غیبت سننا بھی حرام اور فرمایا کہ کسی انسان کے دل کو نہ توڑا جائے۔ یہ انسان کے لیے گناہ کبیرہ ہے۔ حضرت عبداللہ بن

مسعود افقہ الصحابہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بیت اللہ شریف کا طواف فرما رہے ہیں، طواف کے دوران آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کعبہ سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ اے بیت اللہ تو کتنا مقدس ہے، کتنا مکرم کتنا معظم ہے، یہ الفاظ فرمائے، پھر عبداللہ بن مسعود سے خطاب کر کے فرمایا کہ اے عبداللہ! یہ کعبۃ اللہ بڑا مقدس بڑا مکرم بڑا معظم ہے، لیکن اس کائنات میں ایک چیز ایسی ہے کہ اس کا تقدس کعبۃ اللہ سے بھی زیادہ ہے اور وہ چیز کیا؟ ایک مسلمان کی جان مال اور آبرو کہ اس کا تقدس کعبہ سے بھی زیادہ ہے۔ اگر کوئی شخص دوسرے کی جان پر مال پر آبرو پر ناحق حملہ آور ہوتا ہے تو سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ وہ کعبہ کے ڈھا لینے سے بھی زیادہ بڑا جرم ہے یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حق دیا۔

جو انسان کے بنیادی حقوق ہیں وہ ہیں جان، مال اور آبرو، ان کا تحفظ ضروری ہے۔ پھر انسان کو دنیا میں جینے کے لیے معاش کی ضرورت ہے، روزگار کی ضرورت ہے۔ اس کے بارے میں فرمایا کسب معاش کا تحفظ۔ یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انسان کو جو حق بتایا، کہا کسی انسان کو اس بات کی اجازت نہیں دی جاسکتی کہ وہ اپنی دولت کے بل بوتے پر دوسروں کے لیے معاش کے دروازے بند کرے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ اصول بیان فرمایا۔ ایک طرف تو یہ فرمایا، جس کو کہتے ہیں فریڈم آف کنٹریکٹ۔ معاہدے کی آزادی جو چاہے معاہدے کرو، لیکن فرمایا ہر معاہدہ جس کے نتیجے میں معاشرے کے اوپر خرابی واقع ہوتی ہو، ہر وہ معاہدہ جس کے نتیجے میں دوسرے آدمی پر رزق کا دروازہ بند ہوتا ہو وہ حرام ہے، فرمایا: **لا یبع حاضر لباد** کوئی شہری کسی دیہاتی کا مال فروخت نہ کرے۔ ایک آدمی دیہات سے مال لے کر آیا مثلاً زرعی پیداوار، ترکاریاں لے کر آیا شہر میں فروخت کرنے کے لیے تو فرمایا کہ شہری اس کا آڑھتی نہ بنے، اس کا وکیل نہ بنے۔ بھائی کیا حرج ہے اگر دو آدمیوں کے درمیان آپس میں معاہدہ ہوتا ہے کہ میں تمہارا مال فروخت کروں گا، تمہارے سے اجرت لوں گا تو اس میں کیا حرج ہے؟ لیکن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بتلایا کہ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ جو شہری ہے، وہ جب مال لے کر بیٹھ جائے گا تو احتکار کرے گا اور بازار کے اوپر اپنی منہ بولی قائم کرے گا، اجارہ داری قائم کرے گا۔ اس اجارہ داری قائم کرنے کے نتیجے میں

دوسرے لوگوں پر معیشت کے دروازے بند ہو جائیں گے۔ اس واسطے فرمایا: **لا یبیع حاضر لباد** تو کسب معاش کا حق ہر انسان کا ہے کہ کوئی بھی شخص وہ اپنی دولت کے بل بوتے پر دوسرے کے لیے معیشت کے دروازے بند نہ کرے۔ یہ نہیں کہ سود کھا کھا کر، قمار کھیل کر، گیمبلنگ کر کر کے، سٹہ کھیل کھیل کر آدمی اپنے لیے دولت کے انبار جمع کر لے اور دولت کے انباروں کے ذریعے سے وہ پورے بازار کے اوپر قابض ہو گیا، کوئی دوسرا آدمی اگر کسب معاش کے لیے داخل ہونا چاہتا ہے تو اس کے لیے دروازے بند ہیں، یہ نہیں، بلکہ کسب معاش کا تحفظ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تمام انسانوں کا بنیادی حق قرار دیا اور فرمایا:

دعوا الناس یرزق الله بعضهم ببعض

"بعض لوگوں کو چھوڑ دو کہ اللہ ان میں سے بعض کو بعض کے ذریعے رزق عطا فرمائیں گے۔"

یہ کسب معاش کا تحفظ ہے۔ جتنے میں حقوق عرض کر رہا ہوں، یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے متعین فرمائے اور متعین فرمانے کے ساتھ ساتھ ان پر عمل بھی کر کے دیکھایا۔

عقیدے اور دیانت کے اختیار کرنے کا تحفظ، کہ اگر کوئی شخص کوئی عقیدہ اختیار کیے ہوئے ہے تو اس کے اوپر کوئی پابندی نہیں ہے کہ کوئی زبردستی جا کر مجبور کر کے اسے دوسرا دین اختیار کرنے پر مجبور کرے۔

لا اکراہ فی الدین

"دین میں کوئی زبردستی نہیں۔"

دین کے اندر کوئی جبر نہیں۔ اگر ایک عیسائی ہے تو عیسائی رہے، ایک یہودی ہے تو یہودی رہے، قانوناً اس پر کوئی پابندی عائد نہیں کی جا سکتی۔ اس کو تبلیغ کی جائے گی دعوت دی جائے گی، اس کو حقیقت حال سمجھانے کی کوشش کی جائے گی، لیکن اس کے اوپر یہ پابندی نہیں ہے کہ زبردستی اس کو اسلام میں داخل کیا جائے البتہ اگر ایک مرتبہ اسلام میں داخل ہو گیا اور اسلام میں داخل ہو کر اسلام کے محاسن اس کے سامنے آ گئے، تو اب اس کو اس بات کی اجازت نہیں دی جا سکتی کہ دار السلام میں رہتے ہوئے وہ اس دین کو برملا

چھوڑ کر ارتداد کا راستہ اختیار کرے۔ اس واسطے کہ اگر وہ ارتداد کا راستہ اختیار کرے گا تو اس کے معنی یہ ہیں کہ معاشرے میں فساد پھیلائے گا اور فساد کا علاج آپریشن ہوتا ہے لہٰذا اس فساد کا آپریشن کر دیا جائے گا اور معاشرے میں اس کو فساد پھیلانے کی اجازت نہیں دی جائے گی۔ کسی کی عقل میں بات آئے یا نہ آئے، کسی کی سمجھ میں آئے یا نہ آئے، میں پہلے کہہ چکا ہوں ان معاملات کے اندر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بنیاد فراہم فرمائی ہے۔ حق وہ ہے جسے اللہ مانے، حق وہ ہے جسے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مانیں، اس سے باہر حق نہیں ہے، اس لیے ہر شخص عقیدے کو اختیار کرنے میں شروع میں آزاد ہے، ورنہ اگر یہ حکم نہ ہوتا، مرتد ہونے کی سزا کا حکم نہ ہوتا، مرتد ہونا جرم نہ ہوتا تو اسلام کے دشمن اسلام کو بازیچہ اطفال بنا کر دکھلاتے۔ کتنے لوگ تماشا دکھانے کے لیے اسلام میں داخل ہوتے اور نکلتے؟ قرآن کریم میں ہے لوگ یہ کہتے ہیں صبح کو اسلام میں داخل ہو جاؤ اور شام کو کافر ہو جاؤ تو یہ تماشا بنا دیا گیا ہوتا۔ اس واسطے دار السلام میں رہتے ہوئے ارتداد کی گنجائش نہیں دی جائے گی۔ اگر واقعتاً دیانت داری سے تمہارا کوئی عقیدہ ہے تو پھر دار السلام سے باہر جاؤ، باہر جا کر جو چاہو کرو، لیکن دار السلام میں رہتے ہوئے فساد پھیلانے کی اجازت نہیں۔

تو غرض موضوع تو بڑا طویل ہے لیکن پانچ مثالیں میں نے آپ حضرات کے سامنے پیش کی ہیں۔

۱۔ جان کا تحفظ۔

۲۔ مال کا تحفظ۔

۳۔ آبرو کا تحفظ۔

۴۔ عقیدے کا تحفظ۔

۵۔ کسب معاش کا تحفظ۔

یہ انسان کی پانچ بنیادی ضروریات ہیں۔ یہ پانچ مثالیں میں نے پیش کیں۔ لیکن ان پانچ مثالوں میں جو بنیادی بات غور کرنے کی ہے وہ یہ ہے کہ کہنے والے تو اس کے بہت ہیں، لیکن اس کے اوپر عمل کر کے دکھانے والے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے غلام ہیں۔ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے دور کا واقعہ ہے کہ بیت

المقدس میں غیر مسلموں سے جزیہ وصول کیا جاتا تھا۔ اس لیے کہ ان کے جان و مال، آبرو کا تحفظ کیا جائے، تو ایک موقعہ پر ضرورت پیش آئی بیت المقدس سے فوج بلا کر کسی اور محاذ پر بھیجنے کی زبردست ضرورت تھی۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ بھائی بیت المقدس میں جو کافر رہتے ہیں۔ ہم نے ان کے تحفظ کی ذمہ داری لی ہے۔ اگر فوج کو یہاں سے ہٹا لیں گے تو ان کا تحفظ کون کرے گا؟ ہم نے ان سے اس کام کے لیے جزیہ لیا ہے، لیکن ضرورت بھی شدید ہے تو سارے غیر مسلموں کو بلا کہا کہ بھائی ہم نے تمہاری ذمہ داری لی تھی، اس کی خاطر تم سے یہ ٹیکس بھی وصول کیا تھا، اب ہمیں ضرورت شدید پیش آگئی ہے، جس کی وجہ سے ہم تمہارا تحفظ کما حقہ نہیں کر سکتے اور فوج کو یہاں نہیں رکھ سکتے، لہٰذا فوج کو ہم دوسری جگہ ضرورت کی خاطر بھیج رہے ہیں تو جو ٹیکس تم سے لیا گیا تھا وہ سارا تم کو واپس کیا جاتا ہے۔ یوں ذمہ داری ادا کی جا رہی ہے۔

حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ وہ صحابی ہیں جن پر کہنے والے ظالموں نے کیسے کیسے بہتانوں کی بارش کی ہے، ان کا واقعہ ابوداؤد میں موجود ہے کہ روم کے ساتھ لڑائی کے دوران معاہدہ ہو گیا، جنگ بندی ہوگئی، ایک خاص تاریخ تک یہ طے ہو گیا کہ سیز فائر رہے گا جنگ بندی رہے گی۔ کوئی آپس میں ایک دوسرے پر حملہ نہیں کرے گا۔ حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ بڑے دانش مند بزرگ تھے، انہوں نے یہ سوچا کہ جس تاریخ کو معاہدہ ختم ہو رہا ہے، اس تاریخ کو فوجیں لے جا کر سرحد کے پاس ڈال دیں کہ ادھر آفتاب غروب ہو گا اور تاریخ بدلے گی، ادھر حملہ کر دیں گے، کیوں کہ ان کا خیال یہ تھا کہ دشمن کو یہ خیال ہو گا کہ جب جنگ بندی کی مدت ختم ہو گی، کہیں دور سے چلیں گے، چلنے کے بعد یہاں پہنچیں گے تو وقت لگے گا تو اس واسطے انہوں نے سوچا کہ پہلے فوج لے جا کے ڈال دیں۔ چنانچہ وہاں فوج لے جا کر ڈال دی اور ادھر اس تاریخ کو آفتاب غروب ہوا جو جنگ بندی کی تاریخ تھی اور ادھر انہوں نے حملہ کر دیا، روم کے اوپر یلغار کر دی اور وہ بے خبر اور غافل تھے، اس واسطے بہت تیزی کے ساتھ فتح کرتے چلے گئے۔ زمین کی زمین خطے فتح ہو رہے ہیں جاتے جاتے جب آگے بڑھ رہے ہیں تو پیچھے سے دیکھا گھوڑے پر ایک شخص سوار دور سے سرپٹ دوڑا چلا آ رہا ہے اور آواز لگا رہا ہے

قفوا عباد الله قفوا عباد الله اللہ کے بندو رکو! اللہ کے بندو رکو! حضرت معاویہ رک

گئے، دیکھا کون ہے تو معلوم ہوا کہ حضرت عمرو بن عبسہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہیں۔ حضرت عمرو بن عبسہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ قریب تشریف لائے تو فرمایا **وفاء لا غدر** مومن کا شیوہ وفاداری ہے غداری نہیں۔ حضرت معاویہ نے فرمایا میں نے تو کوئی غداری نہیں کی۔ جنگ بندی کی مدت ختم ہونے کے بعد حملہ کیا تو حضرت عمرو بن عبسہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا میں نے ان کانوں سے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے **من كان بينه و بين قوم عهد فلا يحلنه ولا يشدنه حتى يمضى امده او ينبذه على سواء** کہ جب کسی قوم کے ساتھ معاہدہ ہو تو اس معاہدے کے اندر کوئی ذرا سا بھی تغیر نہ کرے، نہ کھولے نہ باندھے، یہاں تک کہ اس کی مدت نہ گزر جائے اور یا ان کے سامنے کھل کر بیان نہ کر دے کہ آج سے ہم تمہارے معاہدے کے پابند نہیں ہیں۔ اور آپ نے معاہدہ کے دوران سر پر فوجیں لا کر ڈال دیں اور شاید اندر بھی تھوڑا بہت گھس گئے ہوں تو اس واسطے آپ نے یہ معاہدے کی خلاف ورزی کی اور یہ جو آپ نے علاقہ فتح کیا ہے یہ اللہ کی مرضی کے مطابق نہیں ہے۔ اب اندازہ لگایئے حضرت معاویہ فتح کے نشے میں جا رہے ہیں، ساری فوج کے لیے حکم جاری کر دیا کہ ساری فوج واپس لوٹ جائے اور یہ مفتوحہ علاقہ خالی کر دیا جائے۔ چنانچہ پورا مفتوحہ علاقہ خالی کر دیا۔ دنیا کی تاریخ اس کی مثال نہیں پیش کر سکتی کہ کسی فاتح نے اپنے مفتوحہ علاقے کو اس وجہ سے خالی کیا ہو کہ اس میں معاہدے کی پابندی کے اندر ذرا سی اوچھ رہ گئی تھی، لیکن محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے غلام تھے۔ انہوں نے یہ کر کے دکھایا۔

بات تو جتنی بھی طویل کی جائے ختم نہیں ہو سکتی۔ لیکن خلاصہ یہ ہے کہ سب سے پہلی بات یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انسانی حقوق کی بنیادیں فراہم کی ہیں کہ کون انسانی حقوق کا تعین کرے گا کون نہیں کرے گا۔ دوسری بات یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جو حقوق بیان فرمائے ان پر عمل کر کے دکھایا۔ حقوق ہی وہ متعین کیے گئے جن پر عمل کیا جائے۔